حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی
قرآنی افادات ۲
جمع و ترتیب
رسال الدین احمد حقانی ندوی
ناشر
محمد الحسنی ٹرسٹ
تکیہ کلاں، رائے بریلی

طبع اول

صفر المظفر ۱۴۳۵ھ - دسمبر ۲۰۱۳ء

کتاب	:	قرآنی افادات (دوم)
مصنف	:	حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ
جمع وترتیب	:	رسال الدین حقانی ندوی
صفحات	:	۳۶۸
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)
قیمت	:	

باہتمام: محمد نفیس خاں ندوی

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، رائے بریلی

☆ مکتبہ ندویہ، دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ☆ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ الجدیدۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

ناشر :

سید احمد شہید اکیڈمی (?)

محمد الحسنی ٹرسٹ

تکیہ کلاں، رائے بریلی

باب (دوم) اوصاف واخلاق (۱۲۶ تا ۱۹۴)

باب (سوم) مواعظ وحکم (۱۹۵ تا ۲۵۷)

باب (چہارم) حقائق و عبر (۲۵۸ تا ۳۰۳)

باب (پنجم) بلاغت و اعجاز (۳۰۴ تا ۳۶۸)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو عمومی طور پر ایک مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ فہم قرآن میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اس پایہ کے ہوں، اس کی دو بڑی وجہیں ہیں: ایک تو عربی زبان وادب، بلاغت اور اعجاز قرآنی پر حضرتؒ کی وسیع وعمیق نگاہ، دوسرے ان لوگوں کی صحبت جن کی زندگی قرآن مجید کی علمی تفسیر ہے۔ حضرتؒ نے مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں لیکن ان سب پر قرآن مجید کا رنگ غالب ہے، حضرتؒ نے خود ایک جگہ لکھا ہے :

''میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں اس کے بعد جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اس میں قرآن مجید کا سب سے بڑا حصہ ہے۔

آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآں کردم

جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصنیفات دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے۔'' (قرآنی افادات: ۱/۱۳)

اس ذوق سے حضرتؒ کی مناسبت کا آغاز تو اسی وقت ہو گیا تھا جب والدہ صاحبہؒ اپنے مخصوص لحن میں بڑے درد وسوز کے ساتھ تلاوت فرماتی تھیں۔ حضرتؒ اپنے بچپن کے اُس دور ہی میں جس پر اللہ کی ہزار رحمتیں ہوں اس کی حلاوت محسوس فرمانے لگے تھے اور اسی وقت دل کی نرم زمین میں اس کا بیج پڑ گیا تھا۔

پھر جب خلیل عرب صاحبؒ سے عربی تعلیم کا آغاز ہوا اور فہم کی صلاحیت پیدا ہوئی تو خود حضرتؒ ہی فرماتے تھے کہ تلاوت کا ذوق پیدا ہو گیا اور اس میں مزہ آنے لگا۔ خلیل عرب

صاحبؒ عربی زبان کے رمز شناس اور اس کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھنے والے استاد تھے اس کا اثر تھا کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت بڑی حلاوت اور درد کے ساتھ کرتے تھے اور اس میں سرشار ہو جاتے تھے۔

خواجہ عبدالحی صاحب فاروقیؒ سے بھی حضرتؒ نے قرآن مجید کی بعض سورتوں کا درس لیا، اس کے بعد حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کے درس میں باقاعدہ شرکت فرمائی، حضرت ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ :

''میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی صاحبؒ کے مجلس درس کا فیض اور برکت شامل ہے۔'' (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں:۱۸۶)

دارالعلوم دیوبند کے قیام میں قرآن مجید کی بعض آیات اور مشکل مقامات کے سلسلہ میں حضرت مدنیؒ سے بھی استفادہ فرمایا۔

اس پورے دور میں حضرتؒ نے کم سے کم تفسیروں کی مدد لی اور براہِ راست قرآن مجید سے استفادہ فرمایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرتؒ کسی مخصوص طرز فکر یا نظریہ سے متاثر نہیں ہوئے اور بلا واسطہ فہم قرآن کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ جب کسی خاص تفسیر کی مدد ہی سے قرآن مجید کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو فہم قرآن میں اس مفسر کا عکس پڑ جاتا ہے۔

پھر وہ دور آیا جب حضرتؒ نے دارالعلوم میں سالوں قرآن مجید کا درس دیا، اس دوران مختلف تفسیروں کا مطالعہ فرمایا، اس طرح فنی طور پر مزید گہرائی پیدا ہوئی۔ درس کے زمانہ میں حضرت نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ سے بھی اس باب میں استفادہ کیا جس سے مزید وسعت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ جب حضرتؒ ''ادارہ تعلیمات اسلام'' میں اور اس کے بعد ''مرکز دعوت و تبلیغ'' میں برسوں قرآن مجید کا درس دیتے رہے۔ اس درس کی بنیادی خصوصیت یہی تھی کہ معاشرہ سے اس کا انطباق فرماتے اور اس طرح آیات کی تفسیر فرماتے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیتیں ابھی ابھی نازل ہوئی ہیں اور ان میں موجودہ مسائل و مشکلات کا حل موجود ہے، تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے یہ درس بہت مفید اور عمومی طور پر بڑا موثر ہوتا تھا اور اس میں خواص کا اتنا بڑا مجمع ہوتا تھا کہ کم

کسی تقریب میں ہوتا ہوگا۔

حضرتؒ کا قرآن فہمی کا یہ ذوق حضرتؒ کی تقریروں اور تحریروں میں نمایاں تھا، قرآنی افادات کے نام سے حضرتؒ کی اس سے متعلق تحریروں کا جو انتخاب شائع ہوا ہے وہ اس کا واضح ثبوت ہے۔

عزیزی محترم مولوی رسال الدین حقانی صاحب نے بڑا قابل قدر کام کیا کہ حضرت مولاناؒ کی تقریروں اور تحریروں سے وہ اقتباسات لے کر یکجا کر دیے، جن میں قرآنی نکات تھے، مختلف قرآنی موضوعات انہوں نے جمع کیے اور بڑی خدمت انجام دی، قرآنی افادات کے نام سے پہلی جلد حضرت مولاناؒ کی زندگی میں طبع ہوئی، اور اس نے بڑی مقبولیت حاصل کی، اس کے کئی ایڈیشن نکلے، اب یہ دوسری جلد قارئین کے سامنے ہے، اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بڑا حصہ وہ ہے جو ابھی تک طبع نہیں ہو سکا، یہ زیادہ تر حضرت مولانا کے درس قرآن سے انتخاب ہے، جو حضرت مولانا نے دائرہ شاہ علم اللہ کی مسجد میں رمضان المبارک میں دیا کرتے تھے، اور اس کا سلسلہ حضرت مولانا کی وفات تک جاری رہا۔ محترم موصوف نے بڑی عرق ریزی سے ان دروس قرآن سے بطور خاص منتخبات لیے، اور اس کے علاوہ بعض تحریروں اور تقریروں سے بھی اخذ کر کے یہ مجموعہ تیار کیا، یہ سارا کام انہوں نے ہمارے مربی و سرپرست برادر معظم حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی صاحبؒ کے مشوروں سے کیا ہے، دوسری جلد انہیں کی زندگی میں مکمل ہوئی تھی، اور انہوں نے اس کو دیکھ کر بڑی مسرت کا اظہار کیا تھا، لیکن افسوس ہے ان کی زندگی میں وہ طبع نہ ہو سکی، اب یہ قارئین کے سامنے ہے، امید ہے کہ اس سے ہمارے حضرت مولاناؒ اور برادر معظمؒ دونوں کی روحیں خوش ہوں گی، اور یہ کتاب ان حضرات کے لیے صدقۂ جاریہ ہوگی، اللہ تعالیٰ اس کو بھی پہلی جلد کی طرح مقبولیت عام عطا فرمائے۔

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مرکز الإمام أبي الحسن الندوي، دارعرفات

تکیہ کلاں رائے بریلی

۴/صفر المظفر/۱۴۳۵ھ

کلمات تحسین ودعا

عزیزی مولانا رسال الدین احمد حقانی ندوی!

مبارک ہو آپ کو یہ توفیق الٰہی، توفیق حق کی ارزانی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے کلام کے عجائب اور نہ ختم ہونے والے بعض گرایب کو یکجا کرنے کی سعادت ملی، وہ عجائب جو بخشنے والے نے اس سینہ کو ودیعت کیے جو اسرار حق کا خزینہ تھا، "**من جاء بالصدق وصدق به أولئک هم المتقون**" کی شہادت جس کی دولت تھی، اول وآخر یہی اس کی ثروت تھی، اسی سے اس کی زندگی نورانی تھی، اور آج اسی نور سے اس کی قبر پرنور ہے، روشن ہے، اور انشاء اللہ قیامت تک روشن رہے گی۔

مخدوم ومربی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (**یا رب قدس روحه ونور قبره وبرد مضجعه**) کو اللہ تعالیٰ نے پاک دل، پاک زبان، پاک سیرت بنایا تھا، قرآن اللہ کا نور ہے، "**أوله نور وآخره نور**" کا مصداق "**نور ظاهره ونور باطنه**" کا جلوۂ تاباں، لہٰذا ایک نور سے بھرے دل، اور کلام اللہ کی صداقت پر گواہی دینے والی زبان سے جو نکلا وہ عین منشائے الٰہی ہے۔

ہمارے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی جولانی طبع کا ایک خوشنما مظہر یہ تھا کہ آپؒ جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو اکثر یہ ہوتا کہ جلسہ کا افتتاح جن آیات کریمہ سے کیا جاتا آپؒ انہی آیات کی روشنی میں ایمان کی روشنی دکھاتے، ایسا معلوم ہوتا کہ قرآن کریم کا معجزہ اصلی یہی آیات ہیں، ہر لفظ محبت وصداقت کا حامل ہے، اگر صرف انہی آیات کو جمع کرلیا جاتا تو ایک مکمل تفسیر ہوتی، مگر یہاں تو وہ آیات ہیں جن کی تفسیر آپ کے قلب مبارک پر وارد

ہوئی یا یوں کہیے کہ القاء ہوئی، اور مبارک زبان نے مبارک لہجہ میں ان کو ادا کیا۔

مولانا رسال الدین! آپ کو اللہ نے دین کا فرستادہ بنایا، قرآن کریم کے تفسیری افادات جمع کرنے میں آپ کامیاب ہوئے، ان تفسیری نکات کو پڑھنے والے کا ذہنی خاکہ ایسا بن جائے گا کہ قرآن کریم کی صحیح روح سمجھنے میں اس کو آسانی ہوگی، بلکہ عربی لفظ استعمال کیجئے تو و کہیے کہ قرآن کریم کی عربیت اس کے لیے ''شراب سائغ'' بن جائے گی، مثال صرف ایک مثال لیجئے ''تزئین'' زینت دینا، مزین کرنا، جیسے رات کو، تاریکی کو چاند ستاروں سے زینت بخشی گئی ہے، اب اعمال کی زینت کس طرح دی جاتی ہے، اس کو قرآن کریم میں پڑھئے ''**زینا لھم اعمالھم**....'' ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال مزین کر دیئے''۔

حضرت مولانا اس لفظ کو اس طرح سمجھاتے ہیں:

''کرنے والا تو اللہ ہی ہے کوئی کتنا ہی کسی چیز کا ارادہ کرے، جب تک اللہ تعالیٰ اس کے کرنے کی اجازت نہ دے یعنی چھوٹ نہ دے، اور ڈھیل نہ دے، اس وقت تک وہ ہوتی ہی نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی کہ خالق حقیقی وہی ہے، جیسے وہ اجسام کا خالق ہے ویسے ہی وہ ارادوں کا، ارادے بھی بغیر اس کی اجازت کے نہیں ذہن میں آسکتے، تو ان کے لیے ان کے اعمال مزین ہیں۔

''**فھم یعمھون**'' تو وہ اس میں بھٹکے پھر رہے ہیں، بالکل اندھے بنے ہوئے ہیں، چیزوں کو اسی پیمانے سے تولتے اور ناپتے ہیں۔

دیکھئے اس وقت کا جو تمدن ہے یہ ''**زینا لھم أعمالھم**'' کا بہترین مظہر ہے آپ امریکہ سے لیکر انڈونیشیا تک چلے جائیں گے، ہر جگہ آپ کو ایک بڑا طبقہ ملے گا، جس کو اپنی یہ شان وشوکت اور وہ اختیارات اور اعزاز واستقبالات اور ممبریاں، ممبر شپ، فلاں پارلیمنٹ کی، اسمبلی کی، کونسل کی، اور جو کچھ بھی ہوں وہ سب ان کے نزدیک بڑی ترقی بڑی عزت کا معیار ہے، ''**زینا لھم أعمالھم**'' اس کے لیے ''تزئین'' عربی کا بہترین اور مناسب ترین لفظ ہے۔

"أولئک الذین لهم سوء العذاب وهم فی الآخرة هم الأخسرون"

''وہ لوگ ہیں جن کے لیے برا عذاب ہے اور آخرت میں سخت نقصان میں رہنے والے ہیں یعنی وہ اپنے کو یہاں کامیاب سمجھ رہے ہیں، اور آخرت میں وہ سب ناکام ثابت ہوں گے''۔

پورا مجموعہ اس طرح کے نوادرات سے پر ہے، اللہ کا کلام سچا ہے، اس کی تفسیر کے لیے سچا دل اور سچی زبان چاہیے جو اس مجموعہ میں نظر آتی ہے۔ اللہ اس کی روشنی سے آپ کی زندگی بھی منور کردے اور ہماری بھی، اور تمام مسلمانوں کی زندگیاں روشن ہوں۔

والسلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

عبداللہ عباس ندوی

ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۳/۹/۲۰۰۴ء

مُقَدَّمَہ

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہٗ العالی
(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین و خاتم النبیین محمد وعلی آلہ و صحبہ اجمعین، و بعد:

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ کو اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر سے شغف رہا، اور جب ندوۃ العلماء میں ان کا تدریسی دور آیا تو ترجمہ وتفسیر قرآن ان کا خصوصی موضوع بنا، اس طرح اس مضمون سے ان کو نمایاں تعلق رہا۔ تفسیر وعلوم قرآن کے علاوہ ادب عربی اور علوم حدیث بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے خاص مضمون رہے، اور ادب عربی میں تو مولانا کو خاص امتیاز حاصل رہا، اس کی وجہ سے انہیں قرآن مجید کے الفاظ وعبارت کی بلاغت اور حسن تعبیر کو بہتر طریقہ سے سمجھنے اور اس کی اثر انگیزی کو محسوس کرنے میں خصوصیت حاصل رہی، قرآن مجید کے مضامین کی ادائیگی میں جو حسن بیان اور حسن ادا ہے، اس کو سمجھنے کے لیے نزول قرآن کے زمانہ میں کلام عربی میں جو محاورے رائج تھے نیز الفاظ میں انسانی زندگی کی نفسیات کی پیچ وخم کی جو رعایت ہوتی ہے اسکو سامنے رکھتے ہوئے آیات قرآنی کے تعبیری اسلوب پر نظر ڈالی جائے، تو قرآن مجید کا تعبیری اعجاز سامنے آتا ہے، اور جو مضامین اور معانی بیان کیے گئے ہیں ان کو ان کے مزاج

ومقصد کے مطابق سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اور یہ بات عربی زبان وادب کا اچھا ذوق حاصل ہوئے بغیر نہیں ہوسکتی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ ایک طرف انہوں نے عربی زبان وادب اور اس کے محاوروں اور اس کے اسالیب کلام کی خوبیوں کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل کی تھی، دوسری طرف ترجمہ وتفسیر قرآن کے لائق ترین اساتذہ سے تلمذ حاصل کیا تھا، اور تدریس کے زمانہ میں مزید گہرے مطالعۂ قرآن اور اس کی مستند تفاسیر کے مطالعہ کا حق ادا کیا تھا، اس طرح ان کو قرآن مجید کی تعبیرات اور اسالیب بیان کی معجزانہ بلاغت اور معانی ومطالب کا فہم اور ان کی اثر انگیزی کا ذوق حاصل ہوا تھا، انہوں نے اپنے اس ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے باقاعدہ کوئی تفسیر نہیں لکھی لیکن ان کی تقریروں، مضامین اور اصلاح وارشاد کے خطابات میں استشہاد کے طور پر جن آیات کا تذکرہ آتا تھا تو ان کی تشریح میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن فہمی کی اعلیٰ قابلیت کا اظہار ہوتا تھا۔

مولانا نے اپنی عمر کے آخری برسوں میں رمضان المبارک کے موقعوں پر اپنی مسجد میں عام مسترشدین ومستفیدین کے لیے درس قرآن بھی دیا جو قرآن مجید کی صرف چند سورتوں اور پاروں تک پھیلا، اس درس قرآنی میں قرآنی آیات والفاظ کی تشریح میں مولانا جو بیان کرتے تھے وہ تفسیر قرآن کے اصول ومبادی کے اندر رہتے ہوئے بڑا فکر انگیز اور مضمون کلام کے نہایت نہایت موزوں و برمحل ہونے کی خوبی کو آشکارا کرنے والا ہوتا تھا، دوسری خصوصیت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یہ ہوتی تھی کہ زندگی کے موجودہ طور وطریق میں ان سے جو رہنمائی ملتی ہے اس کی بہت موزوں تطبیق کرتے تھے۔

قرآن مجید تو تا قیامت رہنمائی کرنے والا کلام ہے اس لیے زمانۂ صحابہ کے لوگوں کے انسانی مزاج وکردار کے لیے اس کلام میں جو سبق ملتا ہے، وہ اسی دور کے لیے محدود نہیں تھا، بلکہ اس کے افادہ وہدایت کا امتداد قیامت تک قائم رہنے والا ہے، جس کو قرآن مجید کے پڑھنے اور سمجھنے والے برابر نسلاً بعد نسل اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے حاصل

کرتے رہے اور کرتے رہیں گے، البتہ اس کے لیے یہ ضرورت برابر رہے گی کہ صحابہ کرام اپنی زبان عربی کے الفاظ ومحاوروں اور مضمون کلام کے موقع ومحل کو جس طرح جانتے تھے اور اس کی بنیاد پر وہ قرآن مجید کے کلام سے رہنمائی اور اثر پذیری حاصل کرتے تھے ان کے اس انداز واقفیت اور صلاحیت فہم کی نقل کرتے ہوئے قرآن مجید کو پڑھایا جائے تو ایسا کرنے سے انسانی زندگی کے نشیب وفراز کے لحاظ سے کلام الٰہی کی رہنمائی وتفہیم کی فطری وطبعی تاثیر وخوبی کا ضرورت کے مطابق استفادہ ہوگا، اور اس سلسلہ میں یہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس استفادہ میں راہ حق سے بھٹکنے سے بچنے کے لیے تفاسیر سے مراجعت کیا جانا بھی ضروری ہے کیونکہ ان کے ذریعہ آیات کے اسباب نزول اور مواقع نزول کا علم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو یہ سب باتیں حاصل تھیں اسی لئے مولانا کے خطابات اور مضامین میں جہاں قرآنی آیات سے استشہاد کا موقع آتا تھا مولانا اپنی اسی اعلیٰ اور فکر انگیز صلاحیت سے کام لیتے تھے۔

مولوی رسال الدین احمد حقانی ندوی کو اللہ تعالیٰ بہت بہت جزائے خیر دے کہ انہوں نے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اس فکر انگیز اور دل نواز خوبی اور ان کے شرح وافادہ کے اس عظیم کارنامے کو حضرت مولانا کی تصنیفات وخطابات اور درس قرآن کے غیر مطبوعہ اور ریکارڈ شدہ تقریروں سے چن چن کر جمع کرنا شروع کیا اس کی ایک جلد تیار ہوکر شائع ہو چکی ہے اور اس نے قارئین سے خراج تحسین حاصل کیا ہے، حتیٰ کے برطانیہ کا ایک ادارہ اس کا انگریزی ترجمہ کر کے شائع کر رہا ہے اب اس مجموعہ کی دوسری جلد اردو میں مرتب ہوکر شائع ہو رہی ہے اس جلد میں اور سابقہ جلد میں مولوی رسال الدین صاحب نے غیر معمولی محنت کی ہیں مولانا کے درس قرآن اور خطابات میں جہاں کچھ اشارے آئیں ہیں، وہاں ان اشاروں کو خود مولانا کی تصنیفات میں تلاش کر کے ان کے حوالہ سے وضاحت کی ہے اور جہاں جہاں مولانا کے متن کلام کے لئے مآخذ کے ذکر کرنے کی ضرورت سمجھی ہے وہاں مآخذ تلاش کر کے اس سے مطابقت کا اہتمام کیا ہے اس طرح انہوں نے اپنے کام کو اعلیٰ

ریسرچ کا ایک کام بنادیا ہے، ان کی اس کوشش کو ندوۃ العلماء کے استاد مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ کا مشورہ وتعاون بھی حاصل رہا اس سے اس کام کو مزید تقویت ملی بہر حال مولوی رسال الدین صاحب کی اس محنت نے قرآن فہمی کے طالبین کے لئے اور اہل علم حضرات کے لئے قرآن کریم کے مطالب کے فکر انگیز اور زندگی کے رہنمائی کرنے والے معانی کے فہم کا اچھا سامان اکھٹا کردیا ہے اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے اور اس کا نفع عام فرمائے۔آمین

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۹/۷/۱۴۲۵ھ - ۱۵/۹/۲۰۰۴ء

باب اول

عقائدواعمال

عبودیت کی بنیاد

عقائداورایمان کی تصحیح پر ہے۔جس کے عقائد میں خلل اورایمان میں بگاڑ ہو،اس کی نہ کوئی عبادت مقبول،نہ اس کا کوئی عمل صحیح مانا جائے گا۔اور جس کا عقیدہ درست اورایمان صحیح ہو،اس کا تھوڑا عمل بہت ہے،اس لیے ہر شخص کواس کی پوری کوشش کرنا چاہئے کہ...............اس کا ایمان وعقیدہ صحیح ہو اور صحیح ایمان وعقیدہ کے حصول اوراس پراطمنان اس کا مقصود عمل اور منتہائے آرزو ہو،اس کو ناگزیر اور بے بدل سمجھے اوراس میں ایک لمحہ بھی تاخیر سے کام نہ لے"!!

دستورحیات:۶۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عالی مرتبت کتابِ ہدایت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن، وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ: اَمَّابَعْدُ!

اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم
﴿الٓمّٓ☆ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَارَیْبَ فِیْہِ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ☆الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ☆وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآاُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآاُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ☆اُوْلٰئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُوْلٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۱-۵)

(یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کوئی شک نہیں (کلامِ خدا ہے) خدا سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور (آداب کے ساتھ) نماز پڑھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اسی میں سے خرچ کرتے ہیں اور جو کتاب (اے محمدؐ) تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں، یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں)

بہت عالی مقامِ کتاب

﴿ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ ''یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کوئی شک نہیں''۔

عربی میں ''ذٰلِكَ'' کا لفظ جو ہے وہ عظمت کے لیے بھی آتا ہے، جب کسی چیز کی نسبت ''ذٰلِكَ'' کی طرف آجائے تو اس میں عظمت کی شان آتی ہے۔ یہ اہلِ زبان کے ذوق کی چیز ہے ''هٰذَا الْكِتَابُ'' بھی فرمایا جا سکتا ہے، لیکن ''ذٰلِكَ'' کہنے سے اس میں ایک عظمت اور وقعت پیدا ہوتی ہے، جیسے کوئی دور کی چیز بہت اہم ہوتی ہے، ہم نے اشارہ کیا تھا، توجہ دلائی جاتی ہے، تو اس ''كِتَابُ'' کی طرف ''ذٰلِكَ'' کا لفظ لانے سے نفسیاتی طور پر اور ادبی طور پر، ذہنی طور پر اس میں یہ بھی بات آئی کہ اس کے طویل اور وسیع مطالب ایسے ہیں کہ جو بہت بلند مقام پر ہیں اور بہت دور تک ہیں، اس لیے ''ذٰلِكَ'' یہ اشارہ بعید کے لیے آتا ہے وہ یہاں استعمال کیا گیا ہے، یہ یونہی نہیں اتفاقی ''هٰذَا'' کے بجائے ''ذٰلِكَ'' کہہ دیا بلکہ اس میں مطلب یہ ہے کہ اس سورہ میں وہ مضامین آنے والے ہیں جو بہت وسیع المقام ہیں اور بعید المکان ہیں، اس لیے ''ذٰلِكَ'' ''یہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں''۔

یہ جو لفظ بار بار ہماری نظروں سے گذرتے ہیں، کانوں میں پڑتے ہیں، سامنے آتے ہیں ان کی اہمیت و عظمت نکل جاتی ہے ان کی جو طاقت ہے، ان کا جو عمق ہے، وہ پھر اس طرح سمجھ میں نہیں آتا ہے، اس کو اہلِ زبان سمجھتے ہیں ''ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ'' اس میں کوئی شک نہیں، یہ کوئی معمولی بات کا دعویٰ نہیں، بلکہ یہ ایک بہت بڑا دعویٰ ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی بڑے سے بڑے بلیغ لوگوں کے کلام میں، ادیبوں کے کلام میں شاعروں کے کلام میں، یہاں تک کہ اہلِ قلوب کے کلام میں بھی کوئی ایسا اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں ''رَيْبَ'' کی گنجائش باقی رہتی ہے، ''ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ'' ''جو بہت عالی مرتبہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں'' جب کوئی چیز عالی مرتبہ ہو

تو اس میں شک کا امکان زیادہ ہوتا ہے، دور کی چیز میں آدمی کہے نہیں یہ نہیں ہے، تو اس میں کہا گیا کہ "یہ کتاب عالی مقام ہے، اس میں کوئی شک نہیں" "یعنی وہ اپنے بلندیٔ مقام کے لحاظ سے بہت وسیع اور بہت فاصلے پر ہے، لیکن ایسی چیز میں جلدی شک پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے یہاں "لَارَیْبَ فِیْهِ" یہیں نفی کر دی کہ اس کتاب ہی میں کوئی شک نہیں"۔

قرآن قطعی اور غیر مشتبہ علم ہے

قرآن کی سب سے بڑی اور معجزانہ اور فوق البشر خصوصیت اس کا علم قطعی اور یقینی ہونا ہے۔ "ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَارَیْبَ فِیْهِ" یہ کتاب ایسی ہے جس میں شک کا کوئی گذر نہیں، قرآن کی اس خصوصیت کو کوئی انسانی کلام اور کوئی انسانی کتاب قرآن کے ساتھ شریک نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے، قرآن کا سرچشمہ اور مآخذ "علم الٰہی" ہے اور اس کے نزول کا ذریعہ "وحی الٰہی" ہے، یہ سرچشمہ ہر قسم کے عیب و نقصان، شک و اشتباہ، ظن و تخمین، تدریج و ترقی اور تعارض و اختلاف سے پاک ہے، اس میں جو کچھ ہے وہ یقینی اور قطعی ہے، مشاہد اور مرئی ہے یکساں اور آخری ہے۔

متقین کے لیے ہدایت ہے

"هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ" "ہدایت ہے متقین کے لیے" یہ ہدایت ہے ان لوگوں کے لیے جن کے اندر خوفِ خدا ہے اور جس کے اندر اپنے انجام کی فکر ہے، یہاں "مُتَّقِیْنَ" کا معنی یہ نہیں کہ خالی زاہدوں کے لیے ہدایت ہے، عابدوں کے لیے ہدایت ہے "مُتَّقِیْنَ" کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو ہمیشہ عابد و زاہد لوگ ذہن میں آتے ہیں، بڑے متقی لوگ ہیں، فلاں جگہ بڑے متقی لوگ رہتے ہیں، فلاں خانقاہ میں متقی ہیں، فلاں مدرسے میں متقین ہیں، تو ہمارے ذہن میں متقین کے ساتھ عابدوں کا تصور آتا ہے، متقین اور عباد، زہاد دونوں بالکل مرادف بن گئے ہیں لیکن "مُتَّقِیْنَ" وہ نہیں، "مُتَّقِیْنَ" اس سے اونچا مقام ہے، جسکے اندر احتیاط ہو، جس کے اندر بہت ہی تیز شعور ہو، حساسیت ہو کہ یہ گناہ کی بات ہے، اس

سے بچنا چاہیے، یہ مشتبہ چیز ہے اس کو نہیں کرنا چاہیے، اس کو "مُتَّقِیْنَ" کہتے ہیں۔

تو "مُتَّقِیْنَ" سے مراد "عابدین، زاہدین" نہیں، بلکہ جن کے اندر یہ احساس ہے کہ ہمارے لیے فلاں چیز مضر ہے، ہمارے لیے فلاں چیز مہلک ہے، ہمارے لیے فلاں چیز بڑی خطرناک ہے، جن کے اندر یہ احساس ہو، خوف کا یہ شعور ہو اور وہ بہت ہی امان چاہتے ہوں تو ان کے لیے "مُتَّقِیْنَ" کا لفظ کہا گیا۔

"قرآن کی بنیاد خدا کے خیال اور اس کے خوف پر ہے جس کا دل خدا کے خوف سے خالی ہے اور جس کے لیے خدا کے نام میں کوئی اثر اور کشش نہیں اس مین درحقیقت دین کا مادہ نہیں ہے اور وہ گویا دین کے حاسہ سے محروم ہے۔ جب کسی کا کوئی حاسہ کم ہو تو اس کے محسوسات کا وہ کسی طرح حس اور ادراک نہیں کرسکتا۔ تو قرآن نے اپنے کو ان لوگوں کے لیے ہدایت اور مفید بتایا ہے جن کے دل پر خدا کے نام کا اثر ہوتا ہے اور ان کے خاکستر میں کوئی دبی ہوئی چنگاری موجود ہے"۔

ایمان بالغیب کا مطالبہ

"هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" "ہدایت ہے متقین کے لیے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں" پہلی چیز تو یہ ہے کہ جس کا تعلق عقائد سے ہے اور صفات الٰہی سے ہے اور ذاتِ الٰہی سے ہے اور دین کے اسرار سے ہے اس کا تعلق تو "غَيْب"[1] سے ہے۔

پہلے تو عقیدہ کا ذکر کیا "اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ" عقیدہ اس میں آ گیا سب، "جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں، غیب پر یقین رکھتے ہیں" اب اس کے بعد عمل کا درجہ آیا "وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" "کہ جو لوگ نماز پڑھتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے وہ خرچ کرتے ہیں" ایمانیات میں سب سے اولین چیز ہے "ایمان بالغیب" اور عملیات میں سب سے اہم چیز ہے "نماز اور زکوٰۃ"، "ہدایت ہے متقین کے لیے جو غیب پر

(۱) غیب اصطلاح میں اس حقیقت کو کہتے ہیں جس کا مجرد حواس یا عقل خالص سے ادراک نہ کیا جاسکے (مذہب و تمدن: ۶۷)

ایمان رکھتے ہیں'' اور غیب پر ایمان رکھے بغیر نہ قرآن مجید سے نفع اٹھایا جاسکتا ہے نہ انبیاء کے بشارات پر پورا ایمان مکمل ہوسکتا ہے۔

''ایمان بالغیب'' میں یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ شرط نہیں تھا کہ ہر چیز ہمارے سمجھ میں آئے اور ایسے ہی ہر چیز ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو دین کا جو بنیادی حصہ ہے وہ غیب سے تعلق رکھتا ہے اور جو عملی حصہ ہے وہ شہود سے اور جسمانیت سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر دین کے لیے اور خاص طور سے دین اسلام کے لیے سب سے پہلی شرط جو ہے جس کے بغیر آدمی آگے بڑھ ہی نہیں سکتا وہ ''ایمان بالغیب'' ہے یعنی اللہ کی صفات پر ایمان لانا ہوگا، آخرت کے وقوع پر ایمان لانا ہوگا، قسمت اور تقدیر پر اللہ کے ہاتھ میں ہونے پر ایمان لانا ہوگا، نفع و ضرر پر خدا کے مالک ہونے پر ایمان لانا ہوگا۔ یہ سب چیزیں غیب سے تعلق رکھتی ہیں اور دین کا جو بڑا حصہ ہے یعنی عقائد کا جو بڑا حصہ ہے، مسلمات کا جو حصہ ہے، ایمانیات کا جو حصہ ہے وہ غیب سے تعلق رکھتا ہے اور باقی اس کے بعد پھر عمل ہے، عبادات ہیں، فرائض ہیں، واجبات ہیں، سیرت و معاشرت سب ہیں، لیکن پہلی چیز جو دین میں مطلوب ہے اور شرط ہے وہ ''ایمان بالغیب'' ہے اگر ''ایمان بالغیب'' نہیں ہے تو دین پر ایمان نہیں ہوسکتا، قدم قدم پر وہ چیز آئیں گی کہ جن میں ''ایمان بالغیب'' کی ضرورت ہوگی، اللہ تعالی کا رحیم و رحمان ہونا، اللہ کی ذات و صفات اور یوم آخرت اور اعمال و افعال کا نتیجہ جو آخرت میں نکلنے والا ہے، ان سب چیزوں کے لیے ''ایمان بالغیب'' کی ضرورت ہوگی۔ تو سمجھنا چاہیے کہ دین کا بنیادی جو مطالبہ ہے اور بنیادی شرط ہے وہ ''ایمان بالغیب'' ہے اگر ''ایمان بالغیب'' نہیں ہے تو بالکل وہ دین نہیں، کوئی ناصحانہ بات ہوئی، موعظت ہوئی، تعلیم و تربیت ہوئی، حکیمانہ بات ہوئی، یہ سب ہوسکتا ہے لیکن دین نہیں ہوسکتا، دین کے لیے تو ''ایمان بالغیب'' ضروری ہے، اللہ کیسا؟ اللہ کی ذات اللہ کی صفات اور آسمانوں کا پورا نظام اور پھر یہ نظام قدرت اور پھر اللہ تعالی کی ہستی اور اسکے علاوہ وہ قادر مطلق ہے حکیم برحق ہے اور وہ رحمٰن و رحیم ہے اور اس کے ساتھ عزیز و جبار ہے، منتقم ہے، یہ ساری چیزیں ''ایمان بالغیب'' سے تعلق رکھتی ہیں، اگر ''ایمان بالغیب نہیں'' تو دین میں تو وہ آدمی داخل ہی نہیں ہوا، قدم ہی نہیں رکھا اس نے دین کی عمارت میں، اس لیے کہ

قرآن مجید ''ایمان بالغیب'' پر بہت زور دیتا ہے، اس کو ہدایت اور دین سے فائدہ حاصل کرنے کی بنیادی شرط، ہدایت یافتہ لوگوں کا شعار اور ارباب صلاح وتقوی کی اہم پہچان قرار دیتا ہے اور بہت زور اور قوت کے ساتھ اس کا مطالبہ کرتا ہے۔ ''اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ'' اور جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اسلام (جو تمام انبیاء کا دین ہے) پر ایمان لاتے ہیں۔

اب اس کے بعد دوسرا درجہ نماز اور زکوٰۃ کا ہے، فرمایا ''وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ'' اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں وہ خرچ کرتے ہیں۔

ایمانیات نبوی کا اشتراک

''وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ'' ''اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں''

اس میں جہاں تک ایمان کا تعلق ہے تو اس میں بھی پوری ایک مساحت ہے، اس کا پورا سلسلہ ہے جو تعلیمات نبوی اور حضور پاک (ﷺ) پر جو قرآن نازل ہوا اور جو احکام نازل ہوئے اس پر ایمان سے لے کر رسول آخر کے ایمان تک، دین اول کے ایمان سے لے کر دین آخر کے ایمان تک مسلسل جاری ہے اور اس سب پر ایمان لانا ضروری ہے، مسلمانوں کے لیے یہ بات بالکل کافی نہیں ہے اور نہ اسلام کے تحقق کے لیے، نہ اسلام کی صحت کے لیے کہ جو حضور پاک (ﷺ) پر نازل ہوا، ہم قرآن مجید پر ایمان لاتے ہیں اور آپ کی رسالت پر ایمان لاتے ہیں باقی تمام پیغمبروں کو نہ ہم جانتے ہیں، نہ ماننا ضروری ہے، وہ نہیں، بلکہ پہلے ان سب کا ماننا ضروری ہے، قرآن مجید میں ان کا ذکر ہے اور ان پر ایمان لانے والوں کا ذکر ہے اور ان کی شان بیان کی گئی ہے اور پھر چونکہ ایمانیات نبوی میں ایک اشتراک ہے، اس لیے جب کسی چیز میں اشتراک ہو تو فیصلہ میں بھی اشتراک ہوتا ہے، پورے اجزا کا ماننا ضروری ہوتا ہے۔

عقیدۂ آخرت کا اہتمام

"وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ" "اورآخرت پر یقین رکھتے ہیں" قرآن کی ترغیب وترہیب اور وعظ واصلاح کی ایک اہم بنیاد آخرت ہے، وہ آخرت سے ڈراتا ہے، آخرت کے ثواب کی امید دلاتا ہے اور اس اہم سفر کی تمام ضروری معلومات اور اس کی پیش آنے والی منزلوں کی صحیح اطلاع اور ضروری ہدایات دیتا ہے، اس لیے جو لوگ آخرت کے آرزومند اور معتقد ہیں، وہ قرآن مجید سے کسی حال میں مستغنی نہیں ہو سکتے، لیکن جو لوگ آخرت کے منکر ہیں، یا عقیدۃً منکر نہیں ہیں مگر عملاً ان پر دنیا پرستی اور دنیا غالب ہے اور زندگی کے تمام مسائل میں ان کا نقطۂ نظر بالکل مادی ہے، ان کے لیے قرآن بے اثر، یا کم اثر ہے، مادیت کا غلبہ ان میں ایسی بلادت اور غباوت پیدا کر دیتا ہے کہ غیر مادی چیزوں کے بارے میں ان کا دماغ کام ہی نہیں کرسکتا" اس لیے فرمایا "وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْن" "اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں" یہ پورے دین کی تعریف آ گئی۔

"أُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" "وہی لوگ ہیں جو اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں، جنہیں اللہ کی طرف سے ہدایت نازل ہوئی" وہ نبیؐ کے ذریعہ سے ظاہر ہوئی، اس پر وہ قائم ہیں، "وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" "اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں" یہ "فلاح" کا لفظ بہت جامع اور وسیع ہے، جب اللہ تعالی فرمایا "مفلح" تو اس کے اندر دین ودنیا ہر طرح کی فلاح آجاتی ہے اور اصل جہنم سے نجات اور جنت کا استحقاق۔ (۱)

(۱) مشترک اخذ وتلخیص از:- درس سورۂ بقرہ (غیر مطبوعہ آیات) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی ۱۶، اور ۱۵۷، اور ۱۶۴۔ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین ۹۲۔۹۳۔

نماز زکوٰۃ اور آخرت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿طٰسٓ تِلْكَ آيٰتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ☆ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالآخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ☆ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ☆ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الآخِرَةِ هُمُ الأَخْسَرُوْنَ﴾ (سورۃ النمل: ۱—۵)

(ترجمہ۔"یہ قرآن مجید کی آیتیں ہیں اور کھلی ہوئی کتاب کی ہدایت ہے اور بشارت ہے مؤمنوں کے لیے، وہ لوگ جو کہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے، ہم نے ان کے اعمال کو مزین کردیا ہے ان کے لیے، پس وہ بھٹکتے پھرتے ہیں")

علم وعمل کے محرک پہلو

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، ﴿طٰسٓ تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ﴾ "یہ قرآن مجید کی آیتیں ہیں اور کھلی ہوئی کتاب کی" "هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ" "ہدایت ہے اور بشارت ہے مؤمنوں کے لیے"۔ "ہدایت" اور "بشارت" یہ دونوں علم وعمل کے ایسے

محرک پہلو ہیں جن سے جامعیت پیدا ہوتی ہے۔ ''ہدایت'' تو یہ کہ بتایا جائے کہ یہ راستہ ہے اس پر چلو، لیکن اس راستہ پر آدمی تب چلتا ہے جب اس کے فوائد سامنے ہوں، عام زندگی میں بھی یہی ہے کہ اگر آپ کسی سے کہدیں (اور آپ پر اس کا اعتبار نہ ہو، تجربہ نہ ہو، آپ کا معتقد نہ ہو) کہ دیکھئے فلاں جگہ یہ راستہ جاتا ہے، تو آدمی ڈرے گا کہ کہیں غلط راستہ تو نہیں بتلایا، کوئی اور مقصد تو نہیں.... اس لیے اس کے ساتھ یہ لفظ ''بشارت'' زائد نہیں ہے، ''ہدایت'' کا لفظ کافی تھا، لیکن ''ہدایت'' کے ساتھ جب ''بشارت'' شامل ہو جائے، تو اس میں ایک محرک قوی، محرکِ عملی اور محرکِ ذہنی، محرکِ وجدانی دونوں پیدا ہو جاتے ہیں، ''هُدىً وَبُشْرىٰ لِلْمُؤْمِنِيْنَ'' ''ہدایت اور بشارت ہے مؤمنوں کے لیے''!

اقامت صلوٰۃ

''يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ'' ''وہ لوگ جو کہ نماز کو قائم کرتے ہیں'' نماز کو پڑھتے ہیں نہیں کہا یہاں پر نماز کو پڑھنا الگ چیز ہے، پھر عربی میں ''صَلّٰى. يُصَلِّي'' کے لفظ آتے ہیں سادے ''نماز پڑھتے ہیں'' نہیں کہا گیا، اگر کہنا ہوتا کہ نماز پڑھتے ہیں تو ''يُصَلُّوْنَ'' کہتے، لیکن ''يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ'' کہا ''اِقَامَةِ الصَّلٰوةَ'' میں ''صلوٰۃ'' کے فقہی احکام بھی آجاتے ہیں اور اس کے روحانی اثرات بھی آجاتے ہیں، اس کے اندر نماز کے تمام حقوق ومطالبات، اس کے اجزاء، اس کے نتائج، اس کے آداب اور وسائل اور صحیح طریقہ پر نماز پڑھنا بھی آجاتا ہے اور اس کا حق ادا کرنے کا یعنی معیار جو ہے نماز کا کہ اس معیار سے نماز پڑھی جائے، سنت کے مطابق پڑھی جائے، عمل ہو اس حدیث پر ''صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ''[1] (اسی طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو) یا ''قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ'' (سورۂ بقرہ: ۲۳۸) (اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزوں کی طرح کھڑے رہا کرو) ان سب کو ''اقامت'' کا لفظ حاوی ہے ''يقيمون الصلوة'' صلوۃ کو قائم کرتے ہیں ''اقامت'' سے بڑھ کر کوئی لفظ ہو نہیں سکتا، جب قائم کرنا کسی چیز کے لیے

(۱) بخاری شریف

کہا جائے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسی قد و قامت کے ساتھ، اسی خصوصیات کے ساتھ قائم کیا جائے'' اور اقامت'' کے اندر قنوت بھی آجاتا ہے ''قُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِیْن'' اور ہیئت بھی آجاتی ہے، توجہ اور انابت بھی آجاتی ہے خشوع بھی آجاتا ہے اور پھر اس میں ''صَلُّوا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ أُصَلِّیْ'' یعنی اتباع سنت بھی آجاتا ہے تو ایک مفرد لفظ سے یہ ساری چیزیں اس میں شامل ہو گئیں کہ نماز ہو، اس میں خشوع ہو اور نماز پڑھنے والا یقین کرے کہ خدا کے سامنے کھڑا ہے، ''کَأَنَّکَ تَرَاہُ فَإِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَإِنَّہٗ یَرَاکَ'' (۱) والا مضمون کہ ''ایسی نماز پڑھنی چاہیے کہ جیسے تم خدا کو دیکھ رہے ہو، اگر تم نہیں دیکھتے ہو تو یہ یقین ہونا چاہیے کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے اور یہی وہ نماز ہے جو ہر مسلمان سے مطلوب ہے اور نجات کی شرط اور ایمان کی محافظ ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت و تقویٰ کی بنیادی شرط کے طور پر بیان کیا ہے۔ (۲)

ان سب کو ایک مفرد لفظ اگر عربی کا (یعنی عربی زبان سے مناسبت ہونے کی بنا پر عرض کر رہے ہیں) کوئی لفظ ان سب کو حاوی ہو سکتا ہے اور ان سب کو جامع ہو سکتا ہے، تو وہ ''''اقامت'' کا لفظ ہے ''اقام'' سے (یہ اردو میں جو عربی کے لفظ آگئے ہیں، ان کی وجہ سے ذرا سا مفہوم میں تنگی پیدا ہو گئی ہے یا کچھ چیزیں اور شامل ہو گئی ہیں، جب تک عربی الفاظ کی روح اور عربی الفاظ کی طاقت اور ان کا درجہ نہ معلوم ہو، آدمی سمجھ نہیں سکتا ہے) ''اقامت'' کا لفظ عربی میں بہت ہی وسیع اور بہت ہی ذمہ داری کو چاہنے والا اور حقوق کے ادا کرنے کا ضامن اور اس کو بہتر سے بہتر طریقے پر ادا کرنے کے معنی میں ہے، ''اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ'' ''جو کہ نماز کو قائم کرتے ہیں''

زکوٰۃ کی اہمیت

''وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ'' ''اور ''زکوٰۃ'' دیتے ہیں'' اللہ تعالیٰ نے نماز کے قیام اور زکوٰۃ

(۱) متفق علیہ۔ (۲) سورۂ بقرہ: ۱-۳ سورۂ اعلیٰ: ۱۴-۱۵۔
نیز تفصیل کے لیے مصنف کی کتاب ''ارکان اربعہ: نماز، ملاحظہ ہو۔ (مرتب)

کی دائیگی کو اسلام کی صحت وقبولیت اور اس کے احکام کی بجا آوری کی علامت قرار دیا ہے،
قرآن مجید میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ۸۲/ مقامات پر آیا ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں
کے اوصاف جہاں جہاں بیان کئے گئے ہیں، وہاں بھی ہمیشہ "یُقِیْمُوْنَ الصَّلوٰۃَ وَ یُؤْتُوْنَ
الزَّکوٰۃَ" آیا ہے۔

زکوٰۃ کے بارے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ محض کوئی ٹیکس یا جرمانہ یا سرکاری
مطالبہ نہیں ہے وہ نماز، روزے کی طرح ایک مستقل عبادت ہے اور خدا سے قرب حاصل
کرنے کا ایک ذریعہ اور اخلاقی اصلاح اور تربیت کا ایک الٰہی نظام ہے، نیز ہمدردی و
غمخواری اور حسن سلوک کی کم سے کم حد ہے، یہ ایسا فریضہ ہے جس سے روگردانی اور فرار اللہ
تعالیٰ کو کسی صورت میں منظور نہیں اسلامی شریعت نے نہایت جزم اور سختی کے ساتھ اس کا
مطالبہ کیا ہے اور اس کو اسلامی شریعت مسلمانوں کا شعار اور دین کے بنیادی ارکان میں سے
ایک رکن قرار دیا ہے"۔

زکوٰۃ کی تشریعی حکمت، اموال ونفوس کا تزکیہ وتطہیر، رضائے خداوندی کا حصول،
رحمت الٰہی کا نزول، مساکین وفقراء کے ساتھ مؤاسات وغمخواری، ضرورت مندوں کی
حاجت برآری اور حرص وبخل اور اکتناز (دولت کی ذخیرہ اندوزی) سے حفاظت ہے[1]۔

آخرت پر ایمان کی شرط

"وبالآخرۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ" "اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں" جہاں تک فرائض کا
تعلق ہے، اس میں "صلوٰۃ" اور "زکوٰۃ" کو لیا ہے، اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو
زندگی میں تو........ یہ کہ ایک کا تعلق جسم سے، دماغ سے، قلب سے، ارادوں سے اور قلب کی
کیفیات سے ہے، وہ "اِقَامَتِ صَلوٰۃ" ہے اور پھر ایک بہت بڑی آزمائش جو مال کی محبت
کی ہے اس کے لیے "وَیُؤْتُوْنَ الزَّکوٰۃَ" "اور زکوٰۃ دیتے ہیں" اور پھر اس کے بعد تیسری
چیز جو اس کے لیے گویا ایک تکملہ ہے، وہ ہے "وھم بالآخرۃ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ" اور وہ آخرت پر

(۱) زکوٰۃ کا پورا نظام اور روح سمجھنے کے لیے "ارکانِ اربعہ" میں زکوٰۃ کا باب دیکھنا چاہیے۔ (مرتب)

یقین رکھتے ہیں۔ "صلوٰۃ" اور "زکوٰۃ" ہو، لیکن "اگر آخرت پر" یقین نہ ہو تو پھر بہت سی خامیاں رہ جاتی ہیں بہت سی چیزوں میں آدمی کوتاہی کرتا ہے اور کوئی راستہ نکال لیتا ہے، بہانے کرتا ہے اور تاویل کر لیتا ہے اور تساہل سے کام لیتا ہے، لیکن جب "آخرت پر یقین" بھی ہو اس کے ساتھ، تو وہ سب چیزیں آجاتی ہیں، پوری شریعت آجاتی ہے، پھر آدمی یہ پوچھتا ہے کہ آخرت میں کیا چیز مفید ہے، کیا چیز مضر ہے؟ وہاں پر سنت کی ضرورت ہوتی ہے، حضور ﷺ نے ان چیزوں کو فرض بتایا ہے، ان چیزوں کو حرام بتایا ہے، ان چیزوں کو آخرت میں مفید ہونا بتلایا ہے، اسی لیے جس وقت اہل جنت جنت کے دروازے پر پہنچیں گے، ایسا جامع اللہ تعالیٰ نے ان کا بیان نقل کیا ہے، "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَا أَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ" (۱) "اللہ ہی نے ہم کو یہاں تک پہنچایا ہے، ہم خود پہنچنے والے نہیں تھے اگر اللہ ہم کو یہاں نہ پہنچاتا" اتنا کافی تھا، پھر اس کے بعد اس کا تکملہ یہ ہے، ﴿لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ یہ براہ راست بلا واسطہ نہیں ہوسکتا تھا، کہ اپنی عقل سے، فہم سے، مطالعہ سے، ذہانت سے، ہم آخرت تک پہنچ جاتے، یا ادیان کے مطالعہ سے، "لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ" اس میں پیغمبروں کا واسطہ ہے، اصل میں جنت تک پہنچانے کا صحیح راستہ بتانے والے وہ ہیں اور ضامن ہیں وہ یہاں بھی شرط لگائی "وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ"۔

اب "اقامتِ صلوٰۃ" ہے اور "ایتاء زکوٰۃ" ہے عملاً یعنی لوگ دیکھ رہے ہیں کہ یہ آدمی نماز قضا نہیں کرتا ہے، لوگ دیکھ رہے ہیں کہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے، لیکن اس کے دل میں آخرت کا خوف نہیں ہے اور آخرت کا استحضار نہیں ہے، تو اس سے بہت سی وہ غلطیاں ہوں گی جو "اقامت صلوۃ" اور "ایتاء زکوٰۃ" کے ساتھ ہوسکتی ہیں اور مثلاً بہت غصہ آجانا، اشتعال میں پڑ جانا، ظلم کرنا، کسی کا حق دبالینا، یا غرور پیدا ہو جانا، یہ وہ چیزیں ہیں جو "اقامت صلوٰۃ" اور "ایتاء زکوٰۃ" کے ساتھ بھی شامل ہوسکتی ہیں اور لوگوں کی زندگیوں میں اگر غور کیا جائے تو اکثر خرابیوں اور کمزوریوں کی وجہ ہوتی ہے آخرت پر ایمان کی کمزوری، آخرت پر یقین کی کمزوری اور آخرت کے استحضار کی کمزوری، جن لوگوں کا استحضار تھا آخرت پر، خلفاء

راشدین تھے، صحابہ کرامؓ تھے، تو ان کو کسی وعظ و نصیحت، زجر و توبیخ کی بالکل ضرورت نہیں تھی، سب چیزوں میں آخرت ان کے پیش نظر رہتی تھی، یہ چیز آخرت میں کیا رنگ لائے گی، یہ آخرت میں کیا نتیجہ لائے گی، بس وہ چیز کافی تھی۔

یہ دراصل اس عقیدہ کی خاصیت ہے، یہ قدرتی طور پر اپنے ماننے والوں میں اس زندگی کی بے وقعتی، خواہشات پر قابو اور مردانگی و حق پرستی کے یہ اوصاف پیدا کرتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اسلام کی فتوحات و ترقیات اور اس کی عام ترویج و اشاعت اسی ایمان و عقیدہ کی مرہونِ منت ہے۔

نفسیاتی کمزوری کی تشخیص

"اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالآخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ" جب آخرت کا ذکر آیا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ یہ فرما دیتا ہے کہ "جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے اعمال کو مزین کر دیا ہے ان کے لیے" "فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ" پس وہ بھٹکتے ہیں اور ٹھوکریں کھاتے ہیں"۔

یہ آخرت کے عدم ایمان کے ساتھ "تزئین اعمال" یہ ایک ایسی نفسیاتی کمزوری، نفسیاتی مرض کی تشخیص ہے اور ایک حقیقت واقعہ کی کہ جو اعجاز قرآنی ہی کا نتیجہ ہے کہ "جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں، ان کو اپنے اعمال دنیا میں بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں" یہ کوٹھی بنالی، اب ان سے پوچھیے یہ آخرت میں کیا کام آئے گی؟ کچھ اس کا فائدہ ہے؟ کوئی فائدہ نہیں دے گی، اتنا سرمایہ جمع کر لیا، بینک میں اتنا روپیہ جمع ہو گیا، یہ عہدہ حاصل ہو گیا، یہ ایک منسٹری مل گئی یہ اعزاز ہو گیا، ایسی وہ چیزیں کہ آخرت میں بالکل جن کی کوئی قیمت نہیں ہے، وہ "مزین" ان کو نظر آتی ہیں، لیکن جس کے سامنے آخرت ہے، وہ آخرت کے پیمانے سے تولتا ہے، ناپتا ہے اس چیز کو کہ یہ جو کامیابی ہمیں حاصل ہوئی ہے آخرت میں اس کی کیا قیمت ہوگی؟ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک موقع دیا اب ایثار کرنے کا، ایک موقع دیا قربانی کرنے کا، ایک موقع دیا حج و عمرہ کرنے کا، ایک موقع دیا بذل اموال کا،

سخاوت کا، فقیروں کو دینے کا، تو آدمی خوش ہوگا کہ یہ آخرت میں کام آنے والی ہے، لیکن جن کا آخرت پر یقین نہیں ہے، وہ مظاہر کے فریفتہ ہوتے ہیں، اسی پر بہت پھولے نہیں سماتے، بڑے خوش ہوتے ہیں، یہ ہم نے خرید لیا، اتنی قیمتی چیز خرید لی، یہ کوٹھی خرید لی، ایک اتنا بڑا اتھری اسٹار ہوٹل بنالیا اور ہم نے وہاں کا سفر کیا اور وہاں یہ انعام ہم کو دیا گیا، ہمارا وہاں یہ رسپشن Reception ہوا، استقبالیہ ہم کو دیا گیا، یہ سب چیزیں ان لوگوں کی نظر میں وقیع ہوتی ہیں آخرت پر جن کی نظر نہیں ہوتی ہے اور جن کی آخرت پر نظر ہے، وہ تو اپنے اندر خود دیکھتے ہیں اور دوسروں سے پوچھتے ہیں کہ آخرت میں یہ بات کتنی کام آنے والی ہے؟ اب اگر انہوں نے کسی بھوکے کو کھانا کھلا دیا، کسی ایسے مریض کو جس کا علاج ناممکن ہو رہا تھا اور قدرت نہیں رکھتا تھا، خود اپنی طرف سے اس کے علاج کا سامان کر دیا اور چھپ کر کوئی کام ایسا کیا، کسی کار خیر میں حصہ لیا، تو وہ اس لحاظ سے خوش ہوں گے کہ یہ آخرت میں کام آنے والی چیز ہے۔

اس لیے ''صلوٰۃ'' اور ''زکوٰۃ'' کے ساتھ آخرت کے یقین کا تذکرہ نہایت مناسب موقع اور فطرت انسانی کے مطابق اور شریعت کا جو مطالبہ ہے اور جو معیار ہے شریعت کا، تقویٰ کا، خوف خدا کا، احتیاط کا، ان سب کے ساتھ یہ ضروری چیز ہے۔

'' **زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ** '' . . . ''ہم نے ان کے لیے ان کے اعمال مزین کر دیئے'' کرنے والا تو اللہ ہی ہے، کوئی کتنا ہی کسی چیز کا ارادہ کرے، جب تک اللہ تعالیٰ اس کے کرنے کی اجازت نہ دے یعنی چھوٹ نہ دے اور ڈھیل نہ دے، اس وقت تک وہ ہوتی ہی نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف کی کہ خالق حقیقی وہی ہے، جیسے وہ اجسام کا خالق ہے، ویسے ہی وہ ارادوں کا، ارادے بھی بغیر اس کی اجازت کے نہیں ذہن میں آسکتے، تو ان کے لیے ان کے اعمال ''مزین'' ہیں،

'' **فَهُمْ يَعْمَهُونَ** '' تو وہ اس میں بھٹکے پھر رہے ہیں، بالکل اندھے بنے ہوئے ہیں، چیزوں کو اسی پیمانے سے تولتے اور ناپتے ہیں۔

دیکھیے اس وقت کا یہ جو تمدن ہے، یہ '' **زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ** '' کا بہترین مظہر ہے،

آپ امریکہ سے لے کر انڈونیشیا تک چلے جائیں، ہر جگہ آپ کو ایک بڑا طبقہ ملے گا، جس کو اپنی یہ شان وشوکت اور وہ اختیارات اور اعزاز واستقبالات اور ممبریاں، ممبر شپ، فلاں پارلیامنٹ کی، اسمبلی کی، کونسل کی اور جو کچھ بھی ہوں، وہ سب ان کے نزدیک بڑی ترقی، بڑی عزت کا معیار ہے "زَيَّنَّا لَهُمْ أَعْمَالَهُمْ" اس کے لیے "تَزْيِيْنْ" عربی کا بہترین اور مناسب ترین لفظ ہے۔

"أُولَـٰئِكَ الَّذِيْنَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُوْنَ" " وہ لوگ ہیں جن کے لیے بُرا عذاب ہے اور آخرت میں سخت نقصان میں رہنے والے ہیں یعنی وہ اپنے کو یہاں کامیاب سمجھ رہے ہیں اور آخرت میں وہ سب سے ناکام ثابت ہوں گے۔ (۱)

(۱) درس قرآن-سورۂ نمل: ۱-۵ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ اقتباسات ذیل بالترتیب حسب کتب سے اخذ و تلخیص ہیں: ☆ ارکان اربعہ: ۱۹۲-۱۹۳ ☆ ایضاً: ۲۰۰-۲۰۱ ☆ ایضاً: ۱۵۰-۱۵۱ ☆ مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی: ۱۵۷ ☆ تحفۂ دین ودانش (تلخیص): ۹۶-۹۷ ☆ ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں: ۹۶ ☆ معرکۂ ایمان ومادیت: ۹۹

حج کے اہم مقاصد

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم

﴿وَإِذۡ بَوَّأۡنَا لِإِبۡرَاهِيمَ مَكَانَ الۡبَيۡتِ أَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِيۡ شَيۡئًا، وَّ طَهِّرۡ بَيۡتِيَ لِلطَّائِفِيۡنَ وَالۡقَائِمِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ﴾ (حج:۲۶)

(اور جب ہم نے ابراہیمؑ کے لیے ٹھکانہ بنایا، بیت اللہ کی جگہ کا کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور میرے گھر کو پاک کرو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع سجود کرنے والوں کے لیے)

موزوں ترین لفظ ''بَوَّأۡنَا''

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿وَإِذۡ بَوَّأۡنَا لِإِبۡرَاهِيمَ مَكَانَ الۡبَيۡتِ﴾ ''اور جب ہم نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے ٹھکانہ بنایا بیت اللہ کی جگہ کا''

ایک ایک آیت نہیں ایک ایک لفظ سمندر ہے، معانی کا، موعظت کا اور تفکر کی دعوت کا، .... کہا کرتے ہیں کہ لفظوں کے مزاج ہوتے ہیں اور لفظوں کے حدود ہوتے ہیں اور لفظوں کی طاقت ہوتی ہے اور یہ کسی زبان کے سمجھنے والے، اس کے ترجمے کرنے والے نہیں، جو زبان کے مزاج داں ہوتے ہیں، ایک زبان دانی ہے اور ایک مزاج دانی ہے، اردو میں بھی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک مطلب کے لیے، ایک مقصد کے لیے چار، دس، بیس، لفظ ہو سکتے ہیں، لیکن اس لفظ کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس کا اندازہ ہوتا ہے، جب اس کے ماحول پر

نظر ڈالی جائے، جب اس کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، اس کی نوعیت پر نظر ڈالی جائے، تقابل کیا جائے، اب یہی ہے (ہم تو عرب نہیں ہیں، عربی اللسان نہیں ہیں، یہیں اسی گاؤں، دیہات کے رہنے والے ہیں) کہ کسی ادیب سے کہا جائے کہ یہ کہنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے ایک جگہ کا انتخاب کیا گیا، جگہ بنائی گئی، تو دس لفظ، چار پانچ تو ہم ہی بول سکتے ہیں، ''اِختَرْنَا'' اور ''فَضَّلْنَا'' ''مَکَّنَّا'' سب، لیکن ''بَوَّأنَا'' کا جو لفظ ہے، یہ لفظ اس مقام اور محل کے لیے بہترین موزوں ترین لفظ ہے، ''تَبْوِیَة'' کے لیے کئی چیزوں کی شرط ہے، یہ کہ وہ جگہ جہاں آسانی سے آدمی پہنچ سکے، ''مُبَوَّأ صِدْقٍ. ''مُبَوَّأ'' اس جگہ کو کہیں گے کہ جہاں پہنچنا آسان ہو، یہ نہیں کہ ٹکٹ لینا پڑے، کچھ خوشامدیں کرنا پڑیں اور بڑی مشقت سے آدمی وہاں پہنچے۔ ''بوأنا'' ''اس کو تیار کر دیا'' یعنی اس کے اندر تمکین بھی ہے، اس کے اندر استقرار بھی ہے، اس کے اندر امن بھی ہے، اس کے اندر موزونیت بھی ہے اور اس کے اندر دوام بھی ہے، اس کو کوئی بیان نہیں کر سکتا (تفسیر میں بھی یہاں تک کہ کشاف جو علامہ زمخشریؒ کی تفسیر ہے اور وہ عربی کے بڑے مزاج داں تھے، وہ بھی حق نہیں ادا کر سکے ہوں گے اس کا)

''مُبَوَّأ'' کا مصداق وہ جگہ ہوگی، جہاں کوئی رکاوٹ نہ ہو، جانے میں، جہاں کوئی مزاحمت نہ ہو، آسانی سے پہنچ جائے، (سفر کی طوالت یا خرچ یہ چیزیں الگ ہیں) یہ نہیں کہ وہاں پر کسی کا پہرا ہو، یہاں کیوں آئے تم؟ یہاں نہیں آسکتے، ٹکٹ لو، پہلے یہ کام کرو، وہ کام کرو اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ جگہ آرام دہ ہو یعنی اس کے اندر کوئی نشیب و فراز زیادہ نہ ہو پہاڑیاں نہ ہوں، کانٹے نہ ہوں، یہ بھی ''بَوَّأنَا'' میں آتا ہے، یا نخلستان نہ ہو، مکانوں کا کوئی بہت بڑا جھنڈ یا بڑا محلّہ نہ ہو، کہ اس سے بچے، اس سے نکلے، یہاں پردہ، یہاں اجازت، یہ سب کچھ نہیں، بلکہ اٹھا آدمی وہاں پہنچا اب پہنچنے میں جو کچھ بھی ہو ''بِشِقِّ الأنفُسِ'' لیکن جب وہاں پہنچا اب جیسے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جگہ ہے یہ۔

ٹھکانے کا سب سے بڑا مقصد

''وَإِذْ بَوَّأنَا لِإبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ'' ہم نے جب کہ ٹھکانہ دیا ابراہیم علیہ السلام

کے لیے، بیت اللہ کی جگہ کا "اَلْبَیْتُ" خانہ کعبہ کی جگہ کا ("اَلْبَیْتُ" جب "بیت" کے ساتھ "ال" آ جائے تو پھر اس سے مراد کعبہ ہی ہوتا ہے) کہ اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ "أَنْ لَاتُشْرِکْ بِیْ شَیْئاً" کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو، دیکھئے "شَیْئاً" میں بھی خدا کے ساتھ جو چیزیں شریک کی جاتی ہیں، وہ ہر صنف کی چیزیں ہیں، یعنی ان میں انسان بھی ہیں، جیسے ملوک ہیں، یا مقدس لوگ ہیں، ان میں حیوانات بھی ہیں، گائے بھی ہیں، ان میں جگہیں بھی ہیں (یہ جگہ جیسے اجودھیا کی بابری مسجد یہاں انہوں نے مسجد گرائی ہے) اسکے اندر تخیلات بھی ہیں اور اس کے اندر اعضائے انسانی بھی ہیں، ہم نے دیکھا ہے گجرات وغیرہ کے مندروں میں، کہ بعض اعضائے انسانی کی پرستش ہوتی ہے، تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

"شَیْــئــاً" میں جو تنکیر ہے، اس میں جو عمومیت ہے، وہ کسی چیز میں نہیں ہے، وہ لفظ آخری لفظ جس کا بالکل اطلاق ہے، اطلاق محض، وہ "شَیْءٌ" کا لفظ ہے، کہ "کسی چیز کو" اور یہ عالم الغیب ہی کہہ سکتا تھا، کہ مذاہب میں کتنے قسم کے معبود گڑھے گئے ہیں، کتنے قسم کے معبود مانے گئے ہیں اور ان کی کتنی اصناف ہیں اور ان کے کتنے طبقات ہیں اور ان کی کتنی صورتیں ہیں اور کن کن انواع سے متعلق ہیں، ایران کا یہ جوساسانی، یہ زردشت، ان کے یہاں آگ معبود تھی، اب وہ اگر کہا جاتا ایسا لفظ جو صرف انسانوں پر یا حیوانات پر صادق آتا ہے، تو آگ نکل جاتی، لیکن "شَیْــئــاً" میں وہ بھی آ رہی ہیں اور اسی طریقے سے کہیں بعض جانور ہے، بعض حشرات الارض ہیں، کہیں بعض دریا ہیں، اب یہاں دریا ہے، ہندوستان میں گنگا ہے، تو اگر ایسی چیز ہوتی جس میں دریا نہ آ سکتے تو کہتے کہ اس میں تو اس سے نہیں روکا گیا، دریا اس میں کہاں داخل ہے، لیکن "شَیْئاً" کے اندر سب آ گیا۔

تذکرہ موحد اکبر کا

اب یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے اور چونکہ ذکر ہے موحد اکبر کا، اس وقت جو دنیا کے (حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سارے مذاہب کی تاریخ میں اور ساری دنیا کے صنم پرستی کے) سب سے

(بڑے کا لفظ تو مناسب نہیں) جنگ کرنے والے تاریخ میں جن کا نام محفوظ رہ گیا ہے، وہ سیدنا ابراہیمؑ ہیں، جو آزر کے گھر پیدا ہوئے (آپ نے ان کا واقعہ بھی پڑھا ہوگا کہ) آگ ان کے لیے تیار کی گئی، اس میں ڈالے گئے، دنیا میں اصل میں صحیح تقسیم یہ دو چیزیں ہیں ''ابراہیمیت، برہمیت'' ایک طرف ابراہیمیت ہے، ایک طرف برہمیت ہے، یہ سب برہمیت ہے، ہندو مذہب ہو، یہاںتک کہ عیسائیت میں بھی برہمیت ہے کہ وہ برہما کے نام کے نہیں، لیکن اصل ایک انسان کی تقدیس، اس کو ابن اللہ ماننا، یہ برہمیت ہی کا امتیاز ہے، اس کی دعوت ہے۔

اللہ تعالیٰ موحد اکبر کا ذکر فرماتا ہے، کہ جب یہ مکان ہم نے اس مکان کو اس لیے تجویز کیا اور اس کو اس لیے آسان بنایا، ہر ایک کا پہنچنا وہاں ممکن ہوا، اب وہ تمام دنیا کا مرکز بنا کہ ''أَنْ لَا تُشْرِکْ بِیْ شَیْئًا'' میرے ساتھ کسی کو شریک مت کرو۔

''وَ طَهِّرْ بَيْتِيَ'' اور میرے گھر کو پاک کر دو اور پاک رکھو، ''لِلطَّائِفِيْنَ وَالْقَائِمِيْنَ'' طواف کرنے والوں کے لیے، قیام کرنے والوں کے لیے، جو وہاں نماز پڑھیں ''وَالرُّكَّعِ السُّجُوْد'' اور جو رکوع میں ہوں اور جو سجود میں ہوں، اس گھر کو اس کا مرکز بنایا گیا۔ یہاں پر ''طہارت'' میں دونوں چیزیں ہیں، کوئی گندگی نہ آنے پائے جس کا تعلق نجاستوں سے ہے، اجسام سے اور اجرام ہے اور کوئی غلط عقیدہ نہ آنے پائے، کسی غلط عقیدہ کی فرماں روائی نہ ہونے پائے، یہ سب گندگی میں شامل ہے۔

حج کے اہم مقاصد

میرے محدود علم و مطالعہ میں حج کے مقاصد و فوائد پر حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے جامع کسی نے نہیں لکھا، انہوں نے دو باتیں بڑی کام کی کہی ہیں، حج کی فرضیت اور حج کو دین کا رکن بنانے میں دو چیزیں بڑی بنیادی ہیں اور بڑی امتیازی ہیں اور اس کا عالمی فائدہ ہے، ایک تو یہ کہ ملت ابراہیمؑ سے اس امت کا تعلق باقی رہے، دین ابراہیمؑ سے ملت ابراہیمؑ سے اس کا تعلق قیامت تک باقی رہے اور یہ بڑی ضروری چیز ہے۔

ادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب اپنے مؤسس اول سے، داعی اول سے تعلق ٹوٹ گیا، تو اس کی روح نکل گئی، عیسائیت کا یہی معاملہ ہوا، یہ عیسائیت جس کا دنیا میں ڈنکا بج رہا ہے اور جو دنیا کے متمدن ترین اور ترقی یافتہ خطوں میں حکومت کر چکی ہے، بحیثیت مذہب کے بھی اور بحیثیت اپنے علمبرداروں کے بھی، اس عیسائیت کا یہ حال ہے کہ نصف صدی کی مدت کے اندر بھی، یہ اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہ سکی، اب کتابیں نکل رہی ہیں، ابھی حال ہی میں ERNEST DE BENSEN کی کتاب جس کا نام ہے ISLAM OR TRUE CHRISTIANITY شائع ہوئی ہے، اس میں صاف صاف لکھا ہے۔

''موجودہ عیسائیت کسی طرح بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کی ہوئی عیسائیت نہیں ہے، یہ وہ عیسائیت نہیں، جس کی دعوت اور اشاعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی تھی، یہ عیسائیت سینٹ پال کی بنائی ہوئی ہے''[1] تو موجودہ مسیحیت کو حضرت مسیحؑ سے کوئی تعلق ہی نہیں، یہ تو سینٹ پال کی وضع کی ہوئی ہے، ساری کی ساری یہ مسیحیت سینٹ پال کی ہے، اس میں ولدیت مسیح، ابنیت مسیح کا، صلیب مقدس کا عقیدہ جو ہے سب کچھ یہ ''سینٹ پال'' نے کیا تھا، وہ رومی تھا، رومی الاصل تھا اور اس کا ذہن مشرکانہ خیالات سے اور بت پرستی سے اور انسانی تقدیس سے پاک نہیں ہوا تھا، اس نے ایک سازش کی بہت بڑی، دنیا میں مذہبی سطح پر، انقلابی سطح پر کم سازشیں اتنی کامیاب ہوئی ہوں گی، جتنی سینٹ پال کی سازش کامیاب ہوئی، آج مسیحیت خالص سینٹ پال کی مسیحیت ہے۔

تو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک نکتہ تو یہ لکھا ہے کہ حج کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ یہ ملت حضرت ابراہیمؑ سے مربوط رہے، جو اس دین کے بانی ہیں، ''مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ'' جب قرآن کہتا ہے تو ہم کیا کہیں، وہ کہتا ہے کہ ''مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ، هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَ فِي هٰذَا'' تمہارا نام مسلم انہوں نے رکھا ہے اور یہ ملت ابراہیم ہے، پھر اس کے مجدد اور اس کے دنیا میں پھیلانے والے اور کامیاب بنانے والے، اس کی

(۱) 'ISLAM OR TRUE CRISTIANITY':P.128 بحوالہ خلفاء اربعہ: ص/۱۶۔

حفاظت کرنے والے، اس کی تفصیل دینے والے اور اس کو عملی بنانے والے، اس کو کامیاب کرنے والے، وہ تو رسول اللہ ﷺ ہیں، لیکن قرآن کہتا ہے، کہ حضرت ابراہیمؑ اس کے بانی ہیں، یعنی توحید کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں کے بعد سب سے بلند اور طاقت ور صدا حضرت ابراہیمؑ ہی نے بلند کی اور وہ ابھی تک سلسلہ چل رہا ہے، تو شاہ ولی اللہؒ صاحب کہتے ہیں، ایک تو بڑا مقصد یہ ہے کہ ملت ابراہیمی 'مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ" ملت ابراہیم کا، دین ابراہیمؑ سے تعلق باقی رہے اور حضرت ابراہیمؑ کی جگہ، حضرت ابراہیمؑ کے طریقۂ عبادت، حضرت ابراہیمؑ کا جذبۂ توحید، اعلاء توحید اور اللہ تبارک و تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اپنی حد تک حق ادا کرنے کے، جو انہوں نے طریقے اختیار کیے وہ محفوظ رہیں اور مسلمانوں کے سامنے آتے رہیں، اس لیے ایک تو مقصد یہ ہے کہ ملت ابراہیمؑ کا تعلق دین ابراہیمؑ سے باقی رہے، یہ جہاں بھی رہے، ہمیشہ حضرت ابراہیمؑ سے مربوط و وابستہ رہے، اسی میں اس ملت کے ابراہیمی و محمدی مزاج اور خمیر کی حفاظت اور ملتوں اور قوموں میں اس کا تشخص و امتیاز ہے، یہ وہیں ہو سکتا ہے، جس کو حضرت ابراہیمؑ نے منتخب کیا، اپنے دین کی اشاعت و تبلیغ کے لیے بھی اپنے خاندان کے لیے بھی اور اپنے قیام کے لیے بھی۔

دوسرا، انہوں نے لکھا ہے کہ دوسرا مقصد ہے، دین کو تحریف سے بچانا، کہ ایک کوئی ایسا موقع آئے کہ مسلمان دیکھ لے، مسلمانوں کی نماز اس طرح پڑھی جاتی ہے اور وہ دیکھے کہ ہر ملک کا مسلمان اس طرح نماز پڑھ رہا ہے، تو اگر ایسا نہ ہو تو ملک ملک، شہر شہر میں قسم قسم کی نمازیں شروع ہو جائیں، فرض کرو، ایک ملک میں نماز کا ایک طریقہ ہوا کہ نہیں بھائی پہلے بیٹھیں اور پھر بیٹھ کر کچھ کھڑے ہوں، رکوع، پھر قیام ہو، اس طرح پڑھیں، پہلے یہ پڑھیں اور یہ اضافہ کریں اور خبر بھی نہ ہو دوسرے شہر والوں کو اس شہر میں کیا ہو رہا ہے، ملک کا ذکر کیا دوسرے شہر والوں کو ایک مرتبہ بدعت پر کلام کیا کسی کتاب (ارکانِ اربعہ) میں، تو اس میں لکھا کہ بدعت اور سنت میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ بدعت لوکل (Local) ہوتی ہے، اور

سنت عالمی (Universal) ہوتی ہے، ایک بدعت ہندوستان کی ہے، کہ مغرب والوں کو، مراکش والوں کو، مصر والوں کو اور حجازیوں کو خبر نہیں ہوگی، کہ کونڈے کس طرح بھرے جاتے ہیں؟ اور تیجا کس طرح ہوتا ہے؟ اور چالیسواں کس طرح ہوتا ہے؟ بالکل امکان ہے کہ ہندوستان سے قریب تر ملک میں افغانستان میں بھی معلوم ہو اور اس لیے کہ کسی چیز کا تعلق پیسے سے ہے، کسی چیز کا تعلق دیوی سے ہے، کسی چیز کا تعلق پیرانِ کلیر سے ہے، کسی چیز کا بہت بڑا تعلق اجمیر شریف سے ہے تو بدعت "لوکل" ہوتی ہے۔ اور سنت، مشروع جو چیز ہے وہ بالکل عام ہوتی ہے، اس کا ایک ثبوت ہم بتاتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا، اگر ہندوستان کا آدمی شام چلا جاتا یا مراکش چلا جاتا، اس سے کہا جاتا کہ آج آپ جمعہ کی نماز پڑھائیے، تو اس کو ایک گائڈ بک (Guide book) کی ضرورت ہوتی، کہ ذرا پہلے یہ بتا دیجئے کہ یہاں جمعہ کی نماز کس طرح ہوتی ہے، کیا کیا پہلے کہنا پڑتا ہے، اور خطبہ کتنا طویل ہوتا ہے، کتنا نپا تلا ہوتا ہے اور اس سے پہلے کیا اذان دی جاتی ہے، اس سے پہلے کیا کہلوایا جاتا ہے؟ تو فرمایا شاہ ولی اللہ صاحب نے کہ اگر حج نہ ہوتا تو بہت سی بدعتیں (۱) ایسی رائج ہو جاتیں مسلمانوں کے اندر عالم اسلام کے مختلف حصوں اور ملکوں میں کہ دوسری جگہ خبر بھی نہ ہوتی اور صدیوں چلتیں وہ، جیسی بدعات چل رہی ہیں، یہاں کی بدعات کچھ ہیں اور مغرب کی بدعات کچھ ہیں، بزرگوں کے نام پر بھی اور اس کے علاوہ بھی طریقے مختلف ہیں کہ اس کے لیے ایک اچھی خاصی گائیڈ بک کی ضرورت ہے، بتایا جائے کہ یہ کام یوں کیا جاتا ہے، اس لیے کہ نہ قرآن میں ہے، نہ حدیث میں ہے۔

اور تیسری بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ حج جو ہے وہ دربار عام ہے، جس طرح ہر سلطنت میں، ہر بادشاہ کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ ایک دربار کرے، تا کہ لوگوں کا اخلاص

(۱) بدعت کسی اور چیز کو جس اللہ و رسول ﷺ نے دین شامل نہیں کیا ہے اور اس کا حکم نہیں دیا، شامل کرنا اور اس کا ایک جز بنا دینا، اس کو ثواب اور تقرب الی اللہ کے لیے کرنا اس کی کسی خود ساختہ یا اصطلاحی شکل اور وضع کیے شرائط و آداب کی اسی طرح پابندی کرنا جس طرح ایک شرعی کی جاتی ہے۔ بدعت ہے۔ (اسلام کے قلعے ۴۴۔۴۵)

معلوم ہو، وفاداری معلوم ہو اور لوگ اس کی طاقت کو، اس کے دائرۂ اثر کو دیکھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں اور سیکھیں، تو یہ حج کی تین چیزیں ہیں، شاہ ولی اللہؒ صاحب نے زور دیا ہے، ان الفاظ سے بھی تصدیق ہوتی ہے۔

''وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَ الْقَائِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْد'' ''میرے گھر کو پاک کردو، طواف کرنے والوں کے لیے قیام کرنے والوں کے لیے اور رکوع سجود کرنے والوں کے لیے'' پھر اس گھر میں کوئی شرک کا نشان باقی نہ رہے۔ (۱)

(۱) درسِ قرآن۔ سورۂ حج (آیت۔۲۶) غیر مطبوعہ کے علاوہ: ☆اپنے گھر سے بیت اللہ تک، ص: ۸۱-۸۳ ☆اسلام کے قلعہ: ۴۴-۴۵ ☆ خلفائے اربعہ کی تربیت، ص: ۱۶، سے اخذ واستفادہ کیا گیا ہے۔

حج جذبۂ عشق کی تسکین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

﴿وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ. لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَیَذْکُرُوْا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْهِ فِی أَیَّامٍ مَعْلُوْمَاتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِیْمَةِ الأَنْعَامِ. فَکُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِیْرَ. ثُمَّ لْیَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْیُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْیَطَّوَّفُوْا بِالْبَیْتِ الْعَتِیْقِ، ذٰلِکَ وَمَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰہِ فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ.﴾ (سورۂ حج: ۲۷-۲۹)

(''اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے فوائد کے لیے آموجود ہوں اور تاکہ ایام معلوم میں اللہ کا نام لیں ان چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو عطا کئے ہیں پس تم بھی اس میں سے کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ پھر لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو پورا کریں اور چاہیے کہ (اس) قدیم گھر (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں'')۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّ عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ" ''اور اعلان کردو لوگوں میں حج کا، لوگ آئیں گے، پیدل بھی آئیں گے، پیادہ پا بھی آئیں گے اور ہر دبلی اونٹنی یا لاغر جانور پر بھی آئیں گے، جو اتنا بڑا سفر اس پر نہیں کرنا

چاہتے، مجبور ہو کر آئیں گے، اپنے جذبے اور شوق میں آئیں گے"۔

"ضَامِرٌ" کا اسی لیے ذکر کیا کہ صرف وہی لوگ نہیں آئیں، جنکے پاس اچھی سواریاں ہیں، جن کے پاس وسائل و اسباب ہیں، بلکہ وہ بھی آئیں گے، جن کے پاس کم سے کم اسباب ہیں اور یہی ہو رہا ہے کہ کون کون وہاں پہنچتا ہے، اب تو خیر بہت سے مقاصد ہو گئے ہیں، تجارتی اور ملازمت کے، سونا لانے کے، زیور بنانے کے سب، لیکن پہلے جب حج ہی مقصود تھا، تو لوگ کس طرح گرتے پڑتے پہنچتے تھے، پیدل جاتے تھے اور بعض عمر بھر کا اندوختہ، پیسہ پیسہ، روپیہ روپیہ جمع کر کر کے اور دس برس کے بعد جاتے تھے، "وعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأتِيْنَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" یہ جانور جو آئیں گے ہر گہرے راستے سے۔

"كُلُّ فَجٍّ عَمِيْق" جب یہ کہنا ہو کہ ہر طرف سے آئیں گے، تو "كُل فَجٍّ عَمِيق" کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ حسب حال بھی ہے، یعنی یہ صرف عمومیت ہی کا فائدہ نہیں دیتا، بلکہ یہ واقعہ کی تصویر بھی ہے، کہ یہاں خیال بھی نہیں، ہم نے نام بھی نہیں سنا اس کا، ہم نے تم نے جغرافیہ دانوں نے نام بھی نہیں سنا ہوگا، اس کا کہ اچھا یہ بستی بھی ہے، یہ شہر بھی ہے، کہیں دنیا میں وہاں کا آدمی، اب وہاں جب مطاف میں بیٹھے ہوتے ہیں، نماز میں دیر ہوتی ہے، انتظار ہوتا، طواف کر چکے ہوتے ہیں (اللہ تعالیٰ تم کو بھی نصیب فرمائے، جاؤ دیکھو) تو پاس والا کوئی مغربی ہوتا ہے اور انڈونیشی ہوتا ہے اور ملیشیا کا ہوتا ہے، کوئی مغرب اقصیٰ کا ہوتا ہے، تو باتیں ہوتی ہیں، وقت ہے ابھی یا پڑھنا جو کچھ ہوتا ہے، پڑھتے رہتے ہیں، آپ کہاں کے ہیں (ایک تو کرسی والے تو جلدی نہیں بتاتے ہیں کہاں کے ہیں، یا اور کوئی بدنام شہر ہوتا اس کو نہیں بتائیں گے، آگرہ کو بھی کم بتاتے ہیں وہاں پاگل خانہ ہے) تو "يَاتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ" معلوم ہوتا ہے کہ یہ آج نازل ہو رہی ہے آیت۔

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی، تو "مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ" سے لوگ نہیں آتے تھے، نہ اسلام اتنا پھیلا تھا، نہ یہ وسائل تھے، لیکن اللہ نے چودہ سو برس پہلے وہ کہا کہ جو آج آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے، ایسی ایسی جگہ کا آدمی نظر آئیگا، کہ جغرافیہ کے نقشہ میں ہی نہیں ملے گا اس کا، بڑی دیر میں تم سمجھو گے کہ یہ کس برّ اعظم میں ہے، اس برّ اعظم کے کس حصہ

میں ہے، جنوبی افریقہ ہے، وہ بہت پھیلا ہوا ہے، اس میں بعض جگہ مسلمان بہت کم ہیں اور زبانیں بھی بہت مختلف ہے (جنوبی افریقہ کا ایسا نام لے گا کہ پتہ نہیں ہمارے دارالعلوم میں پڑھتے تھے بعض بعض لوگ جنوبی افریقہ کے کیپٹاؤن کے ہیں فلاں جگہ کے ہیں)

حج کے منافع اور اس کا اصل مقصد

"لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ" اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے "مَنَافِعَ" کو مطلق فرمایا ہے، اور اس کے لیے نکرہ کا صیغہ استعمال کیا ہے، اس بلیغ تعبیر منافع کی کثرت اور تنوع اور ہر دور میں اس کی بدلتی ہوئی قسموں راستوں، طریقوں اور پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے، جن کا شمار ناممکن ہے، "لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ" "تاکہ وہ اپنے منافع کا مشاہدہ کریں"

حج بلاشبہ ایک ایسا موسم اور ایسی تقریب ہے، جس میں پورے عالم اسلام بلکہ ساری دنیا کے مسلمان جمع ہوکر اس کے مختلف فوائد اور مادی نفع میں حصہ لے سکتے ہیں، وہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اہم مسائل پر مفید تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں، ایک دوسرے سے تعارف حاصل کر سکتے ہیں اور اپنے مشترک مفاد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع بھی ہو سکتے ہیں، لیکن حج کی یہی حکمت اور سب سے بڑی افادیت نہیں ہے، جیسا کہ بعض جدید اہل قلم کی تحریروں اور بیانوں سے اندازہ ہوتا ہے، وہ صرف ایک سیاسی کانفرنس بھی نہیں، جیسا کہ بہت سے معاصر اہلِ سیاست اور مسلمانوں کے رہنما اور زعماء اس کی یہی تصویر پیش کرنے کے عادی ہیں، اگر حج کا مقصد یہی ہوتا تو حج میں سکون کی ایک فضا ہوتی اور زیادہ تر ایک جگہ قیام ہوتا، تاکہ اس سے غور وفکر، مطالعہ وجائزہ، بحث ومباحثہ اور تبادلۂ خیال میں سہولت ہو، لیکن اس کے برعکس یہ ایک مستقل سفر اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنے کا ایسا سلسلہ ہے، جن میں ان چیزوں کا موقع ہی نہیں، اس کے علاوہ اول الذکر صورت میں حج کی یہ دعوت صرف علماء واہلِ فکر وتدبیر اور مسلمانوں کے طبقہ خواص تک محدود ہونی چاہیے، اس لیے کہ وہی لوگ اس طرح کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اس قسم کے متفرق منافع بلاشبہ حج کے ثمرات اور اس کی برکتوں میں سے ہیں، لیکن حج محض انہی مقاصد کی تکمیل کے

لیے نہیں ہے، وہ عامی و جاہل ہر قسم کے مسلمان پر فرض ہے، بشرطیکہ وہ استطاعت رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلاً. وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ" (سورۂ آل عمران: ۹۷) "اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا اللہ کے لیے اس مکان کا (یعنی) اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ سارے جہاں سے بے نیاز ہے"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جس کے پاس زاد راحلہ یعنی اتنا سامان سفر ہو، جو بیت اللہ تک پہنچا سکے، پھر بھی وہ حج نہ کرے تو وہ چاہے یہودی ہو کر مرے، یا نصرانی" اس کے علاوہ اگر حج صرف ان ہی چیزوں کے لیے ہوتا تو اس کی شکل ہی دوسری ہونی چاہیے تھی، اور اس کو ایسے دور ودراز "صحرائی" علاقہ میں نہ ہونا چاہیے تھا"

"مَنَافِعَ لَهُمْ" اس کا احصاء نہیں ہو سکتا، کوئی اس کو شمار نہیں کر سکتا، کہ اسی قسم کے منافع حج سے حاصل ہوتے ہیں، جو ان منافع سے بدرجہا زیادہ اور تخیل سے بالاتر، خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ منافع وہاں حاصل ہوتے ہیں، ان کا کوئی بھی احصاء نہیں کر سکتا، ایک سب سے بڑی منفعت تو توحید کی دولت ہے، پھر نماز پڑھنے کا طریقہ ہے اور خشوع ہے۔

اور وہ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہوتا ہے، اس دین کے ساتھ، ملت ابراہیمی کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، پھر اس کے بعد پھر تعارف ہوتا ہے، پھر ضرورتیں معلوم ہوتی ہیں، کس چیز میں کمی ہے؟ ہم کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں؟ وہاں مثلاً کس لیٹریچر کی ضرورت ہے؟ وہاں کیسے داعیوں کی ضرورت ہے؟ کیسے مدارس کی ضرورت ہے؟ وہاں اقتصادی حالت کیا ہے؟ ہم کیا مدد کر سکتے ہیں؟ یا ہم کیا نفع حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ سب "مَنَافِعَ لَهُمْ" میں آتا ہے، لیکن اس میں سرفہرست جو ہے، وہ دینی منافع ہیں، دینی اور شرعی منافع اس کے بعد پھر آپس کا تعارف اور اتحاد المسلمین، مسلمانوں کی ضرورتوں کا سمجھنا اور ان کے ساتھ ہمدردی اور ان کی مدد کا جذبہ یہ سب ہے۔

"لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُم" "منافع" اللہ تعالیٰ نے اس کی تخصیص نہیں کی، صدہا قسم

کے منافع ہو سکتے ہیں، اس میں ایک ضمنی منفعت یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے مسائل پر غور کیا جاسکتا ہے، اس کا انکار ہم نہیں کرتے، نفی نہیں کرتے، لیکن یہ اصل مقصد نہیں ہے، تشریعی مقصد نہیں ہے اس لیے حج فرض نہیں کیا گیا، "وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ" اور اصل چیز یہ ہے کہ اللہ کا نام لے، اللہ کو یاد کرے، "فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ" مقرر دنوں میں، حج کے جو تین دن چار دن ہیں اس میں خاص طور سے اللہ کا نام جتنا زیادہ سے زیادہ لے سکے۔

"عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الأَنْعَامِ" اور جوان کو قربانی کرنی ہے، جانور کی اس پر بھی اللہ کا نام لے، اس کے بغیر بھی اللہ کا نام لے، ان دنوں میں چوپایوں کی جو ہم نے ان کو موقع دیا ہے، ان کو میسر ہے، اور ان کی قربانی کریں اور اللہ کا نام لیں۔

فرماتا ہے" فَكُلُوا مِنْهَا وَ أَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ" ان میں سے تم بھی کھاؤ، اور ان میں سے محتاج، بے بس آدمی کو بھی کھلاؤ، جس کو گوشت میں بہت کم ملتا ہے، بہت سے ایسے لوگ ہیں جس کو ہفتوں گذر جاتے ہیں، گوشت کھانا نصیب نہیں ہوتا۔

حج کا محور

"ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ" پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، یعنی جو احرام باندھ رکھا تھا، بعض لوگوں نے آٹھ دن دس دن سے۔ (آپ کو معلوم ہے حج کی تین قسمیں ہیں، ایک تو وہ ہے کہ جس میں صرف عمرہ کا احرام باندھے اور عمرہ کر کے احرام کھول دے اور پھر حج کے موقع پر آٹھویں تاریخ کو دوبارہ احرام باندھ کر حج کرے یہ "تمتع" ہے۔ دوسرا حج "قران" ہے، جس میں عمرہ اور حج دونوں کا ایک ساتھ احرام باندھا جاتا ہے اور ایک احرام سے دونوں کو ادا کرنے کی نیت کی جاتی ہے اس کا احرام جب کھلتا ہے جب طوافِ زیارت کر لیا جاتا ہے اور تیسرا حج "افراد" ہے۔ "افراد" یہ ہے کہ تنہا حج کی نیت سے احرام باندھا ہے تو باندھا رہے اور طواف زیارت کر کے کھولے) تو یہ اس کے تین دن ہو سکتے ہیں، دس دن ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ قران کا احرام باندھا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ بیس

دن پہلے مدینہ طیبہ سے چلا ہو، اپنے میقات سے گذرا ہو، اسی وقت سے اس نے احرام باندھ لیا ہو، اب وہ احرام جب کھولے گا، جب حج کے مناسک ادا کرلے گا، تو اس میں میل کچیل سب چیزیں ہوسکتی ہیں، بال بھی نہیں بناتے تو "ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ" وہ اپنے میل کچیل دور کرے۔

"وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ" اور اپنی نذریں پوری کریں، جوانہوں نے دل میں ارادہ کئے تھے، کہ ہم اس طرح دعا کریں گے، ہم اس طرح روئیں گے، ہم اس طرح خشوع وخضوع کے ساتھ نماز پڑھیں گے، اور اللہ کا نام لیں گے، وہ سب نذریں پوری کریں، یہاں "نــــــذور" سے مراد وہ نذریں نہیں ہیں جو بزرگوں کے نام پر ہوتی ہیں، منتیں وغیرہ، "وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ" اور طواف کریں "البیت العتیق" کا، یہ جو گھر توحید کا سب سے پرانا مرکز ہے۔

"فطرت انسانی" فطرت انسانی ہی ہے، ایک ایسی چیز کی جستجو اور آرزو ہر بشر کی سرشت میں داخل ہے، جس کو وہ اپنی ان مادی آنکھوں سے دیکھ سکے، اس کے ذریعہ اپنے جذبۂ شوق کی تسکین کرسکے اور قرب ووصال اور تعظیم وتسلیم کے اس شدید تقاضے کی آسودگی کا سامان کرسکے، جو ہمیشہ سے اس کے خمیر میں ہے۔

اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی ظاہری اور محسوس چیزیں مقرر کی ہیں، جو اس کی ذات اقدس کے ساتھ کچھ خصوصیت رکھتی ہیں، اسی کی طرف منسوب ہیں، اسی کی کہلائی جاتی ہیں اور ان پر اس کی رحمت کی اس قدر تجلی اور عنایت کی ایسی نظر ہے کہ ان کو دیکھ کر ہی خدا یاد آتا ہے، اس کے علاوہ اس کے ساتھ بہت سے ایسے واقعات ومعاملات اور اعمال واحوال وابستہ ہیں، جو انسان کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں اور اس کے انعامات، اس کا دین توحید اور اس کے رسولوں کا جہاد اور صبر یاد دلاتے ہیں، ان چیزوں کا نام اس نے "شعائر اللہ" رکھا، ان کی تعظیم، اپنی تعظیم قرار دی اور ان میں کوتاہی اپنے حق میں کوتاہی کے مرادف بتایا اور انسانوں کو اس کی اجازت بلکہ دعوت دی کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی پوشیدہ ومستور محبت اور مشاہدہ وقرب کے فطری جذبہ کو تسکین دیں اور اپنی آسودگی کا سامان کریں" سارا حج

اصل میں اس عشق و بے خودی کے اظہار کا ذریعہ ہے جو انسان کے اندر فطری طور پر موجود اور شرعاً وعقلاً مطلوب ہے۔ "وَالَّذِينَ آمَنُوا اَشَدُّ حُباًلِلّٰهِ" (سورۃ البقرہ: ۱۶۵) (اور ایمان والوں کو تو اللہ ہی سے زیادہ محبت ہوتی ہے، "يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ" (سورۃ المائدہ: ۴-۵) اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

شعائر اللہ اور اس کی حرمت

ارشاد ہے ﴿ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَخَيرٌ لَه' عِنْدَ رَبِّه﴾ یہ ہوا (اور جو کوئی بھی اللہ کے محترم احکام کا ادب کرے گا اور اللہ کے حدود کی اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے قوانین کی تعظیم کرے گا اور اللہ تعالیٰ کی عزت کی جگہیں جو ہیں جیسے بیت اللہ ہے، مطاف ہے، مکہ معظّمہ خود ہے پورا، پھر منیٰ ہے، مزدلفہ ہے، عرفہ ہے، جو زیادہ اس کی تعظیم کرے گا) سو یہ اس کے حق میں اس کے پروردگار کے پاس بہتر ہوگا۔ یہ تعظیم جو ہے اس کو دینی طریقے پر بھی، تشریعی طریقے پر بھی اور نفسیاتی طریقے پر بھی بہت بڑا دخل ہے تعلق قائم کرنے میں، اس میں جب کوتاہی ہوتی ہے، تو بالکل فائدہ فوت ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو ایمان بھی چلا جاتا ہے، بے حرمتی سے، مثلاً کوئی مسجد میں کوئی بے حرمتی کا کام کرے، اس کا خطرہ ہے کہ ایمان نہ سلب ہو جائے اور بیت اللہ شریف، منیٰ، مطاف اور عرفات مناسک کی جگہیں ہیں حرمات اللہ ہیں، وہاں اگر کوئی بے ادبی کرے گا، تو اس کے لیے سلب ایمان کا خطرہ ہے، حرم میں معصیت (گناہ) یوں بھی سخت چیز ہے، لیکن بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ حرم میں ارادہ معصیت بھی معصیت میں شامل ہے، بخلاف دوسری چیز کے، وہ اس کے ثبوت میں یہ آیت پیش کرتے ہیں "وَمَنْ يُرِدْفِيهِ بِالْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيمٍ" (سورۂ حج: ۲۵) اور جو کوئی بھی اس کے اندر کسی بے دینی کا ارادہ ظلم سے کرے گا ہم اسے دردناک عذاب چکھائیں گے۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ حرم کی خصوصیت ہے کہ یہاں پر ظلم کا ارادہ کرنے والا بھی قابل مواخذہ اور لائقِ عتاب ہیں خواہ وہ اس کو عملی جامہ پہنا سکے یا نہیں"۔

اس لیے اس رکن عظیم کی عظمت و جلال اور اپنی ذمہ داری اور فرضِ منصبی کا استحضار اور احساس حاجی کے اندر پوری قوت کے ساتھ پیدا ہونا چاہیے، اور وہ اپنی تمام نقل وحرکت اور قیام و سفر میں ذکی الحس، حاضر دماغ اور بیدار، ہوشیار رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس روحانی فضائے غافل اور بے پروانہ ہو، جو اس کے گردوپیش میں محیط ہوتی ہے۔ تعظیم کو بشر طیکہ وہ حدود میں ہو اور اس میں شرک کا کوئی شائبہ نہ ہو اور توحید سے کسی طرح معارض نہ ہو، اس میں بہت بڑی تاثیر ہے، تعلق پیدا کرنے میں اور روحانی ترقی دینے میں۔[1]

(۱) درس قرآن سورۂ حج: ۲۷-۲۹ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ ☆ارکان اربعہ (ص:۲۸۸) ☆تحفۂ پھٹکل (ص:۷۱-۷۲) سے اخذ واستفادہ کیا گیا ہے۔

حج میں اسلام کا اصلاحی کردار (۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم

﴿وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ☆ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ☆ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ☆ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ☆ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ﴾ (الحج: ۲۹-۳۳)

(”اور تمہارے لیے مویشی حلال کر دیے ہیں سوائے ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، تو بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو، صرف ایک خدا کے ہوکر اور اس کے ساتھ شریک نہ ٹھیرا کر اور جو شخص (کسی کو) خدا کے ساتھ شریک مقرر کرے، تو وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے، پھر اس کو پرندے اُچک لے جائیں، یا ہوا کسی دور جگہ اُڑا کر پھینک دے، (یہ ہمارا حکم ہے) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے، تو یہ (فعل) دلوں کی پرہیز گاری میں سے ہے، ان میں ایک وقت مقرر تک تمہارے لیے فائدے ہیں، پھر ان کو خانۂ قدیم (یعنی بیت اللہ) تک پہنچنا (اور ذبح ہونا) ہے“)

بت پرستی کے ساتھ نجاست کا ذکر

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے "وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلَى عَلَيْكُم" اورتمہارے لیے چوپائے حلال کردئے گئے، سوائے ان کے جنکی تلاوت تمہارے اوپر کی جاتی ہے، یعنی سورنہیں ہیں، جوحرام ہیں، اورحلال نہ کئے گئے، "فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الأَوْثَانِ" بچوتم گندگی سے بتوں کی، "وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ" اورجھوٹ بولنے سے بچو۔

قرآن مجید کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ بت پرستی کے ساتھ نجاست کا ذکر کرتے ہوئے، "قَوْلَ الزُّوْرِ" (جھوٹی بات) کا بھی ذکر کیا۔ اور یہ مذاہب کی تاریخ کا ایک فیصلہ ہے، ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بت پرستی کے ساتھ غلط بیانی اور افسانہ سازی اور افتراء یہ ہمیشہ چلتا آرہاہے، جتنے بت پرستی کے مذاہب ہیں، سب میں افسانے کہ انہوں نے یہ کردیا تھا، انہوں نے یہ کردیا تھا، جب ہی سے ان کی تعظیم، ان کے مزاروں پر چادر چڑھانا، (ابھی دیوی کا ذکرآیا تھا قومی آواز میں کہ یہاں میرے بزرگ ہیں ایک مسلمان خاتون نے کہا تھا، یہاں وہ بزرگ ہیں جو وہ چاہتے ہیں دے دیتے ہیں، سب کی مرادیں یہاں ملتی ہیں اور جلسہ تھا ہندو مسلم اتحاد کا) اسی طرح یہ عیسائیت کی تاریخ پڑھیں گے آپ تو اس کا سرچشمہ نبوت ہے، لیکن جو دوسری تاریخ ہے بودھ مذہب کی تاریخ ہے، جینی مذہب کی تاریخ پڑھیں گے اور اس کے علاوہ درجنوں مذہب، بلکہ درجنوں سے زیادہ مذاہب ہیں، سب کے ساتھ شروع سے "قَوْلَ الزُّوْر" چلے گا کہ وہ کہانیاں ان کے ساتھ چلی آرہی ہیں کہ انہوں نے یہ کردیا، انہوں نے یہ کردیا اور الٹ پلٹ کردیا، رات کودن کردیا اور دن کو رات کردیا اور جوجس کو کھانے کو نہیں ملتا تھا، اس کو بادشاہ بنادیا، راجہ بنادیا اور جو راجہ تھا اس کو تخت سے اتاردیا، یہ سارے قصے، یہ سب بت پرستی کے مشرکانہ ادیان و مذاہب کا لازمہ ہیں اور یہ معجزہ ہے قرآن مجید کا، اتنے ہی ہوسکتا تھا۔

"فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الأَوْثَانِ" کہ ان بتوں کی گندگی سے بچو، لیکن "وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْر" (اورجھوٹ بولنے سے بچو) اور یہ ہم نے پڑھا ایک انگریزی کتاب میں کہ

اکثر شرائنس اور مقدس جگہیں جو عیسائیوں کی ہیں کہ یہاں فلاں دفن ہے، یہاں فلاں اور لوگ سفر کر کے وہاں جاتے ہیں، ان میں سے اکثر جعلی ہیں، اس نے لکھا ہے کہ اکثر لوگوں نے بنا لیے ہیں، وہاں نہ حضرت عیسیٰ کا کوئی نشان ہے اور نہ وہ جس کو ولی سمجھ کر وہاں جاتے ہیں اور ہندوستان میں ہی کتنے مزارات ہیں، جن کی کوئی اصل نسل نہیں، کہدیا کہ یہ فلاں کا مزار ہے، یہ فلاں کا مزار ہے اور وہ بالکل جعلی اور نقلی ہیں، جو لوگ جاننے والے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے سامنے بنا تھا۔

درگاہوں اور قبروں کا فتنہ

"ان سب چیزوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اس سلسلہ کو شدت کے ساتھ بند کرنے کا راز یہی ہے، آپ کو اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ عادت توحید کے علمبرداروں اور دنیا کی اس آخری امت میں بھی سرایت نہ کر جائے، جس پر قیامت تک پوری انسانیت کی ذمہ داری ہے، آپ نے اپنی آخری آرام گاہ کو بھی ہر قسم کے شرک و بدعت اور غلو سے پاک رکھنے کا حکم دیا، اپنے مرض وفات میں آپ کو سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے:۔ "لَمَّا نَزَلَ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ طَفِقَ يَطْرَحُ خَمِيْصَةً لَهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَإِذَا اغْتَمَّ بِهَا كَشَفَهَا عَنْ وَجْهِهٖ فَقَالَ. وَهُوَ كَذٰلِكَ، لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ يُحَذِّرُ مَا صَنَعُوْا" جب آپ بیمار ہوئے تو اکثر چادر مبارک کو چہرے پر ڈال لیتے اور جب گھبرانے لگتے، تو چہرے سے ہٹا دیتے، آپ نے اس حال میں فرمایا اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا دیا، آپ امت کو ان کے اعمال سے ڈرا رہے تھے۔

آپ سے یہ حدیث بھی ثابت ہے کہ "اے میری قبر کو بت نہ بنا، جس کی پوجا ہونے لگے، اللہ تعالیٰ کا ان لوگوں پر سخت غصہ ہے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنا دیا"

رسول اللہ ﷺ نے مقابر اور آستانوں کی زیارت کے لیے باقاعدہ سفر کرنا اور اہتمام

تیاری اور نیت کے ساتھ متبرک مقامات اور درگاہوں میں حاضری ممنوع قرار دی ہے، مشہور حدیث ہے کہ "لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ، اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامِ وَ مَسْجِدَ الرَّسُوْلِ وَ الْمَسْجِدُ الْاَقْصٰی" "اہتمام و ارادہ کے ساتھ با قاعدہ سفر صرف تین مساجد کے لیے جائز ہے، مسجد حرام، مسجد الرسول اور مسجد اقصیٰ"

آپ نے اس ذریعہ سے اس امت کو درگاہوں اور قبروں کے اس فتنہ سے محفوظ رکھا، جس نے ان کو کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا کر دیا تھا۔

لیکن مسلمانوں کی بہت سی جماعتوں نے آپ کی اس اہم وصیت پر پوری طرح عمل نہیں کیا، جس کو آپؐ نے اپنے مرض وفات میں بھی فراموش نہ فرمایا تھا، وہ بھی ان درگاہوں، آستانوں اور مزاروں کے فتنہ میں پڑ گئیں، لوگ بہت دور دور سے اور بڑی مشقتیں برداشت کر کے ان مزارات پر جانے لگے، ان قبروں کے سامنے تعظیماً جھکنے لگے، منتیں ماننے اور مرادیں مانگنے لگے اور ان مزاروں کے ساتھ اس قدر شیفتگی اور تعظیم کا مظاہرہ کرنا شروع کیا، جو یہود و نصاریٰ کا شعار تھا اور آپ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوگئی کہ "تم اپنے پہلے لوگوں کی پوری پوری اتباع کرو گے، وہ ایک بالشت چلیں گے تو تم بھی ایک بالشت چلو گے وہ ایک ہاتھ چلیں گے تو تم بھی ایک ہی ہاتھ چلو گے"۔

ان مزاروں اور آستانوں نے (جن میں بہت سے جعلی اور نقلی بھی تھے) نہ صرف مسجدوں کا حق غصب کیا، بلکہ بعض اوقات انہوں نے مسجد حرام اور بیت اللہ کی جگہ لینے کی کوشش کی، بہت سے جاہلوں نے ان مزاروں اور درگاہوں کو خانۂ کعبہ کی طرح اہم اور مقدس سمجھ لیا، دور دور سے کھنچ کر وہاں جمع ہونے لگے، ان کا عرس ہونے لگا اور ایک میلہ سا لگ گیا۔

قرآن مجید کا اعجاز

یہ میلے دیوی دیوتاؤں کے واقعات اور میتھالوجی اور علم الاصنام کے ساتھ ملوث ہیں، ان کو دیکھ کر قرآن مجید کا اعجاز نظر آتا ہے، کہ اس نے تعمیر بیت اللہ کے وقت سب سے پہلے شرک باللہ اور افسانوی روایات پر کاری ضرب لگائی ہے، جس سے دوسری قوموں کے حج و

زیارت کے اعمال ورسوم پوری طرح آلودہ ہیں اور قرآن نے ''بت پرستی'' کو ''شرک اکبر، گندگی'' اور ''جھوٹی بات'' کا نام دیا ہے اور بہت زوروں سے اس کے معائب بیان کئے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے " ذٰلِکَ وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ عِنْدَ رَبِّهٖ. وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ " " یہ بات ہو چکی اور جو کوئی بھی اللہ کے محترم احکام کا ادب کرے گا سو یہ اس کے حق میں اس کے پروردگار کے پاس بہتر ہوگا اور اللہ نے حلال کر دیے ہیں تمہارے لیے چوپائے بجز ان کے کہ جو تم کو پڑھ کر سنا دیے گئے، سو تم بچے رہو بتوں کی گندگی سے اور بچے رہو جھوٹی بات سے"[1]

''حُنَفَاءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ'' یکسو ہو کر اللہ کے لیے اس کے ساتھ بالکل شرک کے شائبہ سے پاک۔

ازل سے تا امروز

''وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ'' اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک کرے گا، تو ایسا ہے کہ کوئی آسمان سے گرا دیا جائے، آسمان سے گرے ''فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ'' جب اوپر سے آرہا ہے، آسمان سے تو کیا ہوگا، یا تو چڑیاں اچک لے جائیں گی، یا ہوا اس کو اڑا لے جائیگی، کہیں بہت دور جگہ، اس لیے کہ جب آدمی فضا میں ہوتا ہے، تو کوئی وزن نہیں ہوتا تو ہوا بھی اس کو اڑا سکتی ہے اور چڑیا بھی پکڑ سکتی ہے، کوئی بہت بڑی چڑیا بھی ایسی ہو سکتی ہے ''اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ'' ''یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے''۔

'' یہی بت پرستی اور شرک (یعنی خدا کے علاوہ دوسروں کو معبود بنانا اور ان کے سامنے انتہائی ذلت ومسکنت کا اظہار، ان کے سامنے سجدہ ریزی، ان سے دعا ومدد کی طلب اور ان کے لیے نذر و نیاز) عالمگیر طویل العمر اور سخت جان ''جاہلیت'' ہے، جو کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں اور یہی نوع انسانی کا قدیم ترین ومہلک ترین مرض ہے، جو تاریخ انسانی کے تمام ادوار، تمدّن، معاشرت، معیشت وسیاست کے تمام تغیرات اور انقلابات کے باوجود

(۱) ارکان اربعہ: ۳۴۷-۳۵۱

بھی نوعِ انسانی کے پیچھے لگا رہتا ہے، اللہ کی غیرت اور اس کے غضب کو بھڑکاتا ہے، بندوں کی روحانی، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی راہ کا روڑا بنتا ہے اور ان کو انسانیت کے بلند درجے سے گرا کر پستی کے عمیق و مہیب غاروں میں اوندھے منہ ڈال دیتا ہے''۔(۱)

شعائر اللہ کا احترام

''ذٰلِکَ وَمَنْ یُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْب'' یہ بات ہے اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا، یہ قلوب کا تقویٰ ہے، جب قلب میں تقویٰ ہوتا ہے، خدا کا ڈر ہوتا ہے، خدا کی عظمت بیٹھی ہوتی ہے ''تقویٰ'' کے معنی ڈر ہی کے نہیں ہیں، بلکہ احتیاط اور استحضار اور ادب یہ سب چیزیں ''تقویٰ'' میں جب دلوں میں ''تقویٰ'' ہوگا، تو اللہ سے نسبت رکھنے والی، اللہ کی طرف جو چیزیں منسوب کی جاتی ہیں، یہ اللہ کی چیز ہے، سب کی تعظیم آدمی خود بخود کرنے لگتا ہے، اگر دلوں میں تقویٰ ہے اور اسی لیے ہمارے نظامِ تعلیم میں کتاب کی تعظیم، استاذ کی تعظیم اور ایسے اچھے متبرک مقامات کی تعظیم اور قبلے کی طرف پاؤں کر کے نہ بیٹھو، بہت سے ملکوں کے لوگوں کو دیکھا کہ بالکل قریب ہیں، بیت اللہ شریف کے اور پاؤں اس طرف کئے ہوئے ہیں اور جوتے وہاں رکھے گئے ہیں، تعلیم نہیں دی گئی، وہ آ گئے تو ان کے اندر وہ ادب نہیں ہے، جو ہونا چاہیے۔

یہ جو کچھ آپ شریعت کو دیکھتے ہیں، یہ سب احترام کی باتیں ہیں، کرنا کرانا تو بعد کا مرحلہ ہے اور ضروری ہے، لیکن پہلا مرحلہ احترام کا معاملہ ہے۔ اللہ اور رسول کو اللہ و رسول سے نسبت رکھنے والی چیزوں کو کس نظر سے دیکھا جائے، یہی حقیقت ہے شعائر اللہ کی۔

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے ''وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبُ'' تو تعظیمِ شعائر اللہ، دلیل ہے قلوب میں تقویٰ کی، قلب میں کوئی چیز نہیں اور کون کیا چیز ہے، سوائے اللہ کے رسول کے اور اللہ کے رسول کے صحابہ کے اور کبار اولیاء اللہ کے سب برابر ہیں، ایک طرح کے لوگ ہیں، لیکن سارا انحصار جو ہے وہ نظر پر ہے، طریقۂ فکر پر ہے، نقطۂ نظر پر ہے اور ذہنی کیفیت پر ہے، ''وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ'' میں ذہنی کیفیت کو

(۱) دستورِ حیات: ۸۲

بیان کیا گیا ہے، ایک بزرگ کو بہت بڑے مدارج عالیہ ملے، مجھے اس وقت ان کا نام یاد نہیں، فضیل بن عیاض یا جنید بغدادی کا نام یاد آتا ہے، کسی نے پوچھا کہ حضرت اتنا بڑا درجہ اللہ نے نصیب فرمایا، کیابات ہے، کہنے لگے بات تو اتنی ہے کہ میں چلا جارہا تھا ایک جگہ میں نے ایک کاغذ پڑا دیکھا، اس پر اللہ کا نام لکھا تھا، میں نے اٹھایا، آنکھوں سے لگایا اس کو ایک جگہ عزت کے ساتھ کسی دیوار وغیرہ میں حفاظت سے رکھ دیا، اللہ کو یہ ادا پسند آئی اور اللہ نے مجھے یہ مرتبہ عطا کیا۔

اصل میں تعظیم جو ہے، محبت ووقعت کا اس پر انحصار ہے، اس کی دلیل ہے، یہی علم کا حال ہے، تو سارا معاملہ عزت واحترام کا ہے، سب وہیں سے ہوتا ہے، وہیں سے ملتا ہے، جس کو ملتا ہے، لیکن جو قلبی کیفیت ہے، وہ بڑی چیز ہے''۔ (۱)

یادرکھو! قرآن مجید کا ادب کرنا یہاںتک کہ ہمارے اساتذہ بتاتے تھے کہ کتاب کا ادب کرنا، تو یہ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ کہ جو اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم کرے گا، یہ دلوں کا تقویٰ ہے، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حدود کی اور اس کی طرف منسوب جو چیزیں ہیں، اس سے خاص نسبت رکھنے والی چیزوں میں سے مطاف ہے، کعبہ ہے اور عرفہ ہے، مقام ابراہیم ہے، '' فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِنْدَ رَبِّهِ '' اس کے رب کے یہاں اس کے لیے بہتر ہے، یعنی اس کو ثواب دلوائیگا اور اس کا مرتبہ بڑھائیگا اور پھر اس کا وہاں اجر پائے گا۔

''وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ اِلىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى'' تمہارے لیے بہت سے منافع ہیں ایک مقرر مدت تک، کئی طرح کے منافع، خشوع پیدا ہوگا، علم بڑھے گا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھے گا، سنت کا شوق پیدا ہوگا، دین کی معرفت پیدا ہوگی، ''ثُمَّ مَحِلُّهَا اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ'' پھر اس کے بعد اس سب کی جو آخری جگہ ہے وہ ''البیت العتیق'' ہے، وہ طواف زیارت جو ہوگا، اس پر حج ختم ہوگا اور احرام پھر اتر جائے گا۔ (۲)

(۱) تحفۂ بھٹکل ۷۱-۷۲ (۲) درس قرآن، سورۂ حج: ۲۹-۳۳، غیر مطبوعہ کے علاوہ مندرجہ کتب سے اخذ واستفادہ کیا گیا ہے: ☆ ارکان اربعہ: ۳۴۷-۳۵۱ ☆ دستور حیات: ۸۲ ☆ تحفۂ بھٹکل: ۷۱-۷۲

حج میں اسلام کا اصلاحی کردار (۲)

﴿اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ. فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِيْ الْحَجِّ. وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ. وَتَزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى. وَاتَّقُوْنِ يَا أُوْلِيْ الْأَلْبَابِ. لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ. فَإِذَا أَفَضْتُمْ فِيْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدَاكُمْ. وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الظَّالِمِيْنَ. ثُمَّ أَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ. وَاسْتَغْفِرُوْا اللّٰهَ. إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوْا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَائَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْراً﴾ (سورۂ بقرہ: ۱۹۷-۲۰۰)

(''ترجمہ:۔ اہم حج کے (چند) مہینے معلوم ہیں، جو کوئی ان میں اپنے اوپر حج مقرر کرے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا اور جو کوئی بھی نیک کام کرو گے، اللہ کو اس کا علم ہو کر رہے گا اور زادِ راہ لے لیا کرو اور بہترین زادِ راہ تو تقویٰ ہے، سوائے اہل فہم! میرا ہی تقویٰ اختیار کیے رہو) تمہیں اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش معاش کرو، پھر جب تم جوق در جوق عرفات سے واپس ہونے لگو تو اللہ کا ذکر مشعر حرام کے پاس کر لیا کرو اور اس کا ذکر اس طرح کرو جیسا اس نے تمہیں

بتایا ہے اور اس سے قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے، ہاں تو تم وہاں جا کر
واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک
اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر رہے ہو، تو اللہ کو یاد
کرو، اپنے باپ داداؤں کی یاد کی طرح، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہو.........''!

شریعت کے حکیمانہ انتظامات

حج اپنے سارے ارکان واعمال اور مناسک وعبادات کے ساتھ اطاعت محض، مجرد امتثال، بے چون وچرا حکم بجالانے اور ہر مطالبہ کے آگے سر جھکا دینے کا نام ہے۔

حج کا سفر اکثر اوقات ایک طویل سفر ہوتا ہے.... اس میں انسان کو مختلف حالات پیش آتے ہیں، مختلف لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، نئے نئے لوگوں کی طویل عرصہ تک صحبت ورفاقت رہتی ہے، طرح طرح کے معاملات سامنے آتے ہیں اور یہ سب چیزیں بہت سے ممنوعات، غلط قسم کی ترغیبات اور ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش اور لڑائی جھگڑے کی حد تک پہنچا سکتی ہیں، حاجی اس سفر میں بہت سی چیزوں سے تنگ دل ہوتا ہے، بعض اوقات کسی ناگوار بات سے اس کی طبیعت میں سخت اشتعال پیدا ہوتا ہے اور اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا ہے اور اس کے نتیجہ میں بعض اوقات اس سے ایسی باتیں سرزد ہوجاتی ہیں، جن کو وہ اپنے وطن اور اپنے گھر میں بھی برا سمجھتا تھا اور حتیٰ الامکان ان سے بچتا تھا، وہ بعض ایسی معصیتوں اور اخلاق قبیحہ میں گرفتار ہوجاتا ہے، جو حج کی روح اور مقاصد کے یکسر منافی ہیں، حج میں ان چیزوں کی ممانعت خاص طور پر اسی لیے آئی ہے، کہ اس میں اس کا احتمال اور بڑھ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَلْحَجُّ أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ. فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوْقَ وَلاَجِدَالَ فِي الْحَجِّ. وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ" "اہم حج کے (چند) مہینے معلوم ہیں، جو کوئی ان میں اپنے اوپر حج مقرر کرے، تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور جھگڑا اور جو کوئی بھی نیک کام کروگے، اللہ کو اس کا علم ہو کر رہے گا"۔

ان قوانین، احکام اور تعلیمات نے (جن کا تعلق قلب و جوارح، نیت و عمل اور زمان و مکان سے براہِ راست) حج کو تقدس و طہارت، تورع و زہد، مراقبہ و حضور، محاسبۂ نفس اور مجاہدہ و جہاد کی ایک ایسی خلعت عطا کی ہے، جو دوسرے مذہبوں اور ملتوں کے اس قسم کے اعمال میں ہرگز نہیں ملتی، ان کی وجہ سے نفسِ انسانی اخلاقِ عامہ اور نظامِ زندگی پر جو اثرات پڑتے ہیں، اس کو دیکھ کر حضور ﷺ کی اس حدیث قدسی کی تصدیق ہوتی ہے "مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ" [1] "جس نے خالص اللہ کے لیے حج کیا اور پھر دورانِ حج نہ بری بات زبان سے نکالی، نہ فسق و فجور اختیار کیا، تو (وہ پاک ہو کر) ایسا ہو کر لوٹا جیسا کہ اس کی ماں نے اسے جنا تھا"۔

حج نے مرورِ زمانہ کی وجہ سے اپنا تقدس، پاکیزگی اور سادگی و صفائی بڑی حد تک کھو دی تھی اور جاہلیت کے میلوں کی طرح ایک میلہ بن کر رہ گیا تھا، جس میں ہر طرح کی تفریح، کھیل تماشے اور لڑائی جھگڑے ہونے لگتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس کی مذمت فرمائی اور ارشاد ہوا "فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوْقَ وَلاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ" "تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا" ابن کثیر کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن وہب نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں مالک نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول "وَلاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ" یہ تھا کہ قریش مزدلفہ میں مشعر حرام کے پاس قیام کرتے تھے اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے تھے، ایک گروہ کہتا تھا ہم حق پر ہیں، دوسرا کہتا تھا ہم حق پر ہیں، ہمارے خیال میں یہی بات تھی، باقی صحیح علم اللہ کو ہے، محمد بن کعبؒ کہتے ہیں کہ "قریش جب منیٰ میں جمع ہوتے تھے تو ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ ہمارا حج تم سے زیادہ مکمل ہوا ہے، دوسرے لوگ بھی اسی طرح جواب دیتے تھے"۔

بہترین زادِ راہ

آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَتَزَوَّدُوْا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى" "اور زادِ راہ لے

(۱) بخاری و مسلم

لیا کرو اور بہترین زادِراہ تو تقویٰ ہے" ایک رواج تھا کہ بعض لوگ حج کے لیے زادِ سفر کا انتظام کرنا اور اپنے ساتھ سامان لے جانا گناہ سمجھتے تھے، وہ توکل کا مظاہرہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم اللہ کے مہمان ہیں، اس لیے ہم کو زادِ سفر وراحلہ کی کیا ضرورت؟ البتہ سوال کرنے اور بھیک مانگ کر اپنی ضرورت پوری کرنے میں ان کو کوئی عار نہ ہوتا تھا، بلکہ اس کو وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کا ایک مجاہدہ سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرمایا اور ارشاد ہوا "وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى" "اور زادِراہ لے لیا کرو بہترین زادِراہ تو تقویٰ ہے"

ابنِ کثیر عوفی سے روایت کرتے ہیں، وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "کچھ لوگ اپنے گھر سے اس حالت میں نکلتے کہ ان کے ساتھ کچھ بھی نہ ہوتا اور یہ کہتے کہ ہم بیت اللہ کا حج کرتے ہیں، کیا للہ ہمیں نہ کھلائے گا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، (وَتَزَوَّدُوْا) یعنی اتنا ضرور اپنے ساتھ رکھو، جس سے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔

بخاری میں ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "اہل یمن حج کے لیے جاتے تھے تو اپنے ساتھ زادِ سفر نہ لیتے تھے اور کہتے تھے ہم متوکلین میں سے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی "وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى"

" وَاتَّقُوْنِ يَا اُولِي الْاَلْبَابِ" "سوائے اہلِ فہم میرا ہی تقویٰ اختیار کیے رہو"

"وَاتَّقُوْنِ" .... چونکہ اردو میں جو الفاظ مشترک ہیں ان سے ایک خاص مفہوم بن جاتا ہے....، قاعدہ ہے کہ جب دو زبانوں میں کوئی لفظ مشترک ہو جاتا ہے تو جس زبان کی طرف وہ لفظ آیا ہے، اس زبان کے اثرات پڑتے ہیں، تو جب "تقویٰ" کا لفظ آتا ہے تو ہمارے ذہن میں آتا ہے "زیادہ تہجد گزار" "مشتبہ مال سے بچنے والا..." لیکن عربی میں "اِتِّقَاء" اور "تقویٰ" کے معنی ہیں بچ کر، احتیاط سے کام کرنا اور بچنا اور "پرہیز گار" کا جو لوگ ترجمہ کرتے ہیں وہ اچھا ترجمہ ہے،......تو "اِتَّقُوْن" کے خالی یہ معنی نہیں کہ "ڈرو مجھ سے" ورنہ آدمی کی چیخ نکل جائے، ڈر سے رونے لگے اور گھبرائے "اتَّقُوْا" "اِتِّقَاء" میں خوف بھی ہے اور عمل بھی ہے، یعنی "لحاظ کرو" اور اس کی عظمت، اس کے حقوق، اس کے تقاضے اور اس کے مقام کے لحاظ سے جو زندگی اختیار کرنی چاہیے، وہ زندگی اختیار کرو، یعنی احتیاط اور اس کی

پابندی اور اس کا پاس و لحاظ، اس "لحاظ" میں اکثر چیزیں آجاتی ہیں" اور "اتقاء" کے اندر صرف عقیدہ اور ذہنی کیفیت ہی نہیں آتی بلکہ اس میں عمل اور تبدیلی بھی آجاتی ہے۔

"لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِنْ رَّبِّكُمْ" "تمہیں اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش کرو معاش"

اہل جاہلیت اس موسم میں تجارت کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے اور ایک حلال چیز کو حرام سمجھ بیٹھے تھے، بخاری میں ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ "عکاظ، ذوالمجنۃ اور ذوالمجاز، جاہلیت کے مشہور بازار تھے، لیکن حج کے موسم میں تجارت جرم تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

مجاہد ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "اہل عرب حج کے ایام میں بیع و شراء اور تجارت و کاروبار سے پرہیز کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ذکرِ الٰہی کے دن ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی" لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّكُمْ"

" فَإِذَا أَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ. وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدَاكُمْ. وَإِنْ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّيْنَ" "پھر جب تم جوق در جوق عرفات سے واپس ہونے لگو تو اللہ کا ذکر مشعر حرام کے پاس کر لیا کرو اور اس کا ذکر اس طرح کرو جیسا اس نے تمہیں بتایا ہے اور اس سے قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے"۔

آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" ثُمَّ أَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ. إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" "ہاں تو تم وہاں جا کر واپس آؤ، جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں اور اللہ سے مغفرت طلب کرو، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے"۔

زمانۂ جاہلیت میں قریش حاجیوں کے ساتھ عرفات نہیں جاتے تھے، بلکہ حرم ہی میں رُکے رہتے تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم اہل اللہ میں سے ہیں اور بیت اللہ کے محافظ و مجاور ہیں، ان کا منشا یہ تھا کہ وہ بقیہ لوگوں سے ممتاز رہیں، اپنی پوزیشن اور حیثیت اور جو امتیاز و فوقیت ان کے خیال میں ان کو حاصل تھی، اس کو برقرار رکھ سکیں، اللہ تعالیٰ نے اس جاہلی اور نسلی امتیاز کو ختم کیا اور ان کو حکم دیا کہ جس طرح اور لوگ کرتے ہیں، وہی وہ بھی کریں اور عرفات میں قیام کریں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" ثُمَّ أَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ" "ہاں تو تم وہاں

جا کر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں"

امام بخاریؒ اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ "قریش اور وہ لوگ جو ان کے طریقہ پر مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور ان کو "حمس" کہا جاتا تھا، بقیہ سب عرب عرفات میں قیام کرتے تھے جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ عرفات جائیں اور وہاں قیام بھی کریں، پھر سب کے ساتھ وہاں سے واپس ہوں اور یہی اللہ تعالیٰ کا قول ہے "مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ" ابن کثیر، ابن عباس، مجاہد، عطاء، قتادہ، سدی اور دوسرے اکابر کا یہی خیال ہے، ابن جریر سے بھی یہی مروی ہے اور سب کا اس پر اجماع ہے۔

عہد جاہلیت میں حج کا موسم ایک دوسرے پر فخر کرنے اور مناظرہ ومقابلہ کا اسٹیج بن گیا تھا، جس طرح "عکاظ، ذوالمجنۃ اور ذوالمجاز" کے بازار اور میلے تھے، اہل جاہلیت ہر ایسی تقریب اور ایسے مواقع کی تلاش میں رہتے تھے، جہاں قبائل کو جمع ہو کر قصیدہ خوانی اور لن ترانی کا موقع مل سکے اور اپنے آباء واجداد کے کارنامے بڑھ چڑھ کر بیان کئے جائیں، "منیٰ کا اجتماع" اس جاہلی جذبہ کی تسکین کا بہترین ذریعہ تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو منع فرمایا اور اس کا بہترین بدل عنایت فرمایا، ارشاد ہوا " فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا" "پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر رہے ہو تو اللہ کی یاد کرو، اپنے باپ دادوں کی یاد کی طرح، بلکہ یہ یاد اس سے بھی بڑھ کر ہو،

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ "اہل جاہلیت حج کے موسم میں ایک دوسرے سے مفاخرت کرتے تھے، کوئی یہ کہتا تھا کہ میرے باپ اس کو کھلاتے تھے اور اس طرح دوسروں کا بوجھ اٹھاتے تھے اور دوسروں کی طرف سے خوں بہا دیتے تھے، اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں کی توصیف کے سوا ان کا کوئی کام نہ تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، "فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا". (۱)

---

(۱) درس قرآن، سورۂ مؤمنون: ۲۳ و سورۂ حج: ۲، غیر مطبوعہ کے علاوہ: ☆ تلخیص ارکان اربعہ: ۲۸۷-۳۵۷
☆ اپنے گھر سے بیت اللہ تک: ۹۵-۹۶

حج۔ براہیمی دعوت و تعلیم کی تجدید

اور

عقیدۂ توحید کی صدائے بازگشت

﴿یَا أَیُّھَاالنَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَہ۔اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَخْلُقُوْا ذُبَاباًوَلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ۔وَاِنْ یَسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئاً لاَ یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ۔ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالمَطْلُوْبُ۔مَا قَدَرُوااللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾(سورۂ حج: ۷۳-۷۴)

(اے لوگوایک مثال بیان کی جاتی ہے، اسے غور سے سنو، بیشک جن لوگوں کو اللہ کے سواتم پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی نہیں پیدا کر سکتے، چاہے اس کے لیے سب مجتمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان کے سامنے سے کچھ چھین لے جائے، تو وہ اس سے چھڑا تک نہیں سکتے، طالب اور مطلوب (یعنی عابد اور معبود دونوں) گئے گذرے ہیں، ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی پوری قدر نہیں کی، بے شک اللہ تعالیٰ ہی زبردست (اور) غالب ہے)۔

حسن خاتمہ اور مضامین سابقہ سے ربط و مناسبت

اللہ تبارک وتعالیٰ اس سورۂ حج کو ایسی آیات پر ختم کر رہا ہے، اگر غور کیا جائے تو حج کے موضوع، حج کے مقصد، حج کے مقام اور حج کا حضرت ابراہیمؑ سے جو تعلق ہے اور حضرت ابراہیمؑ کا حج سے جو تعلق ہے اور جو حج کی روح اور مقاصد ہیں ان کے لیے جس کو کہنا چاہیے کہ حسن خاتمہ ہے۔ یوں تو سب اچھا ہی اچھا ہے، لیکن خاتمے کا جو تعلق ہونا چاہیے، مضامین سابقہ سے وہ بڑا گہرا اور غور طلب، بلکہ ذہانت طلب تعلق ہوتا ہے ہمیشہ سے، تمام دنیا کے ادبیات میں اور اللہ کے کلام میں بھی اور رسول کے کلام میں بھی۔ کسی کلام کے خاتمہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور اس خاتمے کا اور اس کے مضامین سابقہ سے ربط جو ہوتا ہے، وہ بڑی عمیق چیز ہوتی ہے جس پر ان لوگوں کی نظر ہوتی ہے، جنھیں اللہ تعالیٰ مناسبت عطا فرماتا ہے اور چیزیں تو نہیں کہتیں، مناسبت اصل چیز ہے۔ (۱)

مذاہب و ادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے معاملے کی یا اس کے اتارے ہوئے دین کی کوئی قیمت نہیں، لیکن جو عوامل کام کرتے رہتے ہیں، نفسیاتی طریقے پر اور اخلاقی طریقے پر، فکری طریقے پر اور ماحول کا جو اثر پڑتا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر ادیان تقریباً بلکہ تمام ادیان کا اپنے مؤسس سے تعلق تقریباً ختم ہو گیا، جو بانی تھے ان مذاہب کے، ان بانیوں کا اصل جو مقصد تھا اور جو چیز ان پر غالب تھی، طاری تھی اور بلکہ حاوی تھی، اس سے تعلق ختم ہو گیا۔ اگر آپ دیکھیں، یہودی مذہب تو کھلا ہوا ہے، اب وہ

(۱) ہمارا محدود مطالعہ ہے، ہمارے مطالعے میں سابقین اور متاخرین میں سے حج پر اتنا حکیمانہ کلام نہیں کیا اور ایسا اصولی اور بنیادی جیسا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے یہاں ملتا ہے حجۃ اللہ البالغہ میں، یہ ہم اس لیے نہیں کہتے کہ لوگوں کا فکری اور دعوتی اور اعتقادی اور مسلکی تعلق ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے، ہم نے امام غزالی سے لیکر امام ابن تیمیہؒ تک اور امام ابن تیمیہ سے لے کر متاخرین تک کا سب کلام دیکھا، لیکن حج پر حالانکہ انہوں نے دو تین حج کیے ہوں گے، ان کا قیام مکہ معظمہ میں جتنا رہا، اس میں جتنے حج کے موقع آئے ہوں گے، لیکن یہ ان کی اصل توفیق الٰہی اور دینی ذہانت اور روح دین کے ادراک کا نتیجہ ہے کہ حج پر انہوں نے اتنا عمیق کلام کیا ہے۔

صرف ایک نسبی تفوق، ایک جنسی اور ایک نسبت انبیاء، انبیاء علیہم السلام سے جوان کو ایک نسبت حاصل ہے صرف اس پر فخر اور ساری دنیا کو اور پوری نوع انسانی کو یہ سمجھنا کہ یہ ہماری چاکری کے لیے بنائی گئی ہے اور ہماری کامیابی اس میں ہے کہ ہم اس کو اپنا تابع رکھیں، چاہے بنا کر تابع رکھیں، چاہے بگاڑ کر تابع رکھیں، بگاڑنے کی صاف صاف تصریحات موجود ہیں، (آپ اگر "بـرة الكرات صهيون" پڑھیں ہمارے پاس کتاب غالباً ابھی تک تھی وہ کتب خانہ میں داخل کردی) تو اس میں صاف صاف یہ ہے کہ نوع انسانی کو اتنا متاثر کردینا چاہیے، اتنا خراب (Corrupt) کردینا چاہیے کہ پھر ہم جو چاہیں وہ کریں اور وہ شطرنج کے مہروں کے طرح ہو جائیں، ہم جس مہروں کو جہاں سے اٹھائیں، جہاں رکھنا چاہیں، وہاں رکھدیں اور بالکل صاف صاف تصریحات موجود ہیں اور یہ اگر آپ ان دی فورٹ (In the Fort) کتاب پڑھیں، جو یہودی چلنے نہیں دیتے، معلوم ہے کہ جب اس کا اسٹاک (Stock) نکلتا تھا، ایک ایڈیشن نکلتا تھا، پورا کا پورا ایڈیشن اس کا عربی ترجمہ ہوا خوش قسمتی سے وہ ہمارے پاس تھا) اور انہوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ صحافت کے ذریعہ ناولوں کے ذریعہ، کہانیوں کے ذریعہ، ریڈیو کے ذریعے اور سب سے بڑھ کر پارلیامنٹ میں جن کے اثرات ہو سکتے ہیں ان پر اثر ڈالنے کے ذریعہ، جتنا بھی کسی ملک کو سوسائٹی کو اپنی مٹھی میں لیا جاسکے لیا جائے، خراب کر کے یا خاص تعلیم دے کر، تو ملت یہودی کا یہ حال ہے، ایسے ہی عیسائی ملت کا یا ہندوستان کے جو مذاہب ہیں، وہ تو بالکل کھلے ہوئے ہیں کہ ان کا کوئی بانی ہی نہیں معلوم ہوتا ہے، اول تو اس کا جو بانی معلوم ہوتا ہے تو اس کی تعلیم ہی موجود نہیں، بقول مفتی مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے انہوں نے بڑے لطف کے ساتھ کہا حیدر آباد کی ایک تقریر میں کہ اللہ کے بندو! تم سے ان کے ناموں کا تو بوجھ اٹھایا نہیں جاسکا، یہ سب کیا لیے پھرتے ہو، پشتارا کہ یہ ہے ان کی تعلیم، نام بھی محفوظ نہیں کہ اگر پیغمبر آتے ہیں تو ان کے نام کیا تھے، یہ دو چار نام رہ گئے ہیں، کرشن جی، رام چندر جی۔

دین براہیمی سے تعلق قائم رہے

اس میں کچھ باتیں خاص طور پر بہت امتیازی ہیں، ایک تو حج کا سب سے بڑا مقصد (شاید دنیاوی مقصد) ہے "مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ" کہ اس ملت کا ملت ابراہیم سے، دین ابراہیم سے اور ذوق ابراہیم سے اور مسلک ابراہیمی سے اور جذبۂ ابراہیمی سے ہے۔ اس لیے کہ جذبہ میں محبت وعشق کی خاص کیفیت چاہیے۔ تاکہ تعلق قیامت تک باقی رہے، یہ حج کا بہت بڑا مقصد ہے۔ توحید کے ساتھ، دیکھئے یہ بہت نازک چیز ہے، توحید کی انتہائی حساسیت کے ساتھ محبت کی پوری کارفرمائی اور یہ بہت کم ہوتا ہے، اس میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے، جب ہم موحد ہو گئے، تو اب اس کے بعد یہ محبت کا اظہار جو گھر اس کی طرف منسوب ہے، اس سے بھی محبت اور ملتزم پر بھی جانا اور حجر اسود کو بوسہ دینا اور کعبہ کا پردہ پکڑ کر دعاء کرنا اور اس بیت اللہ کا، بیشک بیت اللہ ہے حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا ہے، اللہ کے نام، لیکن اس کا طواف کرنا کیا، پھر عمرہ کرنا اور صفا مروہ کی سعی کرنا، یہ چیزیں ہیں، تو ایسا بہت کم ہوا ہے کہ توحید کی آخری حد جو آخری کنارہ ہو سکتا ہے، اس کے ساتھ محبت کا بھی پورا اثر ہو، یعنی وہ توحید جو ہو محض عقلی اور فلسفیانہ نہ ہو، محض منفی نہ ہو کہ یہ خدا نہیں، یہ خدا نہیں، نہیں یہ خدا ہے، تو پھر اس خدا پر جان دینا۔

توحید کی نزاکت

دیکھو مثبت منفی کا ایک فرق بتاتے ہیں، اگر توحید صرف اس کا نام ہے بڑی نازک بات ہے، توحید میں بہت زیادہ احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی اور تربیت اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے توحید نہ پہنچی ہو اور کچھ تربیت نہ ہوئی ہو، تو توحید میں اس کا بڑا خطرہ ہے کہ اس پر سلبیت غالب آجائے، منفی یہ نہیں، یہ نہیں ہاں یہ ہے، اخیر میں گویا ایک مجبوری کہئے یا یہ کہ جس حد تک جائے آدمی کہیں نہ کہیں رکتا ہے، خدا تو بیشک ہے، لیکن بس اتنے ہی خدا ہے، نہیں اس توحید کے ساتھ ایک طرف تو توحید ایسی کھری اور پکی اور ایسی ہو کہ اس میں کوئی سایہ بھی نہ پڑ سکے غیر اللہ کا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک و

تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک عاشقانہ تعلق ایک سرفروشانہ تعلق، دلبرانہ تعلق ہو، فدویانہ تعلق ایسا ہو یہ دو چیزیں کم جمع ہوتیں ہیں، یہ حضرت ابراہیمؑ کی ذات میں بھی جمع تھیں [(۱)] تو ایک تو بہت بڑا مقصد حج کا ملت ابراہیمی کا امت محمدی کا امت اسلامیہ کا حضرت ابراہیمؑ کی ملت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے ذوق کے ساتھ، حضرت ابراہیمؑ کی عاشقانہ کیفیت کے ساتھ قائم رہے، اس لیے وہاں لے جایا جاتا ہے، دکھایا جاتا ہے، انہی جگہوں پر ٹھہرایا جاتا ہے، یہ سب کام کرایا جاتا ہے۔

تحریف سے حفاظت

اور ایک دوسری بات یہ ہے (بڑی کام کی بات، بڑی فکر انگیز جو شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے) کہ تحریف سے بچانا، اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ (یہی دین ابراہیمی) یہی دین محمدی ایک ملک میں کوئی شکل اختیار کر لیتا، دوسرے ملک میں کوئی شکل اختیار کر لیتا، کہیں نماز کس طرح پڑھی جا رہی ہو، کہیں نماز کسی طرح پڑھی جا رہی ہو، دیکھا ہے، وہاں، ایسی چیزیں جو ایسے حلقوں میں ہوتی ہے، مثلاً پیر پرستی ہے، جہاں دینی تعلیم عرصے سے نہیں ہے، یا غیر مسلموں کے اثرات ہیں کہ وہ چیزیں ایک ملک کو دوسرے ملک

(۱) آپ کو معلوم ہے کہ اسمٰعیلؑ کے ذبح میں جو بات ہے کہ ایک طرف تو توحید کی دعوت اور ایک طرف ایک خواب دیکھ لینے کی بنا پر اللہ تبارک و تعالیٰ کا منشا معلوم کرنے کی بنا پر اپنے بیٹے کو گرا دیا اور چھری رکھدی، چھری پوری طاقت سے چلائی، یہ تو چونکہ نتیجہ نہیں نکلا اس لیے سمجھیں کہ رسماً تھی، نہیں تو پوری قوت سے چلائی، جب ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ''یَا اِبْرَاہِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا'' تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، یہ ''صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا'' اس کے معنی جو عربی سے واقف ہیں، زبان کی روح سے وہ اس کے معنی سمجھیں گے کہ یہاں پر تصدیق کا لفظ باب تفعیل کا لفظ کیوں لایا گیا ہے؟ ''صَدَقْتَ الرُّؤْیَا'' بھی ہو سکتا تھا، ''اَوْفَیْتَ الرُّؤْیَا'' دس لفظ ہو سکتے تھے، ''صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا'' تم نے اپنے خواب کو پورے طور پر سچ کر دکھایا، کہ تم نے پوری طاقت سے چھری چلائی، لیکن ہمیں اسمٰعیل کے گلے پر چھری چلوانا مقصود نہیں تھی، جو محبت ہماری محبت کے مقابلے میں آ سکتی تھی، اس کے گلے میں چھری چلوانی مقصود تھی، وہ چل گئی، جیسے ہی تم نے اسمٰعیلؑ کے گلے پر چھری رکھی، وہ تو ذبح ہو گئی، وہ محبت اس لیے کہ وہ تو آخری درجہ کی چیز ہے وہی اس پر چھری رکھے گا اپنے بیٹے کے گلے پر کہ جو اس محبت کو فنا کر چکا ہو۔

کی خبر ہوسکتا ہے کہ نہ ہو، کہ وہاں کس طرح عبادت کی جا رہی ہے؟ کیا عقیدہ ہے؟ اسلام کے کیا کیا عقائد ہیں؟ کیا کیا فرائض ہیں؟ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شہر کو دوسرے شہر کی خبر نہ ہو اور یہ ہوسکتا ہے کہ ایک محلے کو دوسرے محلے کی خبر نہ ہو۔

• یہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ محلے کو تحریف سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نماز با جماعت کا انتظام کیا، مسجد میں آؤ سب کو دیکھ لو، ہر ایک دوسرے کو دیکھے کہ اس طرح نماز پڑھیں، ٹھیک ہے، یوں کھڑے ہوتے ہیں، یوں رکوع کرتے ہیں، سجدہ کوئی اپنے گھر میں کیسے کرنے لگے اور شہر کو تحریف سے بچانے کے لیے جامع مسجد جمعہ کا انتظام کیا اللہ تعالیٰ نے (۱) اور پورے عالم اسلام کو تحریف سے بچانے کے لیے حج کا انتظام کیا گیا، گھروں کو بچانے کے لیے محلے کی مسجد اسی لیے ترغیب ہے کہ مسجد ہی میں نماز پڑھو اور شہر کو تحریف سے بچانے کے لیے جامع مسجد اور پوری امت کو بچانے کے لیے حج کا انتظام کیا گیا، تو ایسا اگر حج نہ ہوتا تو ایسا ہوسکتا تھا کہ دنیا کے، عالم اسلامی کے کسی حصے میں ایک نیا دین شروع ہو جاتا، اس پر برسوں ممکن ہے کہ صدیوں تک عمل ہوتا رہتا اور پتہ نہ چلتا کیا ہو رہا ہے، معلوم نہیں کیا عقائد پرورش پاتے، کیا صورتیں بن جاتیں عبادت کی؟ لیکن وہاں جا کر سب دیکھ لیتے ہیں کہ یہ وہی نماز ہے جو ہمیں بتائی گئی ہے، جو قرآن وحدیث میں آئی ہے، اگر نماز میں جو باتیں کی گئیں، بدعات کی گئیں، وہ صحیح ہوتیں تو یہاں ہوتیں، اس لیے کہ اصل جگہ تو یہی ہے، یہاں نہیں ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ غلط ہے، تو مستند ہونا نہ ہونا وہاں جا کر معلوم ہو جاتا ہے۔

دین براہیمی کی اصل بنیاد اور اس کی دعوت

ہم نے یہ تمہید اس لیے کہی کہ اب یہ سورۂ حج جس سورت کا نام ہے اور جس میں حج پر

(۱) اور اسی لیے امام شافعیؒ کی بات، ان کی ذہانت کی بات تھی اور قابل قدر ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ شہر میں ایک ہی جگہ جمعہ کی نماز ہونی چاہیے، شافعی مسلک میں ترجیح اسی کو حاصل ہے اور ہم نے جامع ازھر کی مسجد میں دیکھا کہ لوگوں نے جمعہ کی نماز کے بعد پھر نماز پڑھی اس لیے کہ جو شافعی تھے، وہ جانتے ہیں کہ معلوم نہیں کتنی جگہ جمعہ ہو رہا ہے۔

بہت سی آیتیں حج سے متعلق تھیں اور وہ خالی احکام کے انداز میں نہیں تھیں، بلکہ جذبات پیدا ہوں، حج کا جذبہ اور حج کی روح پیدا کرنے کے انداز میں بھی تھیں، اب اس کا یہ آخری رکوع ہے، اب اس رکوع کو اللہ تعالیٰ ان چیزوں پر ختم کر رہا ہے، جو دین ابراہیمی کی اصل بنیاد اور اس کی دعوت اور انکا ذوق، دعوت ہی نہیں بلکہ ان کا ذوق، ان کا جذبہ ہے، وہ کیا چیز ہے پہلی؟ وہ توحید ہے۔

توحید بدیہی کا ثبوت

تو پہلی آیت اس کے متعلق "یا أَیُّهَا النّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ" یہاں پر یہ خاتمہ ایسا ہونا چاہیے، جو طاقتور بھی ہو، واضح بھی ہو، واضح بھی ہو تو طاقتور بھی ہو، یہ خاتمے کے لیے ضروری ہے، جس مضمون کا خاتمہ کمزور ہوگا، وہ مضمون بلیغ نہیں سمجھا جائیگا، اب اس سے زیادہ کیا الفاظ صاف ہو سکتے ہیں اور شرک کی اصلی بے بنیادی، بے بنیاد ہونے، بے حقیقت ہونے اور توحید کے بدیہی ہونے اور قطعی ہونے کے لیے اس سے بہتر کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔

"یَا اَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهُ" اے لوگو! کیا انداز ہے دیکھ لیجئے پہلے، اے لوگو! ایک مثال دی جارہی ہے، کان کھول کر سنو! "فَاسْتَمِعُوْا"، معلوم ہوتا ہے کہ ایکدم جیسے کوئی خطیب ہو، جب آخری درجہ پر اس کو جوش آجاتا ہے، (اللہ تبارک و تعالیٰ معاف فرمائے) لیکن یہ کہ سورت کے مضامین کا تقاضا بھی یہی تھا، اب اس کو عام فہم اور مؤثر سے مؤثر اور واضح سے واضح طریقے پر اس کا خاتمہ کرنا چاہیے "اے لوگو! ایک مثال دی جارہی ہے، ایک مثال دی گئی ہے، اس کو کان کھول کر سنو، "اِنَّ الَّذِینَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ لَنْ یَخْلُقُوا ذُبَاباً، وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ" "بے شک جن لوگوں کو اللہ کے سوا تم پکارتے ہو، بلاتے ہو عبادت کرتے ہو، وہ ایک مکھی تک پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، چاہے سب جمع ہو کر یہ کام کریں" پھر کوئی کانفرنس بلائیں، کوئی کنوینشن بلائیں، لیکن ایک مکھی بھی نہیں پیدا کر سکتے، سب مل کر بھی ایک مکھی نہیں پیدا کر سکتے اور اتنی بات نہیں، "وَاِنْ یَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئاً لَایَسْتَنْقِذُوهُ مِنْهُ" اور اگر مکھی ان سے کچھ چھین لے، تو اس کو

بچا بھی نہیں سکتے اور یہ سب دیکھنے میں آتا ہے، اچھے اچھے بڑے بڑے رئیسوں کو اگر دیکھئے تو وہ زور کا پنکھا نہ چل رہا ہو اوپر سے اور وہ دوسرے انتظامات نہ ہوں اور وہ جراثیم کش چیزیں وہاں نہ لگی ہوں، تو مکھی تک ان سے نہیں بھاگ سکتی، مکھی ان کے ہاتھ میں جو لقمہ ہے، اس میں بیٹھ جائیگی، اس میں سے کچھ لے جائیگی۔

''وہ انسان جو شعر و فلسفہ اور سیاست و معاشرت کے باب میں بڑے بڑے دعوے کرتا ہے اور بڑی خوش فہمیاں رکھتا ہے، جس نے بارہا قوموں اور ملکوں کو غلام بنایا ہے، جس نے اپنے ہنر سے ٹھوس پتھروں کو مہکتے اور لہلہاتے پھولوں میں بدل دیا ہے اور پہاڑوں کے سینوں سے نہریں نکالی ہیں اور جس نے کبھی کبھی خدائی کا بھی دعویٰ کیا ہے، یہی انسان ایسی حقیر و ذلیل چیزوں کو بھی سجدہ کرتا رہا ہے، جو نہ نفع دے سکتی ہیں، نہ نقصان، نہ کسی کو کچھ دے سکتی ہیں، نہ اس سے روک سکتی ہیں''(۱) ''ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالمَطْلُوب'' طالب بھی کمزور، مطلوب بھی کمزور، یہ معبود بھی کمزور یہ عابد بھی کمزور ہے۔

''اور یہی جہالت انسانوں کو مسجود ملائک کے بلند و بالا مقام سے گرا کر ضعیف مخلوقات اور ذلیل و بے حقیقت اشیاء کے سامنے سجدہ ریز کر دیتی ہے اور انسان کی قوتوں کا گلا گھونٹ دیتی ہے، ان کی صلاحیتوں کا خون کر دیتی ہے، قادر مطلق پر، اس کے یقین، اس کی خود اعتمادی اور خود شناسی کا خاتمہ کر دیتی ہے اور سمیع و بصیر، صاحب قدرت و قلم، صاحب جود وعطاء اور مغفرت و محبت والے خدا کی محفوظ و مستحکم پناہ سے نکال کر اور اس کی لامحدود صفات اور نہ ختم ہونے والے خزانوں کے فوائد سے محروم کر کے کمزور، عاجز، فقیر اور حقیر مخلوقات کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے، جن کی جھولی میں کچھ نہیں''(۲) ''ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالمَطْلُوب'' طالب بھی کمزور، مطلوب بھی کمزور، یہ معبود بھی کمزور یہ عابد بھی کمزور ہے۔

''مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِہ'' انہوں نے اللہ تبارک وتعالی کا پورا اندازہ نہیں لگایا، اردو میں کہتے ہیں قدر کرنا، اللہ تعالیٰ کی پوری قدر نہیں کی، قدر کے معنی اصل میں عربی میں اندازہ کے ہیں، انہوں نے اللہ تعالیٰ کا پورا اندازہ ہی نہیں لگایا، انصاف ہی نہیں کیا''اِنَّ اللّٰهَ

---

(۱) اسلام کے اثرات واحسانات: ۲۲ (۲) منصب نبوت: ۲۷-۳۷

لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ" بیشک اللہ تعالیٰ ہی قوی وعزیز ہے اور دیکھئے اوپر جو باتیں کہی گئیں ہیں ان سب کے لیے سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی صفات یہ "اَلْقَوِیُّ الْعَزِیْز" ہے، اس لیے کہ مکھی کی کمزوری بتائی گئی اور ان کے عابدین کی اگر ہو سکتے ہیں، یا انسانوں کی کمزوری بتائی گئی، تو یہاں پر اللہ ہی ہے جو "اَلْقَوِیُّ الْعَزِیْز" ہے جو چاہے پیدا کرے نہ کوئی ان کا ہاتھ روک سکتا ہے، نہ کوئی اس کے یہاں سے لے سکتا ہے، کوئی کچھ نہیں کرسکتا ہے، قوی بھی ہے، عزیز بھی، ہر قوی کے لیے عزیز ہونا ضروری نہیں، قوی ہے بہت لیکن غالب نہیں ہے، کوئی ترکیب ہے، کوئی جھانسہ دے جاتا ہے، کوئی اور طریقے سے کوئی چھین لے جاتا ہے، لے جاسکتا ہے، سو رہا ہو تو اس وقت قبضہ کرسکتا ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ قوی عزیز بھی ہو، یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ عزیز قوی بھی ہو، بہت سے ہیں جو عزت حاصل کر لیتے ہیں، غلبہ حاصل کر لیتے ہیں، لیکن قوی نہیں ہوتے، تو قوی وعزیز دونوں صفتیں پائی جائیں تو پھر کوئی بات رہتی ہی نہیں، "اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِی عَزِیزٌ" "بیشک اللہ تعالیٰ ہی قوی اور عزیز ہے"۔

"یہ پوری کائنات (Universe) اسی کے ارادہ سے ہے، وہ "قوی" زبردست اور "عزیز، غالب" ہے، نہ کوئی اس کی طرح ہے، نہ اس کا کوئی مقابل اور برابری والا ہے، وہ بے مثال ہے، وہ کسی مدد کا محتاج نہیں، کائنات کے چلانے اور اس کا انتظام کرنے میں اس کا کوئی شریک، ساتھی اور مددگار نہیں"[1] ...."وہی اس کا خالق وصانع اور اس کا مدبر ہے اور خلق و امر کا اختیار اسی کو ہے، "أَلَا لَـهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" (اسی کا کام پیدا کرنا ہے اور اسی کا کام حکم دینا ہے) اس دنیا کی ہر چیز اسی کے امر اور قدرت کے ذریعہ وجود میں آتی ہے اور اس کے وجود کی علت حقیقی اس کا ارادہ اور اس کی قدرت ہے، اس طرح یہ کائنات اپنی تخلیق و وجود میں اس کے ماتحت اور تابع فرمان ہے "وَلَـهُ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض" اس لیے ان مخلوقات کو جو ارادہ واختیار رکھتی ہیں، اس کا فرماں بردار ہونا چاہیے، "اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ"[2]

(۱) اسلام کا تعارف: ۱۹ (۲) درس قرآن سورۂ حج: ۳۷-۴۷، غیر مطبوعہ کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب سے بالترتیب اخذ وتلخیص کی گئی ہے: ☆ اسلام کے اثرات و احسانات: ۲۲ ☆ منصب نبوت: ۲۷-۳۷ ☆ اسلام کا تعارف: ۱۹ ☆ اسلام کے اثرات واحسانات: ۲۴

قربانی کی حکمت اور اس کی ضرورت (۱)

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكاً لِيَذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ. فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ. اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَا اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ (سورۂ حج: ۳۴-۳۵)

''اور ہم نے ہر ایک امت کے لیے قربانی کا طریق مقرر کر دیا ہے، تا کہ جو مویشی چار پائے خدا نے ان کو دیئے ہیں، (ان کے ذبح کرنے کے وقت) ان پر خدا کا نام لیں، سو تمہارا معبود ایک ہی ہے، تو اسی کے فرمانبردار ہو جاؤ اور عاجزی کرنیوالوں کو خوشخبری سناؤ، یہ وہ لوگ ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور (جب) ان پر مصیبت پڑتی ہے، تو صبر کرتے ہیں اور نماز آداب سے پڑھتے ہیں اور جو (مال) ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے، اس میں سے (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں۔

قربانی کا شجرۂ نسب

''وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكاً'' ''اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی رکھی''
قبل اس کے کہ ان آیتوں کی تشریح اور کچھ تفسیر کی جائے، جن کا مرکزی محور اور مرکزی

نکتہ قربانی ہے، قربانی کا مقصد اور قربانی کا درجہ اور قربانی کی ضرورت اور قربانی کی شریعت اسلامی نہیں بلکہ شرائع الٰہی ہے، اس لیے قربانی کے متعلق یہ بات ثابت ہے کہ ہر مذہب میں قربانی تھی، مختلف جانوروں کے احکام تھوڑے تھوڑے اختلاف میں زمانے کے مطابق تھے، لیکن قربانی یہ قدر مشترک ہے، تمام مذاہب وادیان میں، اس کو سمجھ لینا چاہیے، اصل چیز یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ پر ایمان لانے اور عقیدۂ توحید کا یہ طبعی تقاضا ہے، بلکہ اس کا مطالبہ ہے اور اس کی حقیقت وفطرت میں داخل ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ ہر چیز اللہ کے اوپر قربان کی جائے، یعنی یہ لفظ جو ہم بول رہے ہیں یہ قصداً ہے، عربی میں بھی یہ لفظ ہے تھوڑے فرق کے ساتھ، ماسوی اللہ جو ہے اس کو اللہ پر قربان کیا جائے، اس کو قربان کرنے کا طریقہ ایک نہیں ہوسکتا، مثلاً کسی خواہش کا قربان کرنا، وہ کوئی مجسم چیز نہیں ہے کہ اس کے گلے میں چھری پھیری جائے، اولاد کو قربان کرنا، اس کے معنی یہ نہیں ہے کہ اولاد کو ذبح کردیا جائے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ کریں گے، محبوبات کو قربان کرنا، مرغوبات کو قربان کرنا، عادات جاہلیہ کو قربان کرنا، رسم ورواج کو قربان کرنا، حب جاہ اور اعزاز طلبی، بڑے بننے کے شوق کو قربان کرنا اور دوسرے کے مقابلے میں اپنی ذات کی بڑائی کو ہر قیمت پر باقی رکھنے کے جذبے کو قربان کرنا، یہ سب قربانی کے ذیل میں آتا ہے، لیکن ہر چیز کی قربانی الگ الگ ہوتی ہے، ہر چیز کی قربانی اس طرح نہیں ہوسکتی ہے، ان کا جسم ہی نہیں ہے کہ ان کو لٹا کر ان کے گلے پر چھری پھیری جائے۔

''مجھے افسوس ہے کہ قربانی کا لفظ اتنی کثرت سے استعمال ہوا ہے اور ہماری سیاسی تحریکوں نے (لکھنؤ کی زبان میں کہوں گا کہ) اس کی مٹی ایسی پلید کی ہے (اور علمی زبان میں کہوں گا کہ) اس کا ایسا غلط استعمال کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت کھو چکا ہے، قربانی تو وہ چیز ہے کہ اس کو سنتے ہی بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں، لیکن ہم قربانی کا لفظ جب استعمال کرتے ہیں تو ملازمت کی قربانی کو تنخواہ کی معمولی سی قربانی کو اس کا مصداق سمجھتے ہیں، لیکن قربانی وہ باعظمت اور مقدس چیز ہے، جس کی تاریخ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی پر ختم ہوتی

ہے، ہر چیز کا شجرۂ نسب ہوتا ہے، مسجد کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی مسجد کعبہ یعنی بیت اللہ سے ملتا ہے اور جس مسجد کا نسب مسجد ابراہیمیؑ پر جا کر ختم نہ ہو، وہ مسجد خانۂ خدا کہلانے کی مستحق نہیں وہ مسجدِ ضرار ہے اور جس مدرسہ کا شجرۂ نسب صفۂ نبویؐ پر ختم نہ ہو، وہ مدرسہ دانش کدہ نہیں، جہالت کدہ ہے، تو اس طرح میں کہوں گا کہ جس قربانی کا شجرۂ نسب ابراہیم خلیل اللہ کے جذبۂ ایثار وحبِ خدا اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی بے نفسی وتسلیم ورضا پر ختم نہ ہو وہ صحیح النسب نہیں ہے"۔ (۱)

اب اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا کم سے کم امت اسلامیہ میں جو شریعت محمدی اور امت اسلامی، یہ اسلام وہ ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ" یہ تمہارے جدامجد، تمہارے مورث اعلیٰ، دینی مورث اعلیٰ ابراہیمؑ کا مذہب ہے، ان کی ملت ہے، انہوں نے تمہارا نام "مسلم" رکھا ہے اور اسلام کے معنی ہیں، دست بردار ہو جانا اور قربان کر دینا، بے ادبی نہ ہو تو ہم کہیں گے اس کے لیے خاص اصطلاح ہے انگریزی میں سرینڈر (Surrender) کر دینا، یعنی بالکل اس کے سامنے بے حقیقت بن جانا اور کسی قسم کا معارضہ نہ کرنا، بلکہ اپنے کو حوالہ کر دینا اور تقاضے کو بھی اس پر قربان کر دینا، تو قربانی کو یوں سمجھیں کہ ملت اسلامی میں جو قربانی ہے، وہ اس طرح ہوتی ہے۔

دنیا کی ہر قوم وتہذیب میں قربانی کا رواج

"لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكاً" "اور ہم نے ہر ایک امت کے لیے قربانی کا طریق مقرر کر دیا ہے"

دنیا کی کوئی قوم اور ملت ایسی نہیں جو کچھ نہ کچھ مقدس مقامات نہ رکھتی ہو اور اس کے متبعین اور پیرو کسی خاص مذہبی موقع پر ایک جگہ جمع نہ ہوتے ہوں، ان مذہبی مقامات کی زیارت یا مذہبی سفر کے لیے کچھ اصول اور طریقے اور رسوم وروایات ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ عمل فطرت بشری کے عین مطابق اور ضمیر کی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہے، انسان

(۱) دعوتِ فکر وعمل ۲۵۔۲۶

برابر کسی ایسی چیز کی جستجو اور آرزو میں رہتا ہے، جس سے قریب ہو کر وہ اپنے جذبۂ عقیدت و محبت کی تسکین کر سکے، وہ ایک ایسا طویل اور بڑا عمل چاہتا ہے، جس سے اس کے بڑے بڑے گناہوں اور مہلک غلطیوں کی تلافی ہو سکے اور وہ ضمیر کی چبھن، مذہبی حس کی کھٹک اور سوسائٹی کی ملامت سے چھٹکارا پا سکے، اس کے اندر ایک ایسے عظیم اور عام دینی اجتماع کی طلب پوشیدہ ہے، جہاں صرف دینی اخوت اور روحانی رشتہ کارفرما ہو، کوئی دوسری اساس اور دوسرا جذبہ اس میں شامل نہ ہو۔

جب ہم تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اور تہذیب کا کوئی دوران مذہبی سفروں، زیارت گاہوں اور مقدس و متبرک مقامات سے خالی نہیں، جہاں لوگ جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور یا اپنے خودساختہ معبودوں اور دیوی دیوتاؤں کے لیے قربانیاں کرتے ہیں، نذریں مانتے ہیں اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔

قربانی کے فوائد و مصلحتیں

تو قربانی ہر مذہب میں رہی ہے، قربانی کے فوائد بھی آپ سمجھ لیجئے [1] قربانی کا ایک فائدہ ہے کہ مرغوب چیز کو خدا کے راستے میں قربان کرنا اور مرغوبات میں صدہا ایسی چیزیں ہیں جن کے قربان کرنے کی اللہ تعالیٰ اجازت نہیں دے سکتا، انسانوں سے محبت ہوتی ہے، حقیقی بھائی سے محبت ہوتی ہے بہن سے محبت ہوتی ہے، ماں باپ سے محبت ہوتی ہے، استاد سے محبت ہوتی ہے، کسی سے روحانی فائدہ پہنچا ہو اس سے محبت ہوتی ہے اور محلے والوں سے

---

(۱) بعض روشن خیالوں اور بہت ترقی پسند لوگوں کے ذہن میں یہ بات آئی، انہوں نے مضامین لکھے اور تحریک چلائی، کہ اب قربانی کی ضرورت نہیں کہ قربانی معاذ اللہ ایک بھدا سا فعل ہے، نماز پڑھنی چاہیے، دعاء کرنی چاہیے، اپنے اخبات و انابت کا اظہار کرنا چاہیے، جانور کا کیا قصور ہے، جانوروں کی کیا ضرورت ہے؟ اور پھر اس میں وہ اقتصادیات بھی شامل ہو گئے اور مادیات بھی شامل ہو گئے، تو اب تو یہ فتنہ تقریباً ختم ہو گیا ہے، ہمارے بچپن کا زمانہ رہا ہوگا، کہ جب یہ باقاعدہ روشن خیال لوگ یونیورسٹیوں کے فضلاء اور یورپ سے پڑھ کر آنے والے قربانی پر انہوں نے اعتراض کرنا شروع کیا، تشکیک پیدا کرنی شروع کی کہ قربانی ایک غیر عقلی فعل ہے، اس کی اب ضرورت نہیں، وہ ایک زمانہ تھا۔

محبت ہوتی ہے، رفیق کار سے محبت ہوتی ہے، بعض ایسی چیزیں ہیں کہ جن سے محبت ہے ان سے قربانی، مثلاً کسی کو اپنی شیروانی پسند ہے، تو اسکی قربانی کیا ہوگی، کسی کو اپنی گھڑی پسند ہے، کسی کو اپنا عصا پسند ہے، تو ہر چیز کی قربانی نہیں ہوسکتی، قربانی جانور کی ہوسکتی ہے، اس لیے مرغوبات کی قربانی کا نمائندہ بنایا اللہ تعالیٰ نے مظہر بنایا جانور کو، اس میں محبوب چیز کی قربانی کا پورا مظاہرہ آ گیا عمل آ گیا۔ (۱)

دوسری بات یہ ہے کہ قربانی کے عمل میں، قربانی کے حکم میں، ردشرک بھی مقصود ہے، قربانی کے حکم میں ایک بہت بڑا جو اس کا نکتہ جو اس کا مقصد ہے، وہ ہے ایسی چیز کو ایسے جانور وں کو قربان کرنا، جن کو کبھی نہ کبھی کسی زمانے میں کسی قوم میں یا کسی نہ کسی مذہب میں مقدس سمجھا گیا، معبود بنایا گیا اور آج بھی، اسی لیے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بڑے نکتے کی بات لکھی ہے، کہ ''ذبح بقر در ہندوستان از اعظم شعائر اسلام است'' کہیں کوئی بات ہوئی ہوگی کہ گائے کی قربانی کا رواج کم ہو گیا ہوگا نہیں، انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی اور زیادہ ضروری ہے، یہ شعائر اسلام ہے، اس لیے کہ یہاں اس کی پرستش ہوتی ہے، تو یہاں تو خاص طور سے اس کی قربانی کر کے مسلمانوں کو ثابت کرنا چاہیے۔ کہ دیکھو یہ معبود نہیں ہو

(۱) مرغوبات میں قربانی کا نمائندہ جانور کی قربانی، چونکہ اس میں پیسے خرچ کرنے پڑتے ہیں، ہر ایک جو بھی شخص ہوگا، کسی نے دیا ہوگا جانور یا خریدا ہوگا، اس نے یا موروثی ہوگا، تو ابھی اوپر سے تو پیسے بھی خرچ، لیکن عام طور سے قربانی کے لیے لوگوں کو جانور خریدنے پڑتے ہیں، وہ کتنے آدمی ہیں، جن کے یہاں بکری پلی ہوتی ہے بہت دن سے، بس وہ بکری کافی ہے، اگر ہوگی اس سال، تو قربانی کی تو تکرار ہوتی ہے، یہ بڑی مصلحت ہے دین کی، کہ عمر بھر میں ایک مرتبہ قربانی کافی نہیں، ہر سال قربانی کرنی چاہیے ورنہ یہ ہوتا کہ ایک جانور تھا ہمارے پاس خرچ نہیں ہوا چلو اس کو قربانی کر دیں، نہیں اس سال پھر قربانی کرو، اچھا اور اس میں ایک نکتہ بھی ہے، کہ دام بھی بڑھتے رہتے ہیں، اس میں بھی بڑا نکتہ ہے، اب وہ ہمیں یاد ہے بچپن میں کہ بکری آٹھ روپے کی لے آئے، دس روپے کی لے آئے، اب دیکھ لو گوشت کی قیمت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے، تو دام بھی بڑھتے رہتے ہیں تو اور قربانی کی اس کے اندر صفت پیدا ہوگئی ہے، کہ ہر سال کرنے میں یہ ہے کہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اتنے دام خرچ ہوتے ہیں، وہ بڑھتے جائیں گے، تو قربانی کی قیمت بھی بڑھتی جائیگی، قربانی کی اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں قدر و قیمت بھی بڑھتی جائیگی، اتنا خرچ کر کے کیا، پھر اگلے سال اتنا خرچ کر کے کیا۔

سکتا، یہ اپنے کو بچا بھی نہیں سکا، قربانی تو عبودیت کی آخری نشانی ہے، عجز کی اور ناطاقتی کی [(1)]
غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ قربانی میں بڑی مصلحتیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ سنت ابراہیمی ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہونے کے بعد پھر تو کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں، لیکن چونکہ لوگوں نے کہا، اس لیے ہم نے بتایا کہ قربانی میں ایک تو مرغوب کی قربانی ہے، ایک کو مرغوبات کا نمائندہ بنا کر اس کو قربان کرنا ہے، جس کے ساتھ بہت سے مفادات اور فوائد وابستہ تھے، اس کا گوشت لذیذ ہے اور اس میں لذت بھی ہے، قوت بھی ہے، غذائیت بھی ہے، یہ سب کچھ ہے، اس کو ہم نے قربان کیا اور گوشت سب تقسیم ہو گیا۔

اور دوسری بات یہ کہ اس میں ردشرک ہے اور ردشرک اتنا بڑا ہے کہ کسی اور چیز سے اتنا ردشرک ہو ہی نہیں سکتا، جس کی پرستش کی جا رہی ہے، اس کو لٹا کر ہم اس پر چھری پھیر رہے ہیں اور اس کو ذلیل کر کے اللہ کا نام تو لیتے ہیں لیکن بالکل اس کو بے بس بنا کر قربان کر رہے ہیں۔

قربانی کی ابتداء ذکر الٰہی سے ہونی چاہیے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُم مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ" "تاکہ اللہ کا نام لیں وہ اس چیز پر جس کو اللہ نے ان کو عطا کیا ہے" چلنے والے جانوروں میں سے چوپایوں میں سے جو ہم نے عطا کیا، اس میں معلوم ہوا کہ وہ مرغوب چیز ہے، اللہ نے رزق کی نسبت اپنے طرف کی ہے کہ ہم نے جو اس کو ایک نعمت کے طور پر ایک مفید اور کارآمد

---

(۱) اس میں ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مذاہب کی تاریخ کے تقابلی مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے (Comprative Study) جسے کہتے ہیں اور آج کل اس کے بہت ذرائع پیدا ہو گئے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا لکھے گئے ہیں، مذاہب کے بارے میں پوری معلومات ہیں تو مذاہب کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جانوروں کی تقدیس اور تقدیس ہی نہیں جانوروں کی پرستش کا بہت سے مذہبوں میں یا کہا جا سکتا ہے اکثر مذہبوں میں کسی نہ کسی طریقے سے رواج ہو گیا، کہیں کسی جانور کو مقدس ماننے لگے، ہر نسبتیں الگ الگ رہی ہیں، کیوں مانتے ہیں یہ ہمارے پیر کا جانور ہے، یہ ہمارے استاد کا، یہ ہمارے فلاں بزرگ کا جس کی دعاء سے کام ہوا، کبھی کسی نسبت سے اور کبھی کسی نسبت سے اور کبھی اسکے کسی اور فعل کو دیکھ کر جس پر آدمی نے محمول کیا، غیر اتفاقی چیز پر اور ہندوستان میں شروع سے جانور کی پرستش ہو رہی ہے اور گائے اس کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

چیز دی ہے، اس پر اللہ کا نام لے کر اس کو قربان کر دیں، یہی قربانی کی روح ہے، اس میں کوئی لفظ زائد نہیں ہے، ہر لفظ کے اندر مطالب ہیں اور حقائق ہیں، "لِیَذْکُرُوا" تاکہ ذکر کریں، معلوم ہوا کہ یہ عبادت ہے عادت نہیں ہے اور یہ کوئی سرکاری حکم نہیں ہے، بلکہ یہ ایمان و احتساب کی چیز ہے، اللہ کی رضا کے لیے کی جا رہی ہے، اس کی ابتداء ذکر الٰہی سے ہونی چاہیے اللہ کا نام اس پر لینا چاہیے اور اللہ کا نام لیں اس پر "عَلٰی مَارَزَقَھُم" "اس چیز پر جو اللہ نے اس کو عطا کی تھی" چوپایوں میں سے جانوروں میں سے۔

"فَاِلٰھُکُم اِلٰہٌ واحِدٌ" اب دیکھئے ہم نے جو بات کہی تھی کہ بہت بڑا جو اس میں راز ہے، مقصد ہے وہ توحید ہے، توحید کا اعلان ہے اور اللہ کے سوا ہر چیز کا عاجز ہونا ثابت کرنا اور ہمارے اپنے گویا قابو میں ہونا ثابت کرنا ہے، "فَاِلٰھُکُم اِلٰہٌ وَاحِدٌ" اس لیے یہ اس کے ساتھ فوراً آیا ہے کہ "فَاِلٰھُکُم اِلٰہٌ وَاحِدٌ فَلَه أسْلِمُوا" "پس تمہارا پروردگار معبود الٰہ واحد ہے" "فَلَهٗ أسْلِمُوْا" "اسی کے سامنے سر جھکا دو"۔

"وَ بَشِّرِ الْمُخْبِتِین" اور بشارت دیجئے ان لوگوں کو جو حکم مانتے ہیں بے چون و چرا اور فوراً، اخبات کے اندر، سرعت کے ساتھ جو اطاعت ہو اور بلا چون و چرا جو اطاعت ہو، اس کو اخبات کہتے ہیں، "اَخْبِتُوا" بالکل سرافگندہ ہو گئے، بالکل سر تسلیم خم کر دیا، حکم کے بندے بن گئے "الَّذِینَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُھم" ان مخبتین کو بشارت دیجئے کہ جب اللہ کا نام ان کے سامنے لیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور ان کے دل خوف زدہ ہو جاتے ہیں، "والصَّابِرِینَ عَلٰی مَا أصَابَھُم" اور اسی طریقے سے بشارت دیجئے، ان لوگوں کو جو صبر کرنے والے ہیں، اس چیز پر جو ان کو پہنچی، اب اسی میں جو پیسہ خرچ ہوا، وہ بھی اس طرح "عَلٰی مَا أصَابَھُمْ" میں شامل ہے، ایک جانور پلا ہوا تھا، روز دیکھتے تھے، ایک اس سے تعلق پیدا ہو گیا تھا، مانوس ہو گیا تھا وہ، یہ بھی ہے، "والْمُقِیْمِی الصَّلوٰة" اور بشارت دیجئے نماز کی پابندی کرنے والوں کو، "وَمِمَّا رَزَقْنَا ھُمْ یُنْفِقُون" اور جو ہم نے ان کو دیا اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں، اس لیے کہ قربانی میں یہ صفت بھی شامل ہے۔ [1]

(۱) درسِ قرآن سورۂ حج: ۳۴-۳۵، غیر مطبوعہ کے علاوہ: ☆ ارکانِ اربعہ: ۳۴۱-۳۴۲ ☆ دعوتِ فکر و عمل: ۲۵-۲۶، سے مشترک اخذ و استفادہ کیا گیا ہے۔

قربانی کی حکمت اور اس کی ضرورت (۲)

﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ. فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَافَّ فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا فَكُلُوا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ. كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ. لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا. وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ. كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ. وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِينَ ﴾

(سورة الحج: ۳۶-۳۷)

''اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے شعائر خدا مقرر کیا ہے، ان میں تمہارے لیے فائدے ہیں، تو (قربانی کرنے کے وقت) قطار باندھ کر ان پر خدا کا نام لو، جب پہلو کے بل گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور قناعت سے بیٹھ رہنے والوں اور سوال کرنے والوں کو بھی کھلاؤ، اس طرح ہم نے ان کو تمہارے زیر فرمان کر دیا ہے، تا کہ تم شکر کرو، خدا تک نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ اس تک تمہاری پرہیز گاری پہنچتی ہے، اسی طرح خدا نے ان کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔ اس بات کے بدلے کہ اس نے تم کو ہدایت بخشی ہے، اسے بزرگی سے یاد کرو اور (اے پیغمبر) نیکوکاروں کو خوشخبری سنا دو''۔

اونٹ بھی اللہ کی ایک نشانی ہے

"والبُدْنَ جَعَلْنَا ھا لَکُم مِنْ شَعَائِرِ اللّٰہِ" اور یہ اونٹ جو ہیں ہم نے ان کو تمہارے لیے عرب کے لوگ جو قرآن مجید کے مخاطبین اولین تھے، جن کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا، ان کے نزدیک اونٹ بہت بڑی دولت ہے اور ان کی زبان وادب معاشرہ اور عادات میں اونٹ داخل ہے، یعنی ان کے نفسیات میں اونٹ داخل ہے۔ اس کا اندازہ ہم آپ نہیں کر سکتے، اگر ہم شاعری پڑھیں، ہم حماسہ پڑھیں، جاھلیت کا کلام پڑھیں، اس زمانہ کے مکالمے دیکھیں، اس زمانے میں آپس میں ملنے جلنے میں جو بے تکلف باتیں ہوتی ہیں، تو معلوم ہوا کہ اونٹ کتنی بڑی چیز تھی، اس کا ہم عجمی وہ تصور نہیں کر سکتے اور آج عربوں میں بھی وہ بات نہیں رہی، ان کے یہاں اونٹ بھی تلاش کرنے سے اب دیکھنے میں نہیں آتا ہے،۔ تو فرمایا کہ "ہم نے اونٹوں کو تمہارے لیے اللہ کے شعائر میں بنایا ہے" یعنی اللہ کی نشانیوں میں سے وہ ایک چیز ہے اور علامت ہے گویا، "لَکُم فِیھَا خَیرٌ" "تمہارے لیے اس میں بڑی خیر ہے، اب یہ اس طرح اور "یا عَلِی لأنْ یَھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلاً خَیرٌ لَکَ مِن حُمُرِ النَّعَم" اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے ایک آدمی کو بھی ھدایت دے دے تو "حمر النعم" سے بھی بڑھ کر ہے اور حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ جب حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ نے وہ واقعہ سنایا کہ آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امتحاناً ایک بات پوچھی جیسے پہیلی بجھائی جاتی ہے، بتاؤ وہ کون سا درخت ہے جو مسلمان سے بہت مشابہ ہے، اس کے پتے نہیں گرتے، وہ ہلاکت کا شکار نہیں ہوتا، ہر سال پھلتا ہے، تو "فَوَقَعَ النّاسُ فی شَجَرِ البَوَادِی" کہتے ہیں کہ لوگ جنگل کے درختوں میں جا پڑے اور پہیلی کا فلسفہ یہ ہے کہ جتنی روزمرہ کی چیز کو پہیلی بنا کر پوچھا جائے، اتنی ہی وہ مشکل ہوتی ہے، آدمی کا ذہن وہیں جاتا ہے کہ یہ کوئی بات پوچھنے کی تھوڑے ہوگی، پانی کی کوئی پہیلی بنائے تو "فوَقَعَ النّاسُ فی شَجَرِ البَوَادِی" لوگ جنگل کے درختوں میں پڑ گئے کہ وہ ہوگا یہ ہوگا، میرے دل میں آیا "وَوَقَعَ فِی نَفسِی أنَّھا نَخْلَۃٌ" میرے دل میں آیا کہ یہ کھجور کے بارے میں آپ پوچھ

رہے ہیں، اس لیے کہ کھجور کو کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ سامنے کی چیز ہے، آپ نے خود ہی فرمایا کہ کھجور ہے، تو حضرت عمرؓ سے جب یہ واقعہ فرمایا تو کہنے لگے کہ ارے ہمیں سرخ اونٹ مل جاتے تو ہمیں اتنی خوشی نہ ہوتی، جتنی تمہارے بتادینے سے، بیٹے کی کامیابی سے خوشی ہوتی ہے باپ کو کہ کیسا ذہین بیٹا ہے۔

تو اونٹ جو ہے یہ عربوں کی زبان میں ادب میں، تخیل میں، ضرب الامثال میں ہے ہم نے ان کو شعائر اللہ میں سے بنادیا ہے، تمہارے لیے اس میں بہت نفع ہے، بہت خیر ہے "فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيهَا صَوَافَّ" تم اس پر اللہ کا نام لو، اس کو کھڑا کر کے قطار میں بنا کر کے، اونٹ کو ذبح کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ پچھاڑا جائے بکرے کی طرح، گرنا بھی اس کا مشکل، بہت بڑا ہوتا ہے اور پھر وہ پڑا رہے یہ بھی مشکل ہے، تو جب کئی اونٹ ہوں، حضور ﷺ نے کئی اونٹ ذبح کیے، حجۃ الوداع میں، تو اس کا طریقہ یہ بتایا گیا کہ قطار در قطار کھڑا کر دیا جائے اور پھر اس پر چھری پھیری جائے اور وہ عرب جو ہیں قصائی وہی سب سے زیادہ واقف ہوتے ہیں، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ کس طرح اونٹ کو ذبح کیا جاتا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے سینے میں چھری ڈال دیتے تھے تمام خون بہہ جاتا تھا، خود گر پڑتا تھا، پھر اس کے بعد باقاعدہ اس کو ذبح کرتے تھے، "فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا" "جب وہ اس کے پہلو گر جائیں" اور وہ ٹھنڈا پڑنے لگے، "فَكُلُوا مِنهَا" یعنی وہ بالکل اس کی جان نکل جائے، "فَكُلُوا مِنهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ" "تو تم بھی کھاؤ اس میں سے اور اس کو بھی کھلاؤ جو اپنی جگہ پر بیٹھا نہیں ہے" مانگتا نہیں ہے "قَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ" اور سوال کرنے والے کو کھلاؤ جو بار بار مانگتا ہے، ہمیں بھی دیجیے، ہمیں بھی دیجیے اور پھر عربوں کو اونٹ کا گوشت پسند بھی بہت ہے، ہم لوگوں کو تو پورے طور پر ہضم بھی ہونا مشکل ہے۔ ہم نے امتحاناً ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں کھایا۔

" كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ" "اسی طریقے سے ہم نے اس کو تمہارے قابو میں دیا، تاکہ تم شکر کرو"۔

اللہ کے دربار میں صرف تقویٰ کی رسائی ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " لَنْ یَنَالَ اللّٰهُ لُحُومُهَا وَلَادِمَائُها" اب وہ قربانی اللہ کے لیے کی جاتی ہے، اللہ کا حکم ہے، اتنی تاکید ہے، اتنا ثواب ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز آسمان میں پہنچتی ہے کیا اور یہ بتائیں آپ کو کہ عیسائیت میں اور بعض مذاہب میں یہ تھا کہ جو قربانی کی جاتی ہے بعض بت پرستانہ مذاہب میں وہ دیوتاؤں تک پہنچ جاتی ہے اور دیوتا اس کا گوشت کھاتے ہیں اور اس کا خون پیتے ہیں، یعنی وہ اس سے لذت حاصل کرتے ہیں اور غذا حاصل کرتے ہیں، یہ ممکن ہے کہ ان کے ویدوں میں یا کسی چیز میں نکلے تو مل جائے "لَن یَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُها ولادِمَائُها" اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کے گوشت پہنچیں گے نہ ان کے خون پہنچیں گے،" ولٰکِنْ یَنَالُه التَّقوٰی مِنْکُم" اللہ کے یہاں جو چیز تمہاری پہنچنے والی ہے، وہ تمہارا تقوی ہے کہ اللہ کے خیال سے، اللہ کے حکم سے اس کی محبت میں تم نے یہ کیا" کَذٰلِکَ سَخَّرْنَا هَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُو اللّٰهَ عَلی مَاهَدَاکُمْ و بَشِّرِ الْمُحْسِنِیْن" "اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے اس کو مسخر کر دیا، تا کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو اور تکبیر کہو اس پر جس کی تمہیں اللہ نے هدایت دی اور نیکو کاروں کو بشارت دیجئے"۔

(۱) درس قرآن۔سورۂ۔حج:۳۵-۳۷، غیر مطبوعہ کے علاوہ مندرجہ حسب ذیل کتب سے اخذ و تلخیص کئے گئے ہیں: ☆ارکان اربعہ:۳۴۱-۳۴۲ ☆دعوت فکر وعمل:۲۵-۲۶

ذبح عظیم کی حقیقت اور اس کی مصلحت

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّي اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى، قَالَ يٰاَبَتِ افْعَلْ مَاتُؤْمَرُ، سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ، فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِيْنَ، وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يَّا اِبْرَاهِيْمُ، قَدْصَدَّقْتَ الرُّؤْيَاءَ. اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ، وَاِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلاءُ الْعَظِيْمُ، وَفَدَيْنٰاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ﴾(سورۃ الصفت: ۱۰۲-۱۰۷)

''جب وہ (بیٹا حضرت اسمٰعیلؑ) ان کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو کہا (حضرت ابراہیمؑ نے) میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، تم بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ انہوں نے کہا ابا جان! اس کو آپ کر گزریئے جس کا آپ کو حکم دیا جاتا ہے۔ مجھے آپ دیکھیں گے میں صابر ہوں۔ جب دونوں نے اپنے آپ کو حوالہ کر دیا اور ان کو پیشانی کے بل لٹا دیا تو ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ! تم نے خواب سچ کر دکھایا، بیشک ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں نیکی کرنے والوں کو اور بیشک یہ بہت بڑی آزمائش تھی اور ہم نے ان (اسمٰعیلؑ) کا فدیہ دیا ذبح عظیم سے''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے''فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ'' ''جب وہ بیٹا ان کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا'' واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے یہاں بڑی دعاؤں اور ارمانوں

کے بعد بیٹا ہوا، اس کا نام اسمٰعیلؑ رکھا انہوں نے، بیٹے سے باپ کا تعلق ہوتا ہے، وہ ہوتا ہی ہے، لیکن باپ سے بیٹے کا اس وقت تعلق بڑھ جاتا ہے اور اس میں بڑی طاقت پیدا ہو جاتی ہے، جب وہ اس سے زیادہ ملتا رہے، اس کے ساتھ زیادہ وقت گذارے اور اس کے ساتھ کچھ چلنے پھرنے لگے، یہ فطری بات ہے، جس کے ساتھ جتنا وقت گذرتا ہے اس کے ساتھ اتنا علاقہ ہوتا ہے، جب تک لڑکا ماں کی گود میں ہے اور ماں کی نگرانی اور کفالت میں ہے، وہی لٹاتی ہے، اٹھاتی ہے، بٹھاتی ہے، کھلاتی ہے، اس وقت تک ماں کا تعلق زیادہ ہوتا ہے باپ سے، باپ کسی کسی وقت دیکھتا ہے، باپ میں اور ماں میں تو فرق ہے، باپ گھر میں ہمیشہ نہیں رہتا اور بچے کی چارپائی کے پاس ہمیشہ نہیں رہتا، اس کمرے میں بھی ہمیشہ نہیں رہتا اور ہوسکتا ہے کہ اس گھر میں بھی نہیں رہتا۔

یہ حکمت ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی کہ کوئی لفظ قرآن مجید کا اعجاز سے خالی نہیں، "فَلَمَّا بَلَغَ مَعَه السَّعْيَ" جب بیٹا ان کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہوا، اب وہ گرویدگی پیدا ہوئی، ہر وقت دیکھنا، صورت دیکھنا اور پیار کرنا، پیار آنا اور اس کی بھولی بھولی باتیں سننا اور محبت کا جوش پیدا ہو جانا اور کبھی کبھی بچہ ساتھ جا رہا ہے، ابا ہم بھی چلیں گے، کبھی بازار کے لیے یا تھوڑے فاصلے کے لیے وہ بھی چلا، انگلی پکڑ کر چل رہا ہے، کبھی دامن پکڑ کر چل رہا ہے، اب اصلی تعلق پیدا ہوا، "فَلَمَّا بَلَغَ مَعَه السَّعْيَ" اب اس وقت "قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ" کس طرح ہوا، یہ بھی اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت تھی کہ صاف صاف وحی کے ذریعہ سے نہیں کہا گیا، بہت کم لوگوں نے اس پر غور کیا ہے، ایک صورت یہ بھی کہ وحی آتی کہ ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ کو قربان کرو، تو اس میں کوئی چارہ ہی نہیں، لیکن خواب کا معاملہ ایسا ہے کہ آدمی اس کی تاویل کرسکتا ہے، بھئی خواب تو خواب ہی ہے، لیکن محبت و عشق کا اظہار اور اخلاص کا جو اظہار ہے، وہ بالکل اللہ تعالیٰ کے سامنے سرافگندہ ہو جانا اور اپنے کو بالکل حوالے کر دینا اور اس کے ہر اشارہ کو حکم سمجھنا اور اس کے ہر ایماء کو نص سمجھنا، اس کا فرق سمجھتے ہیں؟ ہر ایماء کو اشارہ کی حلت میں اس کو بھی نص صریح سمجھنا، یہ بڑی محبت کو چاہتا ہے اور اطاعت کلی کو چاہتا ہے اور فدویت کو چاہتا ہے۔

تو اب دیکھئے کتنا مشکل موقع تھا، کہ ایک تو بیٹا ایسا کہ بڑی دعاؤں اور ارمانوں سے پیدا ہوا اور اس کو جدامجد ہونا ہے، نبی آخر الزماں کا اور سچ پوچھئے کہ حضرت ابراہیمؑ پر منکشف ہو گیا تھا کسی طریقے سے، کہ ''ہونہار برواکے چکنے چکنے پات''، تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ان کے چہرے کو دیکھتے ہی دیکھتے سمجھ گئے ہوں گے کہ ان کا نور پوری دنیا میں پھیلے گا اور سچ پوچھئے تو آج دنیا میں جو عقیدۂ توحید ہے اور جو دین حنیف ہے اور جو دین صحیح ہے وہ اس کی تاریخ حضرت ابراہیمؑ پر تو ختم ہوتی ہے، لیکن ابراہیمؑ کا جو بیٹا ہوا اسمٰعیلؑ (اسمٰعیلؑ یہ جدامجد ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے) ایسا ہونہار بیٹا ہے، تو معمولی لوگ سمجھ جاتے ہیں، ان کو کچھ نجابت کے، ہونہاری کے اور ترقی کے آثار نظر آتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام تو نبی تھے، تو امتحان کو دیکھئے ایک تو بیٹا وہ جو بڑی امیدوں کے بعد پیدا ہوا، بیٹا بھی وہ کہ دوسرے بھی دیکھیں تو ان کا تعظیم کرنے کو جی چاہے، گود میں لینے کا جی چاہے اور پیشانی کو بوسہ دینے کا جی چاہے، پھر وہ وقت آیا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ چلنے پھرنے لگے، اس وقت وہ پھر صاف صاف آواز نہیں آئی، فرشتے نے آکر نہیں کہا کہ آپ ان کو ذبح کیجئے، بلکہ خواب میں دکھایا گیا، دوسرا ہوتا تو کہتا کہ بھئی خواب کا کیا اعتبار ہے، خواب تو ہر طرح کے دکھائی دیتے ہیں، اتنا بڑا کام کہ بیٹے کو ذبح کرو، محض خواب کی بنا پر۔ بھئی یہ معاملہ تو عاشق کا سا، محبّ ومحبوب کا سا معاملہ تھا، یہ تو حضرت ابراہیمؑ اور اللہ کا معاملہ تھا، اللہ اور ابراہیمؑ کے درمیان جو تعلق ہے، وہ تعلق ہر دو کے درمیان نہیں ہوتا، پھر عجیب بات یہ ہے اس کی ایک ایک چیز اعجاز کی ہے، کہ ایسی بات جس کے ساتھ یہ عمل کرنا ہے، اس کو نہیں کہی جاتی، مثلاً کوئی کہے کہ آج ہمیں تمہیں مارنے کو جی چاہتا ہے، بہت دنوں سے میں نے مارا نہیں ہے، آج میرا مارنے کو جی چاہتا ہے، کوئی نہیں کہے گا اس کو، یہانتک کہ کسی طریقے سے اور اظہار کرنا وہ بھی ناگواری کا، وہ بھی ایک تجربہ کار استاد نہیں کیا کرتا، صرف یہ کہ استاد نہیں کہ پہلے تو یہ کہ خواب میں دکھائی دیا، خواب میں کیا چیز کہی جاتی ہے، آخری درجہ کی چیز کہ ذبح کرو۔

اور پھر ابراہم علیہ السلام اسمٰعیلؑ سے کہتے ہیں، ''یَا بُنَیَّ اِنِّی أَرَیٰ فِی الْمَنَامِ أَنِّی أَذْبَحُکَ'' میرے بیٹے، اس سے یہ بھی بات معلوم ہوئی کہ ابراہیمؑ سمجھ گئے یہ بچہ ہے،

جس کے ذریعہ سے عقیدۂ توحید اور دین خالص دین دنیا میں پھیلے گا، تو یہ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی، اس سے کہا جا سکتا ہے، اسی وقت اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا اس سے گھبرائے گا نہیں، یہ کسی تفسیر میں نہیں لکھا ہوا ہے، لیکن یہ خود آدمی اپنے قیاس و تجربہ سے سمجھ سکتا ہے، مگر حیرت کی بات ہے، اللہ اکبر کیسے کہا گیا ان سے "یَا بُنَیَّ اِنِّی أَرَی فِی الْمَنَامِ أَنِّی أَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَی" میں دیکھ رہا ہوں، بار بار میں دیکھتا ہوں، امام بخاری نے ترجمۃ الباب لکھا ہے، "رُؤیا الأنبیاءِ حَقٌّ" انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی وحی و حق ہوتا ہے، میرے بیٹے، لاڈلے میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، پھر اس کے بعد اس سے زیادہ آزمائش کی چیز حیرت ناک یہ کہ "فَانْظُرْ مَاذَا تَرَی" تم بتاؤ تمہاری رائے کیا ہے، یعنی اگر اس کو اس کا اطمینان نہ ہوتا کہ یہ فوراً سر تسلیم خم کر دے گا، تو تب یہ نہ پوچھتے، یہ ہم اپنے قیاس سے کہتے ہیں کہ ایسی بات جس کی نسبت خدا کی طرف ہو اور جس کا خدا کی طرف سے اشارہ ہو، اس میں آدمی مشورہ نہیں کیا کرتا۔ اس وقت مشورہ کرتا ہے، جب اس کو سو فیصد یقین ہو کہ وہ سر تسلیم خم کرے گا، اس میں اور کوئی امکان ہی نہیں ہے، "یَا بُنَیَّ اِنِّی أَرَی فِی الْمَنَامِ أَنِّی أَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَی" بیٹا عجیب بات ہے، میں خواب میں بار بار دیکھ رہا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں، "فَانْظُرْ مَاذَا تَرَی" بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟

"قَالَ یَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ، سَتَجِدُنِی اِنْشَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصَّابِرِین" ابّا جان مجھے تعجب ہے اتنے بڑے پیغمبر ہونے کے بعد پوچھتے ہیں، "یَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ" "ابا جان جس کا آپ کو حکم دیا جاتا ہے، اس کو آپ کر گذریئے" یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے، یہ تو کہنے کی بات ہی نہیں، " اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ " جہاں تک میرا تعلق ہے چونکہ مجھ سے پوچھا ہے اس لیے کہہ رہا ہوں، ورنہ اسے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، وہ آپ خود دیکھ لیتے وہاں کہ آپ نے پوچھا ہے میں کہہ رہا ہوں "سَتَجِدُنِی اِنْشَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصَّابِرِین" جہاں تک میرا معاملہ ہے آپ مجھے دیکھیں گے میں صابر ہوں۔

اس کے بعد وہ منیٰ گئے اور وہاں وہ جگہ ہے موجود (اللہ تعالیٰ آپ کو بھی دکھائے) متبرک، پاک جگہ، وہاں لڑکے کو لٹا دیا، معلوم نہیں ماں سے بھی کہا تھا کہ نہیں کہا تھا، بہر حال

بہلا کے اپنے ساتھ لے گئے، وہ تو بچہ تیار ہی تھا، کہا لیٹ جاؤ، لیٹ گئے اور چھری گلے پر رکھی تھی ارادہ کیا تھا، اب چلاتے ہیں چل نہیں رہی تھی، وہ چھری کند ہوگئی، چل نہیں رہی ہے، بالکل جیسے ایک موٹا سا لوہا ہو، وہ قلم ہو، کوئی لکڑی ہو، ان کو تعجب ہوا بھائی کیا بات ہے؟ وہاں سے آواز آئی "فَلَمَّا أَسْلَمَا" جب دونوں نے اپنے آپ کو حوالے کر دیا، یہ بھی دیکھئے سوچنے کی بات ہے، ایک نہیں چاہیے کہ دونوں جب کسی عمل کو، کسی عاقل و بالغ کے ساتھ دین کے تقاضے سے اللہ کے حکم سے کرنا ہو تو اس کا بھی مطیع و سرافگندہ ہونا ضروری ہے، ورنہ وہ مجبوری کی بات ہے "فَلَمَّا أَسْلَمَا" جب دونوں نے اپنے کو حوالے کر دیا، "وَتَلَّه لِلْجَبِيْن" ان کو پیشانی کے بل لٹا دیا کہ چہرے پر نظر نہ پڑے، یوں چھری نہیں چل سکتی، "وَنَادَيْنَاه يَاإِبْرَاهِيْم قَدْصَدَّقْتَ الرُّؤيَا" تو ہم نے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ تم نے خواب سچ کر دکھایا، ہمیں اسمٰعیلؑ کو ذبح کرانا نہیں تھا، اسمٰعیلؑ کے ساتھ جو محبت پیدا ہوگئی تھی اس میں یہ اس کا امکان تھا کہ خدا کی محبت کا ہمسر ہو، اس کو ذبح کرنا تھا، وہ ذبح ہوگئی، جب تم نے چھری رکھدی وہ محبت تو ذبح ہوگئی، اس لیے کہ اب اس میں کوئی کسر تو باقی نہیں رہی، یہ الگ بات ہے کہ اس کا نتیجہ نہیں نکلا، لیکن جہانتک بیٹے کو اللہ کے حکم سے قربان کرنے کا تعلق تھا، تم نے اس میں کوئی کمی نہیں کی، کوئی اس میں کسر نہیں رہی، اب یہ جو چھری کام نہیں کر رہی ہے، یہ ہمارے حکم سے کام نہیں کر رہی ہے، تو ہمیں اسمٰعیلؑ کو ذبح کرانا نہیں تھا، اس محبت کو ذبح کرنا تھا، جس کے متعلق دوسرا شبہ کر سکتا تھا، ہم نہیں، ہم تو عالم الغیب ہیں اور کسی طرز عمل سے یہ ظاہر ہو سکتا تھا، کہ تمہیں اسمٰعیلؑ سے ایسی محبت ہے کہ تم اوامر الٰہی کو اس پر قربان کر سکتے ہو، ان کو اوامر الٰہی پر قربان نہیں کر سکتے ہو۔

"اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِيْن" "یہ بہت بڑی آزمائش تھی" اتنی بڑی آزمائش شاید اس سے پہلے ہوئی ہو، "وَفَدَيْنَاه بِذِبْحٍ عَظِيْم" " اور ہم نے اسمٰعیلؑ کا فدیہ دیا ذبح عظیم سے" وہ "ذبح عظیم" اپنی جسامت کے لحاظ سے، اپنی قیمت کے لحاظ سے، اپنی شکل کے لحاظ سے، وہ ذبح عظیم اس لیے نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ جانور کو ذبح کر دو، لیکن "ذبح عظیم" اس لحاظ سے ہے کہ کوئی اس کی تعداد نہیں بیان کر سکتا ہے کہ اس کی

تقلید میں کتنے ذبح کئے جائیں گے، آج تک عید الاضحیٰ میں جو جانور ذبح کئے گئے ہیں، دنیا کا کوئی اعداد و شمار کا کوئی محکمہ اور کوئی بڑا سے بڑا مورخ اور کوئی بڑے سے بڑا ماہر حسابیات نہیں کہہ سکتا کہ کتنے کروڑ جانور ذبح ہو چکے ہیں اور کتنے ارب جانور ذبح ہو چکے ہیں، تو یہ ''ذبح عظیم'' اس لحاظ سے ہے کہ یہ قیامت تک رہے گا، اپنے دوام کے لحاظ سے بھی، اپنی تعداد سے بھی، یعنی کمیت کے لحاظ سے بھی، کیفیت کے لحاظ سے بھی۔ [1]

(۱) درسِ قرآن، سورۃ الانبیاء: ۳۴، ''وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا'' کے ضمن میں۔

احکامِ الٰہیہ کی تعمیل

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوْا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ. هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج: ۷۷-۷۸)

(ترجمہ: اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور خیر کا کام کرو، تاکہ تم کامیاب ہو اور اللہ (کے کام) میں کوشش کرتے رہو، جو اس کی کوشش کا حق ہے، اس نے تمہیں برگزیدہ کیا اور اس نے تم پر دین کے بارے میں کوئی تنگی نہیں کی)

اہل ایمان سے خطاب

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، " يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا " "اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو" یہ "آمَنُوْا" ماضی کا صیغہ ہے..... ہر لفظ پر غور کیجئے، قرآن مجید کا کوئی لفظ اتفاقی، یا بھرتی کا نہیں ہوتا، یہ کوئی شاعری نہیں ہے، فرمایا "يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا" اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو.......... یہ خطاب کس سے ہے؟ ایمان والوں سے ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ خطاب جب کسی خاص صفت کے ساتھ ہوتا ہے تو گویا وہ لوگ اس خطاب کے مستحق ہیں اور اس صفت کا وہ تقاضا اور شرط ہوتا ہے، مثلاً میں کہوں، اے پڑھے لکھے لوگو! اور اے پڑھے

لکھے انسانو، دیکھو کوئی غلط بات نہ ہونے پائے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان انسانوں کا یہ تقاضا ہے اور ان سے یہ بعید ہے کہ یہ اس قسم کی کوئی بات کریں، تو جب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "یَا أَیُّهَاالَّذِیْنَ آمَنُوْا" تو سب کے کان کھڑے ہو جانا چاہیے، کہ اہل ایمان کو خطاب ہے اور ضرور کوئی ایسی بات کہی جانے والی ہے جو ایمان کی تکمیل کے لیے شرط ہے۔

"اِرْكَعُوا وَ اسْجُدُوا" "رکوع اور سجدہ کرو"..... "تا کہ نفس میں خشوع وخضوع اور احساس ذلت کی کیفیت زیادہ پیدا ہو، سجدہ خدا کے قرب کی سب سے آخری شکل ہے اور خدا کو سب سے زیادہ محبوب و پسندیدہ ہے، حدیث صحیح میں آتا ہے "أَقْرَبُ مَا یَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ" "بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدے میں ہوتا ہے"۔

اپنے رب کی عبادت کرو

"وَ اعْبُدُوا رَبَّكُم" "اور اپنے پرودگار کی عبادت کرو"..... اس کو مالک مانو اور خالق مانو اور عبادت کے لائق مانو۔ اول تو عبادت کا مفہوم سمجھ لیں، عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ عبادت کا مفہوم ہے کسی کام کو اللہ کی خوشی کے لیے، اللہ کے حکم کے مطابق، اس کے رسولؐ کی تعلیم کے مطابق، اجر و ثواب کی لالچ میں کرنا، ہر وہ عمل جو اللہ کی خوشی کے لیے بلکہ اللہ کے حکم اور شریعت کی تعلیم کے مطابق اور اگر اس میں کوئی سنت ثابت ہے تو اس سنت کے مطابق اس کو ادا کرنا، اجر و ثواب کی امید پر اور اس پر جو وعدے ہیں ان پر یقین کے ساتھ انجام دینا عبادت ہے اور یہ بات ہر عادت کو عبادت بنا دیتی ہے اور یہ روح نکل جائے تو ہر عبادت خالی عادت اور محض رسم اور نفس کی پیروی رہ جاتی ہے"

"یہ عَبَدَ. یَعْبُدُ" کے معنی عربی میں "صَلّٰی.. یُصَلِّی" (نماز پڑھنے) کے نہیں ہیں، "یَصُوْمُ" (روزہ رکھنے) کے نہیں ہیں اور "یَحُجُّ" (حج کرنے) کے نہیں ہیں خالی، یہ سب چیزیں اس میں آجاتی ہیں، اللہ کی بندگی اللہ کے سامنے سر اطاعت خم کرنا اور اپنے کو اس کے حوالے (اسلام جس کا نام ہے) کر دینا، یہ عبادت ہے۔

"وَ افْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُم تُفْلِحُون" "اور نیک کام کرو، خیر کا کام کرو، تا کہ تم کامیاب ہو"۔

جہاد کا حق اور اس کے مراتب

"وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ" "اور اللہ کے راستے میں کوششیں کرو، جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے"۔

جہاد کی چار قسمیں ہیں: (۱) نفس سے جہاد (۲) شیطان سے جہاد (۳) کفار سے جہاد (۴) منافقین سے جہاد، اور چاروں قسم کے جہاد کے الگ الگ درجات و مراتب بھی ہیں حدیث میں آیا ہے: "مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِثْ نَفْسَهُ بِالْغَزْوِ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ" "جو اس حال میں مر جائے کہ اس نے جہاد نہ کیا ہو اور نہ جہاد کی تمنا اور ارادہ کیا ہو، وہ نفاق کے ایک حصہ پر مرے گا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ کامل وہ شخص ہے جو جہاد کے تمام درجات و مراتب کا جامع ہو"۔

جہاد صرف جنگ و قتال ہی پر (جو ضرورت کے وقت جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم اور افضل ترین مظہر ہے) منحصر نہیں ہے، بلکہ ہر وہ کوشش جو اعلاء کلمۃ اللہ اور دین کے غلبہ کی خاطر کی جائے جہاد ہے، حدیث پاک میں آتا ہے "سب سے افضل ترین جہاد ہے کہ ظالم بادشاہ یا ظالم حکمراں کے سامنے حق و انصاف کی بات کہی جائے" اسی طرح مسلمانوں کے لیے بالکل اس کی گنجائش نہیں ہے کہ اپنے ان دینی بھائیوں اور کمزور و مظلوم مسلمانوں کے حالات سے چشم پوشی اختیار کرلیں اور تغافل برتیں، جو دنیا کے کسی گوشہ میں ظلم و بربریت، ذلت و اہانت، تعذیب و ایذا رسانی اور طرح طرح کے سفاکانہ اور بہیمانہ مظالم کے نشانہ بنائے جا رہے ہوں اور ان کا قصور صرف اتنا ہو کہ وہ مسلمان ہیں بلکہ مسلمانوں کی یہ مجموعی ذمہ داری ہے کہ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں اور ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑنے والے ان مجرموں کو کم سے کم اپنی ناپسندیدگی، نفرت اور شدید بے چینی کا احساس دلائیں، کیونکہ آپ کا ارشاد گرامی ہے:۔

''مَنْ لَمْ يَهْتَمَّ بِأَمْرِ الْمُسْلِمِينَ فَلَيْسَ مِنْهُمْ''،'' مسلمانوں کے حالات کی جو شخص فکر نہ کرے، وہ ان میں سے نہیں''

''جَاهَدَ. يُجَاهِدُ'' کے معنی ہیں ''اپنی توانائی صرف کرنا''۔ ''جُهْدٌ'' کے معنی ہیں ''توانائی جو اصل طاقت ہے''۔ ''جَاهَدَ يُجَاهِدُ'' کے معنی ''مشقت برداشت کرنا اور اس پر صبر کرنا اور مقابلہ کرنا''۔ یہ سب ''جہاد'' میں آجاتا ہے! اس میں معمولی کوشش سے لے کر جہاد تک سب آگئیں، ''جب کوئی انسان کسی مقصد کے لیے تکلیفیں اٹھاتا ہے اور قربانیاں کرتا ہے، تو اس کی کیفیتیں اس کے اوپر پوری طرح طاری ہوجاتی ہیں اور اس کو صحیح لذت و حلاوت ملتی ہے''

....''جو لوگ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کوشاں رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر حکمت و ایمان اور فہم و بصیرت کے ایسے دروازے کھولتا ہے، جس کا انسان تصور بھی نہیں کرسکتا''۔

''جہاد جب اپنے شرائط، احکام و آداب کے ساتھ ہو، بڑے خیر و برکت کا سرچشمہ دنیا کے لیے سعادت اور پوری انسانیت کے لیے رحمت کا ذریعہ ہے''

''هُوَ اجْتَبَاكُمْ'' اور کیوں نہ کرو، یہ ایک دلیل کے طور پر ہے، کہ جب کسی آدمی پر کوئی انعام ہوتا ہے اور کسی کے ساتھ خصوصیت برتی جاتی ہے، تو اس پر ذمہ داری زیادہ ہوتی ہے، اس کی شرافت کا تقاضہ ہوتا ہے، اس کے تشکر کا تقاضا ہوتا ہے اور محسن کے احسان کا تقاضا ہوتا ہے تو کیوں اللہ کے راستے میں جہاد کا حق ادا کرو؟۔ ''هُوَ اجْتَبَاكُمْ'' اس نے تمہارا انتخاب کیا ہے۔ تمہیں تو شوق و ذوق سے اور بڑے والہانہ طریقے پر جہاد میں حصہ لینا چاہیے۔

دین آسان ہے

'' وَمَا جَعَلَ عَلَيكُم فِي الدِّينِ مِن حَرَجٍ'' ''اور تمہارے لیے اس دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی''، یعنی جہاد میں ایک طرح کا نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اب یہ وقت ہے کہ تم اس وقت کوشش کرلو ورنہ سارا دین جو تمہیں دیا تھا، اس میں کہیں تنگی نہیں تھی، تم سے ایسی نمازیں نہیں پڑھوائی گئی تھی جو ہو نہ سکیں اور جس کے لیے بڑی قربانی دینی پڑے، تم سے یہانتک کہ حج بھی ایسا نہیں کروایا گیا تھا کہ جس میں جان جانے کا خطرہ ہو، تو سارا دین تو

اس نے "إِنَّ هٰذَا الدِّينَ يُسرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أحدٌ إلّا غَلَبَه" "یہ دین آسان ہے، جو کوئی شخص دین میں سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا" اور جگہ جگہ قرآن مجید میں ہے، "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفساً إلّا وُسْعَهَا" "خدا کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا" اور "رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا" "اے ہمارے رب اور ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیے جس کی ہم کو طاقت نہ ہو" وغیرہ تو اس میں مطلب یہ کہ اس وقت تمہیں اللہ کے راستے میں محنت کرنے اور خطرہ مول لینے اور قربانی دینے کا تم کو حکم ہو رہا ہے، ورنہ اس نے تمہارے پورے دین میں کہیں حرج نہیں رکھا تھا، پورا دین "مِلَّةَ أبِيكُم إبرَاهِيم" یہ تمہارے دینی مورث اعلیٰ، تمہارے دینی گویا جد امجد جو ہیں، یہ ان کا دین ہے، یہ ان کی ملت ہے، ان کا دین ہے۔ [1]

(۱) (البقرہ ۲۸۶) درسِ قرآن سورۃ الحج: ۷۷-۷۸، غیر مطبوعہ۔

براہیمی محمدی تہذیب کی خصوصیات وامتیازات

﴿ مِلَّةَ أَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْم .هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْداً عَلَيْكُمْ. وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ. فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ. هُوَ مَوْلاَكُمْ. فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْر﴾ (سورة الحج: ۷۸)

ترجمہ: (تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت (پر قائم رہو) اس نے تمہیں مسلم قرار دیا ہے پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی، تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ ہوں اور تم (سب) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ٹھہرو، سو تم لوگ نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ ہی کو مضبوط پکڑے رہو، وہی تمہارا کارساز ہے، سو کیسا اچھا کارساز ہے اور کیسا اچھا مددگار)۔

براہیمی محمدی تہذیب

"مِلَّةَ أَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ" "دین تمہارے باپ ابراہیمؑ کا، اسی نے نام رکھا تمہارا مسلمان"

"ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رہنمائی اور تعلیم کے لیے اور اپنی اس ذات کی معرفت عطا کرنے اور اس کا صحیح تعارف کرانے کے لیے جو عقل و قیاس سے ماوراء ہے اور

جس کی کوئی مثال اور نظیر اس دنیا میں موجود نہیں، انبیاء علیہم السلام کے گروہ کو منتخب فرمایا، اپنے کلام اور پیغام کے ذریعہ پہلے ان کو، پھر ان کے ذریعہ اپنی مخلوق کو اپنی ذات وصفات کا صحیح اور مستند علم عطا فرمایا اور اپنے منشاء اور احکام اور زندگی گذارنے کے پسندیدہ طریقہ سے آشنا کیا"

پھر اس گروہ انبیاء میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی محبوبیت اور نسل انسانی کی امامت سے سرفراز فرمایا "قَالَ اِنِّی جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَاماً" (1) فرمایا اللہ نے (ابراہیمؑ سے) کہ میں کروں گا تجھ کو سب لوگوں کا پیشوا"۔

ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سراپا اسلام تھے، ان کی پوری سیرت بتاتی ہے کہ مجسم اسلام تھے یہ حضرت اسمٰعیل کی قربانی یہ اسلام ہی تو ہے، اسلام کے معنی ہیں حوالہ کر دینا، آج کی سیاسی زبان میں سرنڈر Surrender کر دینا، حوالہ ہو جانا، حوالہ کر دینا، ایک حوالہ کر دینا ہوتا ہے، حوالہ ہو جانا اس میں نہیں ہوتا۔ ایک حوالہ ہو جانا ہوتا ہے، حوالہ کر دینا نہیں ہوتا۔ لیکن اسلام میں حوالہ ہو جانا بھی ہے، حوالہ کر دینا بھی ہے، ہم بھی اسی کے ہیں، اور ہمارے پاس جو بھی ہے، وہ بھی اسی کا ہے، ﴿فَلَمَّا أَسْلَمَا وَ تَلَّه لِلجَبِین﴾ تو انہوں نے اپنے کو حوالہ کر دیا تھا۔ ابراہیم نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے اپنے کو حوالہ کر دیا تھا، اسمٰعیل نے ذبح ہونے کے لیے اپنے کو حوالہ کر دیا تھا۔

امامت ودعوت کی خصوصیت

"اس امامت ودعوت کی خصوصیت توحید خالص اور شرک، اصنام پرستی، مظاہر پرستی اور ہر مشرکانہ عقیدہ اور تخیل سے نفرت اور بیزاری ہے، قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ کے وہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں؟ جو انہوں نے اپنے زمانہ کے مشرکین سے کہے "اِنَّا بُرَآءُ وا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ کَفَرْنَا بِکُمْ ۔ وَبَدَا بَیْنَنَاوبینکُمُ العَدَاوَةُ وَالبَغْضَاءُ اَبَداً حَتّٰی تُؤمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ" (2) "ہم بے تعلق ہیں تم سے اور ان سے جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا، ہم انکاری ہوئے تمہارے مسلک کے اور کھل پڑی ہے ہم میں اور تم میں عداوت اور بیر یہاں تک کہ تم یقین لاؤ اللہ واحد پر" اپنے اور اپنی اولاد کے متعلق

(۱) البقرہ:۱۵ (۲) الممتحنہ:۱

ان کی تمنا اور دعا ان الفاظ میں منقول ہے "وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الأَصْنَامَ" "اور دور رکھ مجھ کو اور میری اولاد کو اصنام پرستی سے"۔

اب دنیا میں جہاں تک ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور قبولیت کا تعلق ہے، سیدنا ابراھیم ومحمد علیھما السلام کا وہی دور امامت ہے، عقائد بھی انہیں کے تلقین کئے ہوئے معتبر ہیں، ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات اور اس کی وحدانیت کا جو تصور اور عقیدہ انہوں نے تعلیم کیا ہے، وہی معیاری تصور اور صحیح عقیدہ ہے، اخلاق اور معاشرت اور تہذیب وتمدن کے جن طریقوں اور شعائر کو انہوں نے اختیار کیا وہی خدا کے نزدیک صحیح اخلاق وتہذیب اور پسندیدہ اور مقبول معاشرت ہے، انہیں کی پسندیدگی اور میلان کو خدا نے پسند کیا اور دوسروں کی پسندیدگی اور میلان پر ترجیح دی اور اس پر اپنی تصدیق اور پسندیدگی کی مہر لگادی، جس چیز کی انہوں نے پابندی کی اور جس کی طرف ان کی فطرت سلیم ہمیشہ کے لیے مائل ہوگئی، اسی کو خدا نے آخری دین کا شعار اور ہدایت یافتہ انسانوں کی تہذیب قرار دیا، اسی کو کبھی حدیث کی زبان میں "خصال فطرت" سے اور شریعت کی اصطلاح میں "سنت سے" تعبیر کیا جاتا ہے، انسان کے دونوں ہاتھ اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، لیکن داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر کیوں فضیلت ہے؟ اور اچھے کاموں میں اس کے استعمال کرنے کی کیوں ہدایت ہے؟ اس لیے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے اور ابراہیمی اور محمدی تہذیب کا شعار ہے، اسلامی معاشرت اور تہذیب میں جن چیزوں کو مسنون ومستحب اور اسلامی شعار قرار دیا گیا ہے، غور کرنے کے بعد ان سب کی حقیقت یہی نکلے گی کہ یہ انبیاء علیہم السلام کا شعار اور ابراہیمی تہذیب کی علامت ہے"۔

مستند نام "مسلم" ہے

"لہٰذا! ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے بعد سے انہیں کا دور امامت اور پیشوائی ہے، اور دور ابراہیمی قیامت تک قائم رہے گا، اسی دور ابراہیمی کے آخری پیغمبر (محمد رسول اللہ ﷺ) اور اس دور کی آخری دینی امت (مسلمان) ہیں "مسلمانوں کو خطاب کر کے صاف کہا گیا ہے:

"هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ" "اس نے تم کو پسند کیا اور نہیں رکھی دین میں تم پر کوئی مشکل "مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِي هٰـذَا" یہ دین تمہارے باپ ابراہیمؑ کا ہے، اس سے پہلے بھی انہوں نے تمہارا نام مسلم رکھا، "وَفِي هٰذَا" اوراس دین میں جب اللہ کے آخری نبی ورسول محمد ﷺ آئے تو انہوں نے بھی تمہیں اسلام ہی کا نام دیا، حضرت ابراہیم کے اقتداء میں، وراثت میں " هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِي هٰذَا " "اس نے تمہارے لیے وہی دین تجویز کیا جو تمہارے باپ ابراہیمؑ کا تھا اسی خدا نے اگلی کتابوں میں پہلے سے تمہارا نام مسلمان رکھا اور اس قرآن میں بھی" حالانکہ "مسلمانوں کو اپنے پیغمبر (محمد ﷺ) کی ذات گرامی سے جو عشق و شیفتگی اور جو عقیدت اور محبت ہے، وہ دنیا میں ضرب المثل اور مذاہب واقوام کی تاریخ میں بے مثال ہے، اسی طرح گہوارۂ اسلام عرب کی سرزمین اور اس کے دو محبوب شہروں مکہ اور مدینہ سے جو روحانی اور ذہنی وابستگی ہے، وہ بھی محتاج تشریح نہیں، لیکن اپنے تعارف اور امتیاز کے باوجود انہوں نے ان محبوب مرکزوں میں سے کسی کی طرف نسبت کو اپنے نام کا جز اور اپنا قومی نام نہیں بنایا اور ہر دور میں صرف "مسلم" ہی کہلائے۔

"لہذا مسلمان کا مستند نام "مسلم" اور اس ملت کا نام "امت مسلمہ" ہے، جس کے معنی خدا کے فرمانبردار یا اسلام کے پیرو کے ہیں۔

امت اسلامیہ کا منصب ومعیار اور اس کی ذمہ داری

" لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْداً عَلَيْكُمْ" "...... اور یہ اس لیے تمہارے اوپر ذمہ داری ڈالی جارہی ہے" تاکہ رسول تمہارے اوپر گواہ بنے" اور کل قیامت کے دن گواہی دیں کہ انہوں نے حق ادا کیا اور گردن کٹانے اور جان دینے میں ان کو دریغ نہیں ہوا۔

" وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" "اور تم لوگوں کے لیے نمونہ بنو اور گواہ بنو"۔

"امت اسلامیہ آخری دینی پیغام کی حامل ہے اور یہ پیغام اس کے تمام اعمال اور حرکات وسکنات پر حاوی ہے، اس کا منصب قیادت و رہنمائی اور دنیا کی نگرانی واحتساب کا

منصب ہے، بہت قوت اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے "وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" تاکہ تم دنیا کے انسانوں پر گواہ بنو، "تم کو دنیا کی قوموں اور انسانی گروہوں پر نگراں اور اتالیق مقرر کیا ہے اور تم ان پر مامور ہو، کہ ان کی رفتار سیرت و اخلاق اور رجحانات کا جائزہ لیتے رہو، جو راہ راست سے منحرف ہو جائے، اس کو صراط مستقیم پر لائیں، جو اعتدال سے بڑھ جائے، اس میں اعتدال پیدا کریں، کجی کو دور کرتے رہیں، رخنوں کو بھرتے رہیں، کمزور کو طاقتور سے اس کا حق دلائیں، مظلوم کا ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں انصاف و امن قائم رکھیں"۔

........تم کو "شُهَدَاءَ عَلَى الأَرْضِ" بنا کر بھیجا گیا ہے، تمہیں اپنے گھر تعمیر کرنے کے لیے، اپنی دکانیں، اپنی تجارتیں کامیاب کرنے کے لیے، اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا، تم "شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" (لوگوں کے لیے گواہ اور نمونہ ہو) اور اس کا معیار اور اس کی جانچ کیا ہے؟ "لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ" تاکہ رسول تمہارے لیے گواہ بنے، حیات طیبہ مبارکہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے اوپر شہادت کا جو فرض انجام دیا اور وہ جس درجہ کے تم پر شاہد تھے، اس کے شایان شان تم امتوں کے سامنے شہادت دو"۔

"فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ" نماز کے پابند بنو، نماز کو قائم کرو، نماز میں ایمان اور دین کی حفاظت اور اللہ تعالیٰ سے تعلق، دائرہ اسلام میں رہنے اور جماعت مؤمنین میں شمولیت کی حفاظت و سلامتی کا راز پوشیدہ ہے۔

"وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" اور زکوٰۃ دو، زکوٰۃ کی روح خدا کا خوف اور اطاعت، اس کی رضا جوئی، فقراء کے حال پر غمخواری، دل کی نرمی، اخلاص اور اغراض سے آزادی ہے۔

"وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ" اور اللہ (کی رسی) کو مضبوط پکڑ لو"۔

"هُوَ مَوْلَاكُمْ، فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِيرُ" "وہ تمہارا کارساز ہے اور مختار کل ہے اور بہترین مختار اور کارساز اور بہترین مددگار ہے"۔

(۱) درس قرآن سورۂ حج: ۸۔۷، کے علاوہ مندرجہ اقتباسات حسب ذیل کتب سے باختصار و تلخیص ماخوذ ہیں: ☆ تکبیر مسلسل: ۷۔۱۷۷ ☆ تکبیر مسلسل: ۸۔۱۷۸ ☆ کشمکش: ۸۔۲۷۸ ☆ عروج و زوال کا اثر: ۱۴۵ ☆ تحفۂ پاکستان: ۲۷۔

ملتِ ابراہیمی

مکمل دین، مستقل تہذیب

﴿وَمَنۡ يَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ، وَلَقَدِ اصۡطَفَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا، وَاِنَّهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ، وَاِذۡ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ، قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ (سورة البقرة: ۱۳۰-۱۳۱)

''اور ملت براہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو اور ہم نے ان (ابراہیم) کو دنیا میں (عہدۂ رسالت کے لیے) منتخب کیا اور وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جب کہ ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ تم اطاعت اختیار کرو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العلمین کی''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''وَمَنۡ يَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ'' (جو کوئی حضرت ابراہیمؑ کے مذہب سے حکم عدولی کرے گا) یہ ''وَمَنۡ يَّرۡغَبُ'' دیکھئے الفاظ کی طاقت اور الفاظ کا محل استعمال اور اس کی وسعت اور تنگی یہ سب اہلِ زبان (اہلِ زبان بھی معمولی نہیں بلکہ زبان میں تبحر رکھنے والوں میں) سے سمجھ میں آتی ہے اور وہی ان کی قدر کرتے ہیں۔ قرآن مجید کا ہر لفظ ایک مستقل معجزہ ہے اور یہاں پر بہت سے لفظ استعمال کئے جاسکتے تھے کہ جو شخص

عربی سے واقف ہے اور اس کا ذوق رکھتا ہے اور جس نے عربوں (معمولی عربوں سے بھی نہیں بلکہ بڑے عربوں سے جو لوگ عربی کا ذائقہ رکھتے تھے ان) سے عربی حاصل کی ہے، وہ اس لفظ کی عمومیت اور اس کی طاقت کو سمجھ سکتے ہیں، عربی زبان کے دس لفظ یہاں بولے جا سکتے تھے بلکہ بیس لفظ بولے جا سکتے تھے "ینحرف عن ملة ابراهيم، يعدل عن ملة ابراهيم، يذهب عن ملة ابراهيم، ينكر عن ملة ابراهيم، يرتد عن ملة ابراهيم" لیکن "يَرْغَبُ" کا لفظ بہت ہی جامع اور وسیع اور بڑا ہی ذمہ دارانہ ہے، جو حضرت ابراہیمؑ کے مذہب سے بے رغبتی کرے گا حکم عدولی اور انحراف کرے گا۔ ہے تو "رَغِبَ" لیکن نفی کے معنیٰ ہوتے اس کے، اگرچہ "رَغِبَ" اثبات ہے لیکن اس میں نفی اثبات دونوں شامل ہیں، "رَغِب" "عن" کے ساتھ جب آئے گا تو معنی ہوگا "انحراف کرے گا" اور "رَغِب" "الی" یا "فی" کے ساتھ جب ہوگا تو اسکے معنی ہیں "دلچسپی کے" "عمل کرے گا" تو یہ قرآن مجید کلی حیثیت سے بھی معجزہ ہے، جزئی حیثیت سے بھی معجزہ ہے، ایک ایک لفظ اس کا ایسا ہے کہ اس کا بدل نہیں ہوسکتا تو "وَمَن يَّرْغَبُ عَن مِّلَةِ اِبْرَاهِيْمَ" اور جو حضرت ابراہیم کی ملت سے بے رغبتی کرے گا اور "ملت" کے اندر دین، تہذیب، تمدن، معاشرہ سب آ گیا، حضرت ابراہیمؑ کا دین ہی اللہ کو پسند نہیں ہے اور وہ معیار ہی صرف۔ بلکہ اس دین کے ذریعہ سے جو تمدن قائم ہوا۔ اس لیے کہ تمدن قائم کرنے کے لیے کچھ بنیادیں چاہیے، کچھ عقائد چاہیے، کچھ مسلمات چاہیے، تب تمدن قائم ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ یہ ایک اچھی چیز ہے، یہ اجتماعی چیز ہے، یہ اخلاقی چیز ہے، اعتدال اچھی چیز ہے، نماز اچھی چیز ہے، ریاکاری اچھی چیز نہیں ہے، مظاہرہ کرنا اپنی شان وشوکت دکھانا اچھی چیز نہیں ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین میں تمدن بھی شامل ہے، صرف ان کے بتائے ہوئے عقائد کا ماننا ہی مقصود و مطلوب نہیں ہے بلکہ ان کی تہذیب، ان کا طرز زندگی، ان کے اخلاق وعادات، ان کی تمام پسندیدہ چیزوں کو اور ان کے عقائد اور خصوصیات کو اپنانا اور ہر ہر چیز میں ان کی تقلید واتباع کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

سیدنا ابراہیمؑ کی شخصیت

حضرات انبیاء علیہم السلام نے صرف عقیدہ وشریعت اورصرف ایک نئے دین، اسلام، ہی کی دعوت نہیں دی، بلکہ وہ تہذیب وتمدن اور نئے طرزِ حیات کے بھی بانی ہیں، جو"ربانی تہذیب" کہلانے کی مستحق ہے، اس تہذیب کے کچھ مخصوص وارکان اورشعائر وعلامات ہیں جن کے ذریعہ دوسری تہذیبوں اور جاہلی تمدنوں سے نمایاں طور پر ممتاز ہوجاتی ہے، یہ امتیاز روح اوراصل واساس میں نمایاں ہوتا ہے اورتفصیلات ومظاہر میں بھی۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ اس خدا پرست تہذیب کے بانی وامام تھے۔اللہ تعالی نے آپ کوشرک کی نجاست سے بچایا، بت پرستی کی نجاست سے بچایا، اوہام پرستی کی حماقت سے بچایا۔اپنے جیسے انسانوں کواپنا معبود، اوراپنی قسمت کا مالک سمجھنے کی جہالت سے بچایا، آپ کے دماغ کوروشن کیا، آپ کے دل کوروشن کیا، آپ کی آنکھیں کھولیں، آپ کواتنی سمجھ عطا کی کہ آپ سمجھیں کہ عبادت کا مستحق کون ہے؟ بندگی کا مستحق کون ہے؟ خوف کا مستحق کون ہے؟ کس سے ڈرنا چاہیے؟ کس سے امید رکھنی چاہیے؟ کس سے دعاء کرنی چاہیے؟ کس سے نذرونیاز اورمنت مانگنی چاہیے؟ کس سے اپنی مرادیں مانگنی چاہیے؟ کون بحروبر کا مالک ہے؟ کس کا سکہ خشکی اورتری پر رواں ہے؟ کون ہواؤں کا مالک ہے؟ کون بادلوں کا مالک ہے؟ کون روزی کا مالک ہے؟ کون قسمت کا مالک ہے؟ ابراہیمؑ (اوران کے ساتھ سارے پیغمبروں پر اللہ کا درودوسلام ہو) کہ انہوں نے دنیا کے سامنے خالص توحید پیش کی، ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام ساری دنیا کے بتکدے میں جب ساری دنیا میں اللہ کو چھوڑ کر سب کی پرستش ہورہی تھی، وہ اللہ کا مستِ توحید بندہ، مستِ معرفت بندہ، مست یقین بندہ کھڑا ہوا، ساری دنیا سے باغی، ساری دنیا کے طلسمات سے باغی، ساری دنیا کے عقائد سے باغی، ساری دنیا کے مذاہب سے باغی، سارے خداؤں کی خدائی سے باغی، اکیلا یہ مرد خدا کھڑا ہوا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس صفت وکیفیت کو اللہ تعالی نے قرآن مجید میں یوں بیان کیا ہے۔

"اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتاً لِلّٰهِ حَنِيْفاً وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. شَاكِراً لِاَنْعُمِهٖ اِجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. وَاٰتَيْنَاهُ فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِيْنَ. ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" (۱)

"بے شک ابراہیم بڑے مقتدا اللہ کے فرماں بردار اور اس کی طرف یک رخ رہنے والے تھے، اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اللہ کی نعمتوں کے بڑے شکر گزار، اللہ نے ان کو چن لیا تھا، اور انہیں سیدھی راہ پر ڈال دیا تھا، اور ہم نے دنیا میں بھی بھلائی دی تھی اور آخرت میں وہ تو صالحین میں ہیں ہی پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ ابراہیمؑ کے طریقے پر چلیے جو بالکل یک رخ کے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے"۔

ابراہیمؑ اپنی ذات سے ایک تھے۔ لیکن ایک پوری نسل کے بانی، ایک پورے عہد کے بانی ایک پوری تاریخ کے بانی، انسانیت کے نئے دور کے بانی، تمدن کے نئے دور کے بانی، ساری مذہبی اقوام کے مورث اعلیٰ اور بانی، توحید کے داعی، وہ ایک تخم تھے، تخم دیکھنے میں ایک، لیکن سارا کھیت اس تخم کا نتیجہ، دانہ ایک لیکن سارا باغ اس ایک دانہ کا نتیجہ، ایک قلم دیکھنے میں ایک، گننے میں ایک، لیکن سارا درخت، اپنی پوری شاخوں، پتیوں اور پھولوں کے ساتھ اس کا شرمندۂ احسان، اسی طرح ابراہیمؑ ایک تھے، لیکن ایک پوری دنیا تھے، ابراہیمؑ ایک تھے۔ (سورۃ النحل: ۱۲۰-۱۲۳)

لیکن پوری ایک نوع تھے۔ پوری ایک قسم تھے۔ انسانوں کی ایک پوری قسم، انسانوں کا ایک پورا گروہ وہ اللہ کا بندہ سب سے پہلے دنیا میں کھڑا ہوا، جس وقت ساری دنیا میں شرک کا اور بت پرستی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا، بادشاہ پرستی کا، آتش پرستی کا، کواکب پرستی کا، انسان پرستی کا درخت وشجر وحجر پرستی کا سایہ اور اندھیرا چھایا ہوا تھا، اس وقت وہ اللہ کا بندہ اکیلا کھڑا ہوا اور اس نے کہا، "اِنِّیْ بَرِیْءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ" (سورۃ الانعام: ۷۸) ہم تم

سے بری اور بیزار ہیں اوران سب چیزوں سے جن کی تم عبادت اور پرستش کرتے ہو"وَجَعَلْنَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ" (سورۃ الزخرف:۲۸)اوروہ اس عقیدہ توحید کواپنے اخلاف میں قائم رہنے والی بات کر گئے تا کہ مشرک آئندہ بھی توحید کی طرف رجوع کرتے رہیں۔

اور پھراس توحید کوآئندہ آنے والی نسلوں کے لیے امانت چھوڑ گئے کہ وہ اس توحید کی طرف آئیں، ساری دنیا سے اس اصل کی طرف آئیں یہ مرکز ہے انسانوں کا اس مرکز کی طرف رجوع کریں، یہ ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا احسان ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے کہ ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کی دعوت میں ان کی ندامیں، ان کی کوشش اوران کی محنت میں ہم نے بہت بڑی برکت عطا فرمائی۔قرآن مجید کے الفاظ ہیں۔

"وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِيْنَ. سَلَامٌ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ. كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ"(سورۃ الصافات:۱۰۸-۱۱۰)

اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات رہنے دی کہ ابراہیم پر سلام ہو، ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کی یادگار باقی رکھنے کا فیصلہ کیا، ہم نے کہا ابراہیمؑ پھلیں گے، پھولیں گے، اور پھلتے پھولتے ہی چلے جائیں گے، انہوں نے جو درخت لگایا ہے یہ درخت کبھی خشک نہیں ہوگا، انہوں نے جو چشمہ جاری کیا ہے، کبھی اس کا پانی زمین میں جذب نہیں ہوگا، پھیلتا ہی چلا جائے گا، پھیلتا ہی چلا جائے گا، چنانچہ وہی چشمہ ہے جو برما تک پہنچا، ملابار، ملایا تک پہنچا، انڈونیشیا پہنچا، ہندوستان، فرنگستان تک پہنچا، چین تک پہنچا، ترکستان تک پہنچا، یہ دعوت ابراہیمی ہے جو ساری دنیا میں پھیلی، پھولی اور پھل لائی۔

"وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيْمَ" "اور جوحضرات ابراہیم کی ملت سے بے رغبتی کریگا" اس میں وہ تمدن اور تہذیب سب چیزیں ہیں۔اس کے اندر دین کے بنیادی عقائد بھی آجائیں گے۔عبادات بھی آجائیں گی۔اور طرزِ زندگی بھی آجائے گا۔اورکن چیزوں کو کرنا چاہیے۔ضروری سمجھنا چاہیے۔کن چیزوں سے بچنا چاہیے اورکیا طرزِ زندگی اختیار کرنی

چاہیے سب آجائے گا اور یہ بہت بڑی مسلمانوں سے غلطی ہوئی ہے تمام عالم اسلام میں خاص طور پر ہندوستان میں جہاں دوسرے مذاہب تھے کہ انہوں نے عقائد کو لیا، مثلاً توحید کو لیا اور معاد کا عقیدہ، بعث بعد الموت کا عقیدہ بھی لیا، رسالت کو بھی لیا، لیکن تمدن اور تہذیب حضرت ابراہیمؑ کی، حضور ﷺ نے جس تمدن اور تہذیب کی توثیق کی اور تجدید کی، دونوں باتیں کام کی ہیں کہ جہاں اذانیں بھی ہوتی ہیں۔ نمازیں بھی پڑھی جاتی ہیں، توحید کے قائل ہیں، لیکن اس میں پردہ نہیں ہے، یا مثلاً بڑوں کا احترام، چھوٹوں کا پاس لحاظ اور ان کا خیال رکھنا یا مثلاً عورتوں کے حقوق ادا کرنا، یا شرعی، عائلی قانون ہے اس پر عمل کرنا، میراث دینا، بہنوں کا بھی حق دینا، جائداد کا تقسیم ہونا اور جائداد میں سب کا شریک ہونا یہ سب چیزیں ہیں ان کو ضروری نہیں سمجھا بہت سے مسلمانوں نے اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا کھوٹ، بہت بڑی کمی واقع ہوتی ہے اور اس کا اثر صرف دین اور عقائد پر پڑتا ہے۔

اسلامی شریعت اور ابراہمی تہذیب

اب دنیا میں جہاں تک ہدایت اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور قبولیت کا تعلق ہے سیدنا ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کا ہی دور امامت ہے عقائد بھی انہیں کے تلقین کیے ہوئے معتبر ہیں ذات باری تعالیٰ اور اس کی صفات اور اس کی وحدانیت کا جو تصور اور عقیدہ انہوں نے تعلیم کیا ہے۔ وہی معیاری تصور اور صحیح عقیدہ ہے، اخلاق اور معاشرت اور تہذیب و تمدن کے جن طریقوں اور شعائر کو انہوں نے اختیار کیا وہی خدا کے نزدیک صحیح اخلاق و تہذیب اور پسندیدہ اور مقبول معاشرت ہے، انہیں کی پسندیدگی اور میلان کو خدا نے پسند کیا اور دوسروں کو پسندیدگی اور میلان پر ترجیح دی اور اس پر اپنی تصدیق اور پسندیدگی کی مہر لگادی جس چیز کی انہوں نے پابندی کی اور جس کی طرف ان کی فطرت سلیم ہمیشہ کے لیے مائل ہوگئی، اسی کو خدا نے آخری دین کا شعار اور ہدایت یافتہ انسانوں کی تہذیب قرار دیا، اسی کو کبھی حدیث کی زبان میں ''خصال فطرت'' سے اور شریعت کی اصطلاح میں ''سنت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، انسان کے دونوں ہاتھ اللہ کے پیدا کیے ہوئے

ہیں، لیکن داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر کیوں فضیلت ہے اور اچھے کاموں میں اس کے استعمال کرنے کی کیوں ہدایت ہے؟ اس لیے کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے وارابراہیمی اور محمدی تہذیب کا شعار ہے، اسلامی معاشرت اور تہذیب میں جن چیزوں کو مسنون ومستحب اور اسلامی شعائر قرار دیا گیا ہے، غور کرنے کے بعد ان سب کی حقیقت یہی نکلے گی کہ یہ انبیاء علیہم السلام کا شعار اور ابراہیمی تہذیب کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَمَن يَّرْغَبُ عَن مِّلَةِ اِبْرَاهِيمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ" اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کا مذہب سے حکم عدولی نہیں کرے گا۔ انحراف نہیں کرے گا مگر وہ جس نے کہ اپنے نفس کی جہالت کے راستہ پر ڈال دیا۔ "سفہ نفسہ" یہ بڑا جامع لفظ ہے کہ جس نے اپنے نفس کی پوری قدر نہیں کی اور اپنے نفس کو غلط راستے پر ڈال دیا اور یہ جامع اور عمیق لفظ ہے۔

"وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا، وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ" اور ہم نے اس کو دنیا میں بھی انتخاب کیا اور یہ عرض کریں گے کہ "وَمَن يَّرْغَبُ عَن مِّلَةِ اِبْرَاهِيمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ" اس کے اندر تمدن وغیرہ سب آجاتا ہے۔ اس کے لحاظ سے "ولقد اصطفیناہ فی الدنیا" بھی اس کی ایک دلیل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا تمدن، اس کا طرزِ زندگی اور ان کا اختیار وانکار ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی یہ سب پیمانہ جو ہیں ان کو کیوں اختیار کیا اختیار کرنا ضروری ہے اس لیے کہ "وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا" ہم نے ان کو دنیا میں بھی انتخاب کیا اور کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ تو آخرت کا معاملہ ہے، عقائد ہمارے وہی ہوں گے۔ ہم فرائض بھی ادا کریں گے۔ لیکن وہ کس طرح کھائیں، کیا نہ کھائیں، ہم اور دوڑ کر کھانا کھائیں، کھڑے ہو کر کھائیں اور پردہ ہو ہمارے گھر میں یا نہ ہوں اس کا کیا تعلق؟ تو فرمایا کہ نہیں یہ جو دنیا کی چیزیں ہیں انہوں نے کہا کہ ہم نے دنیا میں بھی ان کو انتخاب کیا یہ اعجاز ہے بالکل کہ کوئی شخص اگر کہے کسی زمانے میں بھی کہ یہ تو دنیا کی باتیں ہیں، آپ ہمیں ان کا کیوں پابند کرتے ہیں؟ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحب دین اور صاحب دعوت تھے یہ آخرت میں کام آنے والی چیز ہے، جو آخرت میں کام آنے والی

ہے ہم سب کریں گے نماز پڑھیں گے، عقیدہ توحید کا رکھیں گے، لیکن ہم کیا پہنیں، کیا نہ پہنیں، کیا کھائیں، کیا نہ کھائیں، کسی کے ساتھ کیا معاملہ کریں اور اس میں کیا موقف ہے؟ اس میں آپ ہم کو کیوں پابند کرتے ہیں؟ تو اللہ نے کہا کہ یہ دنیا کی بات ہے تو ہم نے دنیا میں بھی ان کا انتخاب کیا، ہم نے جب ان کو انتخاب کیا تو ان کا طرز رہائش، ان کا طرزِ معاشرت، ان کی زندگی، ان کے معاملات یہ سب ہمیں پسند ہیں، وہی معیار ہیں، جب ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پسند ہیں، ہمارے منتخب بندے، تو اب ان کی پوری تعلیم عقائد سے لے کر معاشرت تک ان کا نمونہ یہ سب ہمیں محبوب ہیں۔

"وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ" اور وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں ہیں" دونوں چیزیں آگئیں اور ہو آخرت میں اللہ کے نیک بندوں میں ہیں، تو ان کے دین پر عمل کرنے سے دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی صلاح حاصل ہوتی ہے، وہاں "اِصْطَفَيْنٰهُ" کا لفظ کہا، یہاں "لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ" کہا، ان کے اعمال کی جزاء اور وہاں جو ان کو جنت میں ملے گی جو انعام ملے گا وہ سب اس کے لیے "صالحین" کا لفظ کہا اور "اِصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا" یہ عام ہے کہ ہم نے ان کو دنیا میں پسند کیا تو ہمیں ان کی ہر ادا پسند ہے، ان کا سننا پسند ہے، ان ہنسنا پسند ہے، ان کا بیٹھنا پسند ہے، ان کو بولنا پسند ہے۔

تو یہ یاد رکھئے کہ دین صرف عقائد کا نام نہیں ہے، عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ تمدن کا بھی نام ہے، طرزِ زندگی بھی دین کے اندر آتا ہے، یہ کہ آدمی کہے کہ عقائد میں دین ابراہیمی کو اختیار کرے اور طرز معاشرت میں وہ برہموں کا طرز اختیار کرے، یا بدھوں کا طرز اختیار کرے یا عیسائی راہبوں کا طرز اختیار کرے، یا اسرائیلیوں کا نہیں، بلکہ ہمیں طرز زندگی بھی وہی اختیار کرنا چاہیے جو حضرت ابراہیم نے اختیار کیا تھا، اس لیے کہ ان کو دنیا میں "اصطفیٰ" حاصل ہے اور آخرت میں "صلاح" دونوں چیزوں میں، دنیا اور آخرت میں وہ اللہ کے مقبول ترین بندے ہیں، تو ہمیں بالکل اپنی زندگی کو ان کے سانچہ میں ڈھال دینا چاہیے، یہ ملت

ابراہیمی ہے، سنت ابراہیمی اور سنت مصطفوی، سنت محمدی ہے اور یہ جو ہے شریعت محمدی یہ بالکل پرتو ہے دین ابراہیمی کا اور طرز ابراہیمی کا۔

خدا کے موحد اور وفادار بندے

"اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ" اور جب کہا کہ ہم نے اُن کو دنیا میں انتخاب کیا اور آخرت میں وہ صالح بندوں میں ہیں۔ تو ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، چاہے زبان سے کوئی نہ کہے، بے ادبی سمجھے، کیا بات ہے؟ کیوں حضرت ابراہیم کو یہ مقام حاصل ہوا؟ اس کے لیے فرماتا ہے، ہر آیت کا دوسرے آیت سے ربط ہے۔

"وَاِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ" جب کہ ان سے ان کے رب نے کہا کہ اسلام لے آؤ، ایک خدا کے سامنے سر جھکا دو، اور ایک کے بن ہو جاؤ، انہوں نے کہا "اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ" میں نے سر جھکا دیا اور پورے طور پر مان لیا رب العالمین کو، اسلام کے معنی ہیں، انگریزی میں Surrender کرنا کہتے ہیں، ہم نے رب العالمین کے سامنے بالکل اپنے کو حوالہ کر دیا، اپنے اختیارات سے ہم بالکل سبکدوش ہو گئے، اختیارات سے منکر ہو گئے، اب اختیار صرف اللہ کا ہے، "اسلمت لرب العالمین" یہ بڑا جامع کلمہ ہے، اس کے اندر سب چیزیں آجاتی ہیں، اس کے اندر منکرات، اس کے اندر طرز زندگی اور معیار زندگی اور اقدار زندگی، اس وقت کے جو ذرائع ہیں کہ بے عزتی کن سے ہوتی ہے، یہ جو پوری زندگی کا جو ایک سانچہ بنا رکھا ہے دنیا پرست قوموں نے اور جن کا تعلق انبیاء علیہم السلام کے دین اور شریعت سے کٹ گیا، تو انہوں نے بالکل اپنی زندگی کا ایک نیا ڈھانچہ بنایا، عقائد سے لے کر رہائش تک اور یہ......... ہے بالکل پوری زندگی کو شریعت کے سانچہ میں اور انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں بالکل ڈھال دینا چاہیے اور اسلام کے معنی ہی یہی ہیں کہ دوسری چیزوں سے دستبردار ہو جائے اور اللہ کے حوالے کر دے، اسلام رب العالمین کو حوالہ کر دیا، حوالہ کرنا یہ ہوتا ہے کہ پھر اور ملکیت کا دعویٰ نہیں ہوتا اور اس میں کسی چیز پر فخر اور کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑیں یہ کچھ نہیں ہوتا بلکہ اب ہم جو اللہ کا حکم آئے گا ہم اس کو مانیں گے۔

اس سب کا مقصد اور پیغام یہ ہے کہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اور زندگی کی ہر منزل پر اس کو یاد رکھنا ہے کہ ہم ''ملت ابراہیمی'' اور ''امت محمدی'' کے فرد اور ایک مخصوص شریعت اور آئین و مسلکِ زندگی کے پیرو اور خدا کے موحد اور وفادار بندے ہیں، ہماری زندگی بھی اسی آئین و مسلک کی وفاداری میں گذرے اور یہیں موت بھی اسی حال میں آئے، ہماری موجود نسلیں بھی اسی راستہ پر گامزن ہیں اور ہماری آئندہ نسلیں بھی اسی صراطِ مستقیم پر جائیں۔ (۱)

(۱) مشترک اخذ و تلخیص: ☆ درس قرآن سورۂ بقرہ: ۱۳۰-۱۳۱ (غیر مطبوعہ) ☆ تحفۂ برما: ۴۶-۴۹ ☆ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین: ۱۲۱-۱۲۲ ☆ اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب: ۳۳ ☆ عصر جدید کا چیلنج: ۱۶-۱۷

عملِ صالح بشرط ایمان واحتساب مطلوب ہے

﴿ فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلاَ كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَ اِنَّا لَهُ كَاتِبُوْنَ ﴾ (الانبیاء: ۹۴)

''جو کوئی نیک کام کرے گا اس حالت میں کہ وہ صاحب ایمان ہے تو اس کی کوشش کی ناشکری نہیں کی جائے گی اور ہم اس کے لکھنے والے ہیں''۔

ایک عام قانون

ایک اصل اور ایک کلیہ کے طور پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ ''فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلاَ كُفْرَانَ لِسَعْيِهِ وَ اِنَّا لَهُ كَاتِبُوْنَ'' یہ اصول اور یہ کلیہ جو ہے، یہ حاوی ہے پوری تشریع پر، پوری انسانی زندگی پر، اعمال اور جزائے اعمال پر اور اندرونی محرکات پر، اسکی وسعت کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔

یہ آیت ایک مستقل معجزہ ہے کہ ''جو کوئی نیک کام کرے گا اس حالت میں کہ وہ صاحب ایمان ہے، تو اس کی کوشش کی ناشکری نہیں کی جائے گی''!

یہ شریعت الٰہی، آیات الٰہی، قانون سماوی اور فرائض وواجبات کے بارے میں ہے، لیکن اگر آپ دیکھئے گا تو ذرا نیچے اتر کر یعنی اس بلندی کے ساتھ نہیں تو یہاں مراد ہے اعمال، عقائد، عبودیت اور اطاعت اور شریعت پر عمل، لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور ثواب کی نیت

سے کام کرنا جو اصل ہے۔لیکن دیکھئے گا تو یہ ایک عام قانون ہے کہ "جو کوئی نیک کام کرے گا اس حالت میں کہ وہ صاحب ایمان بھی ہے تو اس کی کوشش کی ناشکری نہیں کی جائے گی" یعنی کوششوں کا محمود اثر، مشکور اثر قائم رہتا ہے۔

یہ پوری انسانی ترقی کی تاریخ اور نسل انسانی کے کارناموں کی، نسل انسانی کی کوششوں کی، نسل انسانی کی بہبودی اور اسکی فلاح اور اس کی سرسبزی کی پوری تاریخ جو ہے، اور علوم کی تحقیقات اور انسانی خدمات اور تعمیری کام اور انصاف ....ان سب کی تاریخ کا ماحصل یہ ہے کہ جو کوئی کوشش کرتا ہے اس کا نتیجہ نکلتا ہے اور ناشکری نہیں ہوتی ہے۔!

تو شریعت الٰہی کے بارے میں...کہ "جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کا کام کرے گا اس حالت میں کہ اس کے اندر ایمان بھی ہے"......یہ بہت اہم بات ہے، صرف شرائع الٰہی اور وحی سماوی ہی نے اس پر زور دیا ہے، ورنہ عام اخلاقی تعلیمات اور مصلحین کے کاموں میں یہ مرکزی نقطہ نہیں ہے، وہاں تو یہ ہے کہ اچھا کام کرو، کچھ بنادو، رفاہ عام کا کوئی کام کردو، سرائے تعمیر کرلو، کنواں کھوددو، تالاب بناؤ، مسافر خانہ بناؤ، اسپتال بناؤ، یتیم خانہ بناؤ...... اس میں ان کے نزدیک یہ شرط نہیں ہوتی کہ اس میں اللہ کی رضا مطلوب ہو اور اخلاص ہو۔!

لیکن انبیاء علیہم السلام جب کہتے ہیں تو اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ اس میں اللہ کی رضا مطلوب ہو......جب جاکر اس میں حقیقت پیدا ہوتی ہے،......کوئی عمل اللہ تبارک وتعالیٰ کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا اور اس کی اس میں کوئی حقیقت، کوئی قیمت نہیں ہے، جب تک کہ اس میں رضائے الٰہی مطلوب نہ ہو۔

جذبہ ایمان واحتساب

اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ "مَنْ صَامَ رَمْضَانَ اِیْمَاناً وَ اِحْتِسَاباً غُفِرَ لَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ" فَمَنْ قَامَ لَیْلَۃَ الْقَدْرِ اِیْمَاناًوَاِحْتِسَاباً غُفِرَ لَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ (متفق علیہ)....اس میں شرط لگائی کہ روزہ جو ایک خالص عبادت کی چیز ہے، اس میں آدمی کو قربانی کرنی پڑتی ہے، اسکے ساتھ بھی کہ....."جو روزہ رکھے اللہ پر یقین کرتے

ہوئے اور اس کے اجر وثواب کے لالچ میں'' یعنی اس کا جو محرک ہو وہ ایمان ہو کہ اللہ کا حکم ہے، ہم کچھ نہیں جانتے، بس اللہ کا حکم ہے کہ روزہ رکھو اور اسی کی رضا کیلیے، اس کی خوشی کے لیے، ثواب کی نیت سے ہم کرتے ہیں، تو پھر: غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ'' اس کے پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے'' معلوم ہوا کہ جو کام ایمان واحتساب سے خالی ہے تو ''غُفِرَ له ما تَقَدَّمَ من ذَنْبِه'' کا اسکے ساتھ وعدہ نہیں ہے، مقبول نہیں ہے۔

ایسے ہی ''مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْر'' رات کو اٹھنا آسان نہیں ہے اور پھر ہر طبقہ کے آدمی کے لیے، ہر صحت کے آدمی کے لیے... لیکن جو شب قدر میں عبادت کے لیے اٹھے گا اس میں بھی یہ شرط لگادی گئی ہے کہ ''اِيمَاناً وَ احْتِسَاباً'' ایمان واحتساب کے معنٰی یہ ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور اس کے بتائے ہوئے اجر وثواب پر پورا یقین ہو اور وہ ان اعمال کو شوق وعظمت کے ساتھ انجام دے۔ اعمال کی قبولیت اور وزن میں اس کو بڑا دخل ہے، اس میں ایک بہت بڑی حقیقت بھی ہے، کہ ایک عمل کے محرکات صدہا ہو سکتے ہیں، اب یہ اعجاز ہے قرآن کا، تشریع کا....ورنہ ایک عمل کے اتنے محرکات ہو سکتے ہیں کہ آدمی احاطہ نہیں کر سکتا ہے۔(۱)

ایک آدمی سے اگر کہا جائے کہ تم سوچو کہ اس عمل کے مقصد کیا کیا ہو سکتے ہیں،

(۱) بعض مرتبہ تو ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے، کہ اچھا اس نیت سے بھی کام کیا جا سکتا ہے؟ جیسے ہماری ایک تقریر ریکارڈ تھی لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن پر اور ہم چلے گئے کوئٹہ کی طرف پاکستان کی سرحد کے قریب ہمارے بھائی ابو بکر حسنی نے وہ تقریر ریڈیو پر پڑھی، تو جس دن وہ پڑھی گئی اسی دن ہماری دعوت تھی۔ انگریزی فوج کے ایک بڑے مسلمان افسر کے یہاں جو غالباً بریلی کی طرف کے رہنے والے تھے۔ بہت اہتمام تھا، ہم تھے اور مولانا منظور نعمانی صاحب ان کے مہمان اور ان کے احباب تھے، ہمیں خیال بھی نہیں تھا اور ضرورت بھی نہیں تھی وہ تقریر سن کر آئے تھے، ان کے یہاں ریڈیو تھا، معلوم ہوا کہ ہماری تقریر تھی، انہوں نے کہا کہ مولانا آپ نے بڑی اچھی تقریر کی، بڑے کام کی بات کی، لیکن ایک بات اس میں رہ گئی اور آپ نے اسی کا ذکر نہیں کیا، آپ نے روزے کے فوائد بتائے سب، ایک بات نہیں بتائی کہ افطار کرنے میں جو مزہ آتا ہے۔ وہ کسی کھانے میں مزہ نہیں آتا ہے، کسی دعوت میں مزہ نہیں آتا ہے اور میں بھی اسی لیے روزہ رکھتا ہوں، صاف کہدیا انہوں نے اور انہوں نے گویا ایک راز فاش کردیا، یہ تو خیر بعد کی بات ہے، لیکن ایک ایسی بات نکلتی ہے محرکات میں کہ جو نفسیات انسانی کی کارفرمائی ہے۔

؟ صبح سے شام تک سوچتا رہے، اس کے بعد جب وہ ایک آدمی بتائے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ تو آیا ہی نہیں تھا ہمارے ذہن میں، کہ یہ بھی ہوسکتا ہے اور یہ نظر آتا ہے، اخباروں سے بھی معلوم ہوتا ہے اور تقریروں سے بھی اور لوگوں کی ملاقاتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کس کس مقصد سے کام کئے جارہے ہیں اور کیسے کیسے نیک کام کئے جارہے ہیں.... لیکن مقصد صرف مثلاً اپنی پیشوائی یا اپنی قیادت یا اپنا استحقاق اور دوسرے مادی منافع ہوتے ہیں، تو اس میں شرط ہے "وَهُوَ مُؤمِنٌ" یہ شرائع الٰہی کی خصوصیت ہے اور کلام الٰہی کی، ورنہ کوئی مصلح کہتا تو کہتا "فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ فَلاَ كُفْرَانَ لِسَعْيِه" بس اسی پر ختم کردیتا، کہ جو نیک کام کرے گا اس کی کوشش کا اعتراف کیا جائے گا، ناشکری نہیں کی جائے گی۔

نبوت کا مزاج

تاریخ بھی بتاتی ہے اور مشاہدہ بھی بتاتا ہے کہ ایسا ہورہا ہے، لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں۔

جس طرح لوگ صدر جمہوریہ کا عہدہ حاصل کرلیتے ہیں اور وزارت عظمیٰ حاصل کر لیتے ہیں، نہ معلوم کیا کیا اور دولت کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں، تو بول رہا ہے یہ کلام کہ یہ خدا کا کلام ہے۔!

"وَإِنَّا لَهُ كَاتِبُوْنَ" .... "اور ہم اسکے لکھنے والے ہیں" کہ ابھی سے اس کے نامۂ اعمال میں لکھدیا گیا ہے کہ اس نے یہ کام کیا ہے، لیکن اسکے ساتھ (ضمناً ہم یہ کہتے ہیں) جہاں تک دنیاوی اثرات کا اور خدمت انسانی کا اور رفاہ عامہ کا تعلق ہے، یہ عمل "مِنَ الصَّالِحَاتِ" کا اثر بہر حال ہوتا ہے کوئی سبیل لگادو، چاہے تمہاری نیت ثواب لینے کی نہ ہو لیکن لوگوں کی پیاس بجھے گی، لوگ پانی پی سکیں گے، اپنی جگہ پر "فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ" ہے لیکن نبی تو یہ کہے گا کلام الٰہی تو یہ کہے گا "وَهُوَ مُؤمِنٌ"۔

لیکن مصلحین یہ کہہ سکتے ہیں کہ "فَلاَ كُفْرَانَ لِسَعْيِه" پورا معاشرہ، شہر کی آبادی سب شکرگذار ہوگی اور اسکی تعریف میں مضامین بھی چھپیں گے، زبان سے بھی لوگ کہیں گے اور دعائیں بھی دیں گے، لیکن شریعت الٰہی میں یہ ہے کہ کیسا ہی نیک کام ہو لیکن "ایمان" کی شرط ہے۔ ہمیں اس ایمان و احتساب کی طرف توجہ سب سے پہلے حضرت

مولانا الیاسؒ کی خدمت میں پہنچ کر ہوئی، سچی بات یہ ہے، ہم تو عربی پڑھاتے تھے اور لکھتے تھے، لیکن "اِیْمَاناً وَّ اِحْتِسَاباً" کے معنی انہوں نے جو بیان کئے کہ اللہ پر یقین رکھتے ہوئے اور اجر و ثواب کی لالچ میں احتساب کے معنی اجر و ثواب کی لالچ میں اتنے مختصر اور جامع معنی خود ہم نہیں کر سکے تھے اس وقت مولانا نے اسکی اور مثالیں دیں کہ کتنے آدمی جو وضو کرتے ہیں فرمایا کہ بالکل طبعی طریقے پر اور آجکل جو ٹونٹیاں چل گئیں ہیں اور نل لگ گئے ہیں مسجدوں میں اب تو اور بھی آسان ہے کہ جیسے مشین میں رکھدیا گیا ہو دھلا دھلایا نکل آیا ہو، ٹونٹی کھولی اور ہو گیا اور حدیث میں آتا ہے کہ "حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جس وقت (مومن) آدمی وضو کرتا ہے اور اپنا ایک ایک عضو دھوتا ہے تو اسکے جتنے گناہ ہوئے ہیں وہ سب پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ بہہ جاتے ہیں" (ترمذی) اب اسکے بعد جب منہ میں پانی ڈالا، کلی کی تو اس میں اگر کوئی غلط بات کہہ دی تھی یا اس کی گفتگو سے کسی کو تکلیف پہنچی تھی، دلآزاری ہوئی تھی، حقوق العباد کا تو معاملہ الگ ہے، کیونکہ ایسی چیزوں کو جو سہواً اور عادتاً ہوں گی، اس کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادے گا، آنکھ سے جو بدنگاہی ہوتی ہے، اسکا بھی تعلق گناہ سے ہے، وہ معاف کردی جائیگی، کانوں پر پانی پڑا، کان نے اگر کوئی غلط چیز سنی ہے اور اس پر اس کو کچھ لطف آیا ہے، تو فرماتے تھے (اور ان کے فرمانے سے معلوم ہوا) کہ واقعی کتنی بڑی دولت ہم ضائع کرتے ہیں، ایک وضو سے ہم کتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن اس لیے نہیں اٹھائیں کہ ہمارا ذہن حاضر ہی نہیں ہوتا، وہ خیال ہم پر طاری نہیں ہوتا کہ اب یہ ہو رہا ہے، اب یہ ہو رہا ہے، اللہ کے رسول نے، صادق و مصدوق نے فرمایا ہے کہ جب جو عضو دھلے گا تو اسکے پانی کے قطرے بہیں گے ان میں پانی کے ساتھ، پانی کے آخری قطرے کے ساتھ وہ سب بہہ گیا، جو اسکے اس عضو سے تعلق رکھتے تھے، ان کا وہ عضو اسکا سبب تھا، ان کا عامل تھا، وہ گناہ دھل جائیں گے، صرف وہ عضو ہی نہیں دھلیں گے، گناہ بھی دھل جائیں گے۔

تصحیح نیت

اسی طرح سے مولانا بڑی توجہ دلاتے تھے جو کام بھی ہو، اس میں نیت کو درست کرلینا

چاہیے اوراس بارے میں بڑی حیرت ہوتی ہے (کہنے کوتو بہت معمولی بات ہے) کہ معلوم نہیں کیا موقع تھا کیا سبب پیش آیا، سید احمد شہیدؒ نے فرمایا، معلوم نہیں کس عمر میں فرمایا، اس وقت چھیالیس سال کی تو حضرت کی عمر ہوئی، چھیالیس سال کی عمر میں شہادت ہوئی، اب معلوم نہیں چھیالیس کی عمر میں فرمایا کہ پینتس (۳۵) سال کی عمر میں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، شعور پیدا ہوا ہے، اس وقت سے اس وقت تک میں نے امورشرعیہ میں سے ہی نہیں امورطبعیہ میں سے کوئی کام بغیر نیت کے نہیں کیا، جس میں رضائے الٰہی کی نیت نہ ہو، کپڑا پہننا، کھانا کھانا، سونا، کسی سے اخلاق سے ملنا، کسی کو دیکھنے جانا، کوئی کام ایسا جو امورطبعیہ میں ہے، وہ بھی میں نے بغیر اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت کے اور بغیر ثواب کے ارادے کے نہیں کیا، بہت بڑی بات ہے، یعنی اس شخص کا درجہ کتنا بڑا ہوگا، کہ جو اس کے عادات بھی عبادات تھے، مجاہدات اسی سے عبادات بنتے ہیں اور اسکے بغیر عبادات عادات بن جاتی ہیں کوئی نماز اس لیے پڑھتا ہے اور کتنے لوگ ہوں گے جو کہہ دیں گے کہ بے تکلفی میں کہ بھئی ہم تو نماز اس لیے پڑھتے رہے کہ محلّہ ایسا تھا اور ویسے آدمی کیلیے بہت مشکل ہوتا ہے کہ نماز پڑھے بغیر وہاں رہے اور لوگوں سے ملے۔

پوری زندگی عبادت ہے

''یہ بعثت محمدی کا بہترین تحفہ اور اس کا بڑا احسان، اس کا یہ عالمگیر اعلان تھا کہ اعمال واخلاق کی اساسی دریافت ہی انسان کا مطلوب نصب العین ہے اور جسے شریعت نے ایک مفصل وبسیط مگر وسیع ومحیط لفظ ''نیت'' سے تعبیر کیا ہے۔

"اِنَّمَا الأعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِأ مَا نَوىٰ" ''اعمال کا دارومدار نیت پر ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا، جس کی اس نے نیت کی ہوگی'' ہر وہ کام جو انسان اللہ کی مرضی کے لیے خلوص کے ساتھ اور اس کے حکم کی بجا آوری کے خیال سے کرتا ہے، وہ اس کے لیے قرب الٰہی اور یقین کے اعلیٰ طبقات اور ایمان کے بلند درجات تک رسائی کا ذریعہ بنتا ہے اور یہی وہ دین خالص ہے، جس میں کوئی دنیوی شائبہ بھی نہیں ہوتا، اس میں ہر طرح کے کام داخل ہیں، مثلاً جہاد وقتال، حکومت وانتظام، دنیوی لذتوں سے استفادہ، طبعی تقاضوں کی تکمیل، روزی کی

طلب، جائز ومباح تفریح اور عائلی وازدواجی زندگی اور ہر عبادت اور دینی خدمت۔

اس کے برعکس یہی چیزیں اس وقت ''دنیاداری'' میں داخل ہو جاتی ہیں، جب ان میں رضائے الٰہی کی اور اس کے حکموں کی پیروی کی نیت نہ شامل ہو، بلکہ ان کا مقصود غیر اللہ اور اُن پر غفلت اور آخرت فراموشی کا پردہ پڑا ہو، ایسی حالت میں فرض نمازیں، ہجرت و جہاد ذکر و تسبیح بھی دنیاوی عمل بن جاتی ہیں اور ان پر عمل کرنے والے آدمی اور عالم ومجاہد اور داعی کے لیے وہ بجائے ثواب کے وبال جان اور اس کے اور خدا کے درمیان حجاب بن جاتی ہیں''۔

''مومن کی زندگی متفرق اور متضاد اکائیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ایسی وحدتِ کاملہ ہے، جس میں عبادت واحتساب کی روح کارفرما ہے، اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت کا جذبہ اس کی قیادت کرتا ہے، وہ زندگی کے تمام شعبوں اور جہد وعمل کے سارے میدانوں اور سبھی قسموں کو شامل ہے، بشرطیکہ وہ اخلاص، صدق نیت، رضائے الٰہی، اور انبیاء کے طریقے پر ہوں''۔

تو یہ ''مؤمن'' کی شرط ہے اسمیں (اگر اللہ ہمیں توفیق دے) کہ ہم جو عادتاً کام کرتے ہیں ان میں بھی تھوڑا سا ہم ذہن کو حاضر کرلیں اور کوشش کریں پھر اللہ تعالیٰ مدد فرمائے، پھر وہ اسکی عادت پڑ جائیگی، لیکن ابھی ذرا سوچنے کی ضرورت ہوگی کہ جو کام ہم راحت کیلیے کرتے ہیں، تفریح کیلیے کرتے ہیں، دوسروں کو خوش کرنے کیلیے کرتے ہیں، یا ضرورتاً کرتے ہیں، ان میں بھی کوئی نیت سوچ لیں کہ اس سے یہ ثواب ملے گا، ہم یہ نیت کر کے جارہے ہیں، مثلاً ملاقاتیں ہیں، اہل حقوق سے آدمی ملاقاتیں کرتا ہے، نہ جائیں گے شکایت ہوگی، ملامت کریں گے اور جی بھی چاہتا ہے ذرا بیٹھیں باتیں کریں، تفریح کریں، دل خوش ہو، نہیں نہیں، ان کا حق ہے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے، مسلمان مسلمان سے ملے، اور اپنے عزیزوں سے ملے، بزرگوں سے ملے اور بھی زیادہ نیت کر لی جائے اللہ ہمیں آپ کو سب کو توفیق دے، کہ ہم ایمان واحتساب کا اہتمام کریں، تاکہ عمل وزنی ہو، کیوں کہ خدا کے یہاں وہی عمل وزنی ہوتا ہے، جو ایمان واحتساب کے ساتھ ہو، عادتاً اور رواجاً، میکینیکل طریقہ پر عمل ہونا کچھ سودمند نہیں۔ (۱)

---

(۱) مشترک اخذ وتلخیص۔از: ☆درس قرآن، سورۂ انبیاء۔ع۔۷۔(غیر مطبوعہ) ☆ تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات: ۸۹-۹۰-و-۹۲

ایمان واعمال صالحہ کی جزاء اور رضائے الٰہی کی قیمت

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِینَ آمَنُوا وعَمِلُوا الصّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الاَنْہَارُ یُحَلَّوْنَ فِیْہَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَہَبٍ وَ لُؤْلُؤاً وَلِبَاسُہُمْ فِیْہَا حَرِیْر. وَھُدُوْا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَھُدُوْا اِلٰی صِرَاطِ الْحَمِیْد﴾ (الحج: ۲۳-۲۴)

”بیشک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، ایسی جنتوں میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، (اور) وہاں ان کو پہنائے جائیں گے سونے کے کنگن اور موتی اور وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا اور ان کو ہدایت کی گئی پاکیزہ کلام کی اور بتائی گئی خدائے حمید کی راہ“

اہل جنت کا اکرام

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الاَنْہَارُ﴾..... ”بیشک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا، ان

لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، ایسی جنتوں میں جنکے نیچے نہریں بہتی ہوں گی" ﴿يُحَلَّوْنَ فِيهَا أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَ لُؤْلُؤاً﴾ "ان کو زیور پہنایا جائے گا، کڑے ہوں گے سونے کے اور موتی"، ﴿وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ﴾ "ان کا لباس اس میں ریشم ہوگا"۔

یہ ہر جگہ کا لباس اور ہر جگہ کی زینت، اس مقام، زمانے اور ذوق کے مطابق ہوا کرتا ہے، تو یہ جو زیور ان کو پہنایا جائیگا، اگر ہم سوچیں آپ سوچنے لگیں، اپنے اوپر قیاس کریں اپنے زمانے پر قیاس کریں کہ مردوں کو کنگن پہنائے جائیں گے سونے کے اور موتی پہنائے جائیں گے، اول تو وہ سونے کے کنگنوں اور موتیوں کی شکل کوئی ضروری نہیں کہ انہی کنگنوں اور موتیوں کی طرح ہو اور وہ اسی نظر سے دیکھے جائیں، وہاں کا تو عالم ہی دوسرا ہو گا، وہاں ذہن ایسا بدل جائے گا، اللہ تعالیٰ نیا ذہن بنائے گا، نئ نفسیات ہوں گی، نئے معیار ہوں گے، نئے احساسات ہوں گے، تو وہاں کے تقسیم کو یہاں کے تقسیم پر اور وہاں کے قانون کو یہاں کے قانون پر قیاس نہیں کرنا چاہیے (۱)

یہ زبان میں جتنی گنجائش ہے، زبان جتنی چیز کی متحمل ہے یہ کہدیا گیا، اس کو "أَسَاوِر" کہا گیا، اس کو "لُؤلُؤ" کہا گیا، لیکن یہ اپنے مقام و محل اور ز ا نے اور وہاں کے عرف کے مطابق ہوگا اور وہ بالکل معیوب نہیں سمجھا جائیگا۔

(۱) خود دنیا میں موجودہ عہد میں بھی یہ حال ہے کہ ایک ملک میں ۔عرف کی بات ہوتی ہے، جس کو عرف کہتے ہیں، اس کا ترجمہ مشکل ہے، ایک چیز جو اس کے ساتھ ایک خاص تاثیر بن جاتا ہے، کہ یہ عرف تھا اسکے لیے، یہ عرف تو لباس بھی عرف ہی ہوتا ہے تو بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں مثلاً ہندوستان ہی نہیں ایشیا میں معیوب سمجھی جاتی ہیں، لیکن وہ مغرب میں معیوب نہیں، کچھ ہیں جو مغرب میں معیوب سمجھی جاتی ہیں، لیکن ایشیا میں معیوب نہیں ہیں اور ان کی شکلیں بھی ذرا مختلف ہوتی ہیں، بالکل اس کو یوں سمجھنا کہ وہ مرد ہوں گے اور کنگن ایسے ہی، جیسے مستورات کے، خواتین کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں، یہی کنگن ہوں گے، اسی شکل کے ہوں گے اور اسی طرح سے اتنے ہی بڑے ہوں گے اور ہاتھوں میں اسی جگہ پہنائے جائیں گے، یہ ہم جنت کی چیز کو اس دنیا کی چیز پر قیاس نہیں کر سکتے۔

یہ معیوب سمجھنا یہ بھی ایک عرفی چیز ہے، یہ نہ کوئی شرعی چیز ہوتی ہے اور نہ کوئی قانونی چیز ہوتی ہے اور نہ کوئی علمی چیز ہوتی ہے۔ (۱)

یعنی ہماری عرفی اور اصطلاحی زبان یہی ہے کہ ایک تو ان کی اس جگہ کی تعریف کی کہ باغات ہوں گے، نیچے نہریں بہتی ہوں گی، خاص کر عربوں کے لیے تو یہ بہت بڑی جنت ہے اور پھر یہ کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص اکرام کا معاملہ ہوگا اور ان کو اللہ تعالیٰ ممتاز بنائے گا۔

"وَ لِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ" اور یہ حریر جس کی یہاں ممانعت ہے مردوں کے لیے، وہ وہاں اس کی ممانعت نہیں ہوگی، یہ احکام شرعی جو ہیں وہ بہت سے مصالح اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت اور اس کی مرضی اور جو اس کے نتائج ہوتے ہیں، عقلی ونفسی نتائج ہوتے ہیں، ان کی بنا پر یہاں بعض ایسے احکام ہیں جو دنیا ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً مرد ریشم نہ پہنے اور ایسی اور کئی چیزیں ہیں یہ یہاں کی شریعت ہے، جنت میں ضروری نہیں کہ یہ احکام وہاں نافذ ہوں، وہاں کے دوسرے احکام ہوں گے، جو اہل جنت کو معلوم ہو جائیں گے۔

دین کا اصل موضوع رضائے الٰہی کی قیمت

آپ جانتے ہیں کہ اللہ کا یہ دین جو خدا کے پیغمبر اپنے اپنے زمانہ میں اور اشرف المرسلین وسید الاولین والآخرین، خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ آخری بار اور ہمیشہ کے لیے لے کر آئے، اس دین کا اصل موضوع ہے آخرت میں انسان کو اللہ کی رضا اور اس کے انعام سے سرفراز کرنا اور آخرت کی، ابدالآباد کی زندگی کو، ہمیشہ رہنے والی زندگی کو، کبھی نہ فنا ہونے والی زندگی کو پُر راحت نہیں پُر عشرت بنانا اور آخری ترقیوں تک اور ان نعمتوں تک جن کا تصور بھی اس دنیا میں ممکن نہیں ہے اور جن کے متعلق آتا ہے، کہ "نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی دل میں خیال گذرا" ان نعمتوں تک پہنچانا، اصل موضوع اس کا اس آخرت میں اس

(۱) مثال کے طور پر (کوئی برا نہ مانیں) بعض جگہ ایسی ہیں کہ وہاں لنگی پہنی جاتی ہے۔ پہلے عرب میں دستور تھا، اب ہمارے بھٹکل کے علاقے میں کوئی اسے عیب نہیں سمجھتے، یہ پورا مردانہ لباس ہے، لیکن کوئی اگر لکھنؤ میں لنگی باندھکر نکلے، امین آباد میں تو لوگ دیکھیں گے کہ کیا ہوا سوتے سوتے اٹھ کر آ گئے، بہر حال ہم نے یہ سمجھانے کے لیے کہا کہ وہاں خاص اکرام ہوگا اہل جنت کا، یہی طریقہ ہے۔

زندگی کے بعد کی زندگی میں راحت اور لذت، عزت اور دوام عطا کرنا، پھر "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" کا معاملہ ہوگا، یعنی نہ وہاں کوئی خوف ہوگا، نہ غم، خوف کیا ہے؟ آئندہ کا کھٹکا، کل کیا ہوگا؟ پیسہ نہ رہا تو کیا ہوگا؟! کوئی بیمار ہوگیا تو کیا ہوگا؟ کوئی عزیز مرگیا تو کیا ہوگا؟ کوئی حملہ ہوگیا تو کیا ہوگا؟ قحط سالی ہوئی تو کیا ہوگا؟ طوفان آگیا تو کیا ہوگا؟ کوئی ذلیل کرنے کے درپے ہوا تو کیا ہوگا؟ اور سب سے آخر میں یہ ہے کہ موت آئیگی تو کیا ہوگا؟

اور حزن ہوتا ہے ماضی پر، گذشتہ پر، ہائے حسرت یہ کام کیوں کیا، یہ چوک کیوں ہوگئی، یہ انتظام کیوں نہیں کرلیا، یہ بات پہلے کیوں سمجھ میں نہیں آئی، تو جنت میں دونوں چیزیں نہیں ہوں گی، "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" نہ آئندہ کا کھٹکا، نہ پچھلے کا افسوس، اس کی کھٹک اور خلش اور پھر اس کے ساتھ سب سے بڑھ کر "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ" اللہ تعالیٰ کی رضا سب سے بڑی ہوگی، اس کا ذائقہ تو وہی کچھ سمجھ سکتا ہے، جس کے دل میں کسی کی محبت ہو اور کسی کی عزت ہو، محبت تو اس لیے کہ محبوب کی ذرا سی پسندیدگی، اس کا دیکھ لینا، یہی انسان کے لیے جس کو اللہ تعالیٰ نے محبت سے حصہ عطا فرمایا ہو، بس آخرت کی کامیابی ہے اور عزت، اس لیے کہ جب کوئی معزز آدمی کسی سے خوش ہوجاتا ہے، خوشی کا اظہار کرتا ہے، تعریف کرتا ہے، تو پھر آدمی پھولے نہیں سماتا، اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے (۱)

---

(۱) بہت سی اس کی مثالیں ہیں پہلے انگریز حکام کے زمانہ میں ریاستوں کے زمانہ میں ایسا ہوا کرتا تھا کہ وہاں سے آئے اور کہا "مہاراجہ صاحب ہنس کر بولے تھے اور مہاراجہ صاحب نے یہ کہا تھا کہ خیریت ہے؟ کہتے ہوئے ہاتھ بھی ذرا سا اٹھ گیا اور ہونٹوں پر تھوڑی سی مسکراہٹ بھی تھی، اس وقت بہت آدمی بیٹھے تھے، لیکن مہاراجہ صاحب نے میری ہی طرف دیکھا اور فرمایا کہ کہو قاضی صاحب مزاج اچھا ہے؟ بال بچے اچھے ہیں۔

ایک صاحب کا واقعہ یہ ہے کہ گھر آئے تو بات نہیں کرتے تھے، بیوی بچوں نے کہا کہ کیا بات ہے؟ کوئی تکلیف ہوگئی؟ بہت مشکل سے بولے کہ میں حاکم سے بات کر کے آیا ہوں، اب اس منہ سے کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا، جیسے کوئی بہت مزیدار چیز کھائی ہو، تو اس کے بعد کوئی کڑوی چیز یا دوا کھلائے تو آدمی کہتا ہے منہ کا مزا خراب ہوجائے گا، ابھی مزا آرہا ہے اس کا، تو انہوں نے کہا کہ اب حاکم سے بات کر کے آیا ہوں، اب کس سے بات کروں، بات کرنے کو جی نہیں چاہتا، یعنی وہ جو عزت ملی تھی، وہ جاتی رہے گی، وہ لذت جو حاصل ہوئی تھی جاتی رہیگی۔

آخرت کی عظمت ووسعت

وہ آخرت.... اس کا تو ہم تصور ہی نہیں کر سکتے، ماں کے پیٹ میں جو بچہ ہو اس سے آپ کہیے یا ابھی پیدا ہوا ہو، اس سے اگر کوئی بات کر سکتا ہو اور وہ بات سمجھ سکتا ہو، تو اس سے کہیے کہ بیٹا! جب تم دنیا میں آؤ گے تو بڑا وسیع میدان ہوگا، ہزاروں ہزار میل کا، وہاں باہر ہوائیں چل رہی ہوں گی اور پانی برسے گا، وہاں پر ریلیں چلتی ہیں اور وہ بچہ بے چارہ ماں کے پیٹ میں کیا سمجھے کہ ریل کیا بلا ہوتی ہے، ریل کاہے پر چلتی ہے اور کتنی تیز چلتی ہے اور تو اور ہوائی جہاز اڑیں گے،

بچہ ماں کے پیٹ میں ہے اور یہ اس سے کہہ رہا ہے، کہ ایسا بھی وقت آ سکتا ہے، کہ ہوائی جہاز میں بیٹھو گے، بالکل ایسے ہی بلکہ اس سے بڑھ کر آخرت کا معاملہ ہے،....... یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت ہے اور اس کی مصلحت ہے کہ اتنا بھی ہماری سمجھ میں آ گیا، ورنہ ہماری سمجھ میں آنے والی بات ہی نہیں ہے، کہ اس زندگی کے بعد کی زندگی میں کیا ہوگا، کیا ملے گا، وہ کتنی وسیع ہوگی "عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالأَرْضُ" اس کی وسعت میں زمین و آسمان ایسے ہیں کہ جیسے سمندر میں کوئی کنکری، ٹکی ڈال دے، یہ بھی پتہ نہیں چلے گا، گئی کہاں؟ تو ایسے ہی یہ ساری دنیا، حدیث میں آتا ہے، "مَوْضِعُ سَوْطٍ فِي الْجَنَّةِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيْهَا" ایک کوڑا رکھنے کی (پھیلا کر کے نہیں، کھڑا کر کے) رکھنے کی جگہ ساری دنیا سے وسیع ہے، تو اس آخرت کا تو کیا کوئی تصور کر سکتا ہے اور پھر آخری بات یہ ہے کہ "وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ" اللہ کی رضا جب بندوں کو معلوم ہوگا، جنت میں کہ اللہ راضی ہوا، میرا مالک یہاں راضی ہے، رب مجھ سے خوش ہے، اب ناراضگی کا کوئی کھٹکا نہیں، اس کی لذت کو، اس کی عزت کو تو کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا۔

تو دین کا اصل موضوع ہے اس آخرت میں کامیابی دلانا، اس آخرت کے خطروں سے بچانا، اس آخرت کا عیش نصیب کرنا، اس آخرت میں زندگئ دوام، ہمیشہ رہنے والی، کبھی فنا نہ ہونے والی زندگی عطا کرنا ہے، اللہ فرماتا ہے، "لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ

اِلَّا الْمَوْتَةَ الأُوْلیٰ" جب اس دنیا سے جانے لگیں گے تو ایک ہی مرتبہ موت کا تجربہ ہوگا اور اس کے بعد موت کا کوئی امکان نہیں، پھر موت نہیں آئیگی، یہ دین کا اصل موضوع ہے، اس لیے کہ دین جتنا بڑا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے جتنا خوش ہوتا ہے، اس کے انعام کی اس دنیا میں کوئی گنجائش نہیں، اس دنیا میں تو بہت چیزوں کی گنجائش نہیں، کتنے آدمی ہیں جن کو شادی مرگ ہو جاتی ہے، ایسی خوشی حاصل ہوئی کہ برداشت نہیں کر سکے اور دم نکل گیا، تو اللہ تعالیٰ کے اصل انعامات کی تو اس دنیا میں گنجائش نہیں، اس لیے اس نے آخرت رکھی ہے، وہ جنت حقیقی جنت ہے اور وہ زندگی حقیقی زندگی ہے اور وہ گھر حقیقی گھر ہے۔"(۱)

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "هُدُوا اِلیٰ الطَّیِّبِ مِنَ الْقَوْلِ" اور ان کی ھدایت کی گئی "اِلی الطَّیِّبِ مِنَ القَولِ" اچھے قول کی طرف، اب یہ اس میں اتنی عمومیت ہے کہ اس کی تحدید اور اس کا احصاء نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کیا ہے، ہر وہ چیز جو دوسروں کے لیے باعث نفع ہو، ہر وہ چیز جو دوسروں کے لیے باعث ھدایت ہو، ہر وہ چیز جو دوسروں کے لیے باعث مسرت ہو، باعث تفکر اور عقل ہو اور جس سے نفع پہنچتا ہو، یہ سب "الطیب من القول" میں شامل ہے، ان کو ھدایت کی جائے گی "اِلی الطیب من القول" اچھی بات کہنے، اچھی بات زبان سے نکالنے کی "وَهُدُوا اِلیٰ صِرَاطِ الحَمِید" اور ان کو ھدایت کی گئی، "الحَمِید" کے راستے کی طرف، اللہ تبارک وتعالیٰ جو "الحمید" ہے اس کے راستے کی طرف ان کی ھدایت کی گئی، یہ وہ لوگ ہیں جو "الَّذِینَ آمَنُوا وَعَمِلُو الصَّالِحَاتِ" میں داخل ہیں، ان کے ساتھ اللہ کا یہ معاملہ ہے، جنت میں یہ معاملہ ہوگا اور دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو توفیق دی اچھی بات کہنے کی جو لوگوں کے لیے نافع اور مفید ہو، چشم کشا ہو، بصیرت افزا ہو اور باعث ھدایت ہو اور خود ان کی ھدایت کی گئی، "صِرَاطِ الحَمِید" کی طرف۔

اب یہ "صِرَاطِ الحَمِید" میں اگر "الصِّرَاطِ المُسْتَقِیم" بھی کہہ دیا جاتا تو اس میں وہ عمومیت نہ ہوتی جو "صِرَاطِ الحَمِید" ہے، وہ اللہ تبارک تعالیٰ جو قابل حمد ہے،

(۱) تحفۂ دین و دانش۔ ص۔۹۴۔۹۸ سے باختصار ماخوذ ہے

مستحق حمد ہے، اس کے راستے کی طرف، نسبت سے اضافت سے چیز کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، آپ کہئے یہ بادشاہ کی چیز ہے، یہ حاکم کی چیز ہے، یہ حکومت کی چیز ہے، یہ سرکار کی چیز ہے، یہ قطب وابدال اور اولیاء اللہ کی چیز ہے، اضافت سے وہ چیز کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، چیز وہی ہوتی ہے، لیکن اضافت سے اس کا درجہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے، جس کی طرف اضافت کی گئی، جو مضاف الیہ سے اس کی عظمت اس میں شامل ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دین میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو اس زندگی میں بھی جنت کا کچھ لطف آنے لگے، عارفوں کو تو چھوڑیے، وہ تو کہتے تھے کہ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم کیا عیش کر رہے ہیں، کس لطف میں ہیں، تو ہمیں بیٹھنے نہ دیں، تلوار لے کر ہم پر حملہ کریں اور کوئی اللہ کا بندہ کہتا تھا کہ میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے، مجھ سے کیا چھین سکتا ہے، میری جنت میرے سینے کے اندر ہے، میں کھڑا ہوں تو جنت، میں بیٹھوں تو جنت میں، "جَنَّتِیْ فِیْ صَدْرِیْ" میری جنت میرے سینے کے اندر ہے، متوسط درجہ کے مسلمانوں کو بھی اس زندگی میں وہ راحت وہ عزت، وہ سکون حاصل ہو سکتا ہے، کہ جس کی غیر مسلم جو دین سے نا آشنا ہیں، تصور نہیں کر سکتے، مگر شرط یہ ہے کہ اس دین پر عمل کریں۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۂ حج: ۲۳-۲۴ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ ☆ تحفۂ دین ودانش: ۹۴-۹۸ سے باختصار ماخوذ ہے۔

دعا کی رفعت شان

﴿وَاِذَا سَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ☆أُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْ لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾ (البقرة:۲۳)

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو میں تو قریب ہی ہوں (اور) دعا کرنے والے کی دعاء قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے، پس لوگوں کو چاہیے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں، عجب نہیں کہ ہدایت پا جائیں''۔

دورِ جاہلیت میں عبد ومعبود کے رشتہ کا اضمحلال

جن لوگوں کی مذاہب وعقائد کی تاریخ پر گہری اور تفصیلی نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ اس دور میں جو جاہلیت کے نام سے موسوم ہے عبد ومعبود کے تعلق میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا کہ دعا کا سرچشمہ (جو یقین اور محبت وخوف کے بغیر جاری نہیں ہوسکتا) اندر ہی اندر خشک ہو گیا تھا، عبد اپنے معبود کے متعلق اتنی غلط فہمیوں اور اتنی جہالتوں کا شکار تھا کہ اس کے اندر دعا کا جذبہ اور تقاضہ پیدا ہونا ہی مشکل تھا.......... مشرکانہ جاہلیت نے (صفات الٰہیہ کو مخلوقات کی طرف منسوب کرکے) دعاء والتجاء کا رخ خدا سے موڑ کر بندوں کی طرف تبدیل کر دیا تھا، دونوں کا مجموعی نتیجہ یہ تھا کہ براہ راست خدا سے طلب وسوال اور دعاء والتجاء کا رواج ہی

تقریباً ختم ہوگیا تھا، زمانۂ بعثت میں پورے ملک اور وسیع علاقوں میں ایسے چند آدمی بھی ملنا مشکل تھے، جن کو خدا سے دعاء کرنے کی عادت اور اس کا سلیقہ ہو اور جو اس سے تسکین حاصل کرتے ہوں اور اسی کی دعوت دیتے ہوں۔

دعا سے محرومی کا ایک سبب

دعاء سے محرومی کا ایک بڑا سبب جاہلیت کا یہ غلط تخیل تھا کہ خدا ہم سے بہت دور ہے، ہماری آواز وہاں کہاں پہنچ سکتی ہے........دوسرا غلط عقیدہ یہ تھا کہ خدا کے سوا کوئی اور بھی نفع وضرر کا مالک اور انسانوں کی امداد واعانت پر قادر ہے، اس عقیدہ نے دعاء واستعانت کو ''حقیقی نافع وضار'' سے ہٹا کر خیالی معاونوں اور دادرسوں کی طرف متوجہ کر دیا تھا اور عالم کا عالم شرک وبت پرستی کا شکار تھا۔

محمد رسول اللہ ﷺ (ارواحنا ونفوسنا فداہ) نے محروم ومجوب انسانیت کو دوبارہ دعاء کی دولت عطا فرمائی اور بندوں کو خدا سے ہمکلام کر دیا اور دعاء کی کیا دولت عطا فرمائی، بندگی کی بلکہ زندگی کی لذت اور عزت عطا فرمائی، اس مطرود انسانیت کو پھر اذنِ باریابی ملا اور آدم کا بھاگا ہوا فرزند پھر اپنے خالق ومالک کے آستانے کی طرف یہ کہتا ہوا واپس ہوا۔

بندہ آمد بدرت بگریختہ آبروئے خود بہ عصیاں ریختہ

آپ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان فرمایا اور یہ مژدہ سنایا کہ ''وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ''[1] اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں، تو میں قریب ہی ہوں، (اور) دعاء کرنے والے کی دعاء قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعاء کرتا ہے''۔

عبدیت کا ظہور اور نتیجہ دعاء ہے ....اور دعاء کے لیے اس ہستی کے یقین کی ضرورت ہے، جس سے دعا کی جائے، پھر اس یقین کی کہ اس کو ہر طرح کی قدرت ہے اور دینے کے لیے اس کے پاس سب کچھ ہے، پھر اس یقین کی کہ اس کے در کے سوا اور در نہیں، پھر اس یقین کی کہ وہ خود بھی دینا چاہتا ہے اور محبت ورحمت، بخشش وعطاء اور احسان وانعام

اس کی خاص صفت ہے اور کوئی لے کر اتنا خوش نہیں ہوتا، جتنا وہ دے کر خوش ہوتا ہے، پھر اس یقین کی کہ مخلوق محتاج سرتا پا کشکول گدائی ہے، پھر اس یقین کی کہ وہ معبود اپنی ہر مخلوق سے دنیا کی ہر چیز سے یہاں تک کہ اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے، وہ ہر ایک کی سنتا ہے اور ہر ایک کی ہر حال میں مدد کر سکتا ہے"۔ (۱)

یہ یقین اور ذوق عبودیت و انابت الی اللہ جب پیدا ہو جاتا ہے اور باطن میں سرایت کر جاتا ہے، تو انسان میں اپنی بے بسی اور بے چارگی، اپنی تہی دستی و بے بضاعتی کا ایسا احساس پیدا ہو جاتا ہے، کہ وہ آستانہ شاہی پر کشکول گدائی لے کر کھڑا ہو جاتا ہے اور خدا کا صدقہ اور رحمت کی بھیک مانگتا ہے، اس کے روئیں روئیں سے یہ صدا آتی ہے۔

مفلسانیم آمدہ در کوئے	شیئاً اللہ از جمال روئے تو
دست بکشا جانب زنبیل ما	آفریں بر دست و بر بازوئے تو (۲)

"پھر آپ نے صرف اسی کو واضح نہیں کیا کہ بندہ اپنے مالک سے دعاء کر سکتا ہے اور وہ اس کی سنتا ہے اور اس کی مدد کر سکتا ہے، بلکہ آپ نے یہ ثابت کیا کہ "خدا کو دعاء مطلوب ہے اور وہ اس سے خوش اور راضی ہوتا ہے، بلکہ دعاء نہ کرنے سے ناراض ہوتا ہے، بندگی کا نہایت واضح اور مؤثر مظاہرہ ہے اور عدم دعاء بندگی سے گریز و استکبار و سرکشی کی علامت ہے"۔

آپ کے اس اعلان نے دعا کا پایہ کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور اس کو بندگی کے فعل اضطراری کے درجہ سے اعلیٰ عبادت اور قرب کے مقام تک پہنچا دیا۔

" وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ. إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ" "اور تمہارے پروردگار نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعاء قبول کروں گا، بیشک جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں عنقریب وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا نہ کرنا محض محرومی کا باعث نہیں، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا بھی باعث ہے، حدیث کے الفاظ ہیں "مَنْ لَمْ يَسْئَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ"۔ "جو اللہ

(۱) سیرت محمدیؐ دعاؤں کے آئینہ میں: ۸-۱۶ (۲) تزکیہ واحسان وتصوف وسلوک: ۵۴

سے سوال نہیں کرتا اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے''۔

پھر آپ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ دعاء کو مغز عبادت قرار دیا، ''اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ''. دعا کو رحمت و برکت کے دروازے کی کلید قرار دیا گیا اور فرمایا گیا ''مَنْ فُتِحَ لَهُ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَاءِ فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الرَّحْمَةِ''. ''جس کے لیے دعا کا دروازہ کھل گیا اس کے لیے رحمت کے دروازے کھل گئے''۔

اس طرح دعا کا شعبہ جس کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں رہی تھی، عبادات اور معابد بھی اس کے نور سے خالی ہو چکے تھے اور جاہلیت کے سالک و مرتاض اور عبّاد و زہّاد بھی اس دولت سے محروم تھے، دوبارہ زندہ اور تازہ ہوا اور یہ دولت اتنی عام ہوئی کہ

ع رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی

کتنی خوش قسمت ہے وہ امت جس کو نبوت کی وراثت اور محمد رسول اللہ ﷺ کے طفیل میں دین۔ دنیا کا خزانہ اور غیب کی نعمتوں اور دولتوں کی یہ کنجی ملی اور کتنی بد قسمتی اور پست ہمتی ہے اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے''۔ (۱)(۲)

---

(۱) سیرت محمد دعاؤں کے آئینہ میں (تلخیص): ۱۵-۵۲

(۲) درس قرآن، سورۂ بقرہ: ۲۳ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے:
☆ سیرت محمدیؐ دعاؤں کے آئینہ میں: ۸-۱۶ ☆ تزکیہ و احسان و تصوف و سلوک: ۵۴ ☆ سیرت محمد دعاؤں کے آئینہ میں (تلخیص): ۱۵-۵۲

باب دوم

اوصاف واخلاق

اسلام

بیک وقت عقیدہ وعمل، معاملات واخلاق، جذبہ وشعور کا حامل ہے،
اسی طرح وہ ایک خاص طرح کا ذوق بھی ہیا ایسا ذوق جو انسان کا احاطہ کر لیتا ہے
اور اسے ایک نئے طرز میں ڈھال دیتا ہے۔ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ اسلام کے لیے شرح
صدر نصیب کرے اور وہ اس پر خدا کے پسندیدہ دین اور آخری رسالت سمجھ کر ایمان لائے
تو وہ اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے گا۔ اس پر ایک نیا رنگ چڑھ جائے گا اور اس طرح اس
کا کایا پلٹ ہو جائے گی۔ گویا وہ از سر نو پیدا ہوا ہے، کیوں کہ وہ ایک مستقل زندگی اور کامل و
جامع زندگی ہے اس میں انقلاب وتغیر اور کمال وجمال کا ہر پہلو موجود ہے۔
اسلام.... کوئی خشک و بے روح عقیدہ اور لفظی و کتابی مذہب نہیں بلکہ وہ ایسا دین
ہے جو انسان کے باطن واندرون میں جذب و پیوست ہو کر رگ وپے میں
بجلی کی لہر بن کر دوڑنے لگتا ہے، جیسے کرنٹ ایک تار سے دوسرے
تار میں جاری اور منتقل ہو جاتا ہے۔

(نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں: ۸۱)

رحمٰن کے مقبول بندوں کے مخصوص اوصاف

مخصوص بندوں کے تعارف میں ارض وسماء کا واسطہ

اس رکوع میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے مخصوص اور اپنے مخلص اور اپنے منتخب بندوں کی تعریف کرنی ہے، ان کا سراپا پیش کرنا ان کے اخلاق، ان کے معاملات، ان کا ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ، ان کی اپنی اندرونی صفات، پاکدامنی اورخشیتِ الٰہی، انسانی ہمدردی اور خدا کا خوف یہ ساری چیزیں بیان کرنی ہیں!

''تَبَارَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَاءِ بُرُوْجاً'' کوئی آیت دوسری آیت سے باتعلق نہیں، قیامت تک کے لیے قرآن مجید میں تدبر کرنے کی گنجائش ہے اور نئے نئے مضامین اور نئے نئے نکات سمجھ میں آسکتے ہیں۔

اب تعریف تو کرنی ہے اللہ تعالیٰ کو اپنے ان بندوں کی جو اصل میں ''عِبَادُالرَّحْمٰنِ'' ''اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْناً ......الح''...لیکن اپنی صفت میں یہ بیان کیا کہ ''ہم نے چراغ بنایا'' اور ایک روشن چاند بنایا۔اب آسمان میں یہ بنایا تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی کوئی شانِ خلاقی اور اپنی شانِ تربیت ...اور اپنا انعام زمین میں نہیں فرمائے گا۔زمیں بھی تو ایک اللہ کی مخلوق ہے ......بہت بسیط ہے۔بہت پھیلی ہوئی ہے اور وہ جگہ ہے جہاں انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہوئی ہے، یا بعثت ہوئی اور جہاں اللہ تعالیٰ کے عارفین

اور کاملین پیدا ہوئے ......اور جہاں عبادت ہوتی ہے اور جہاں مسجدیں بنتی ہیں اور جہاں اللہ کا علم پھیلایا جاتا ہے اور جو راستہ ہے جنت تک جانے کا یعنی جنت تک جانے کا راستہ یہ زمین ہے...آسمان تو بعد میں پڑے گا۔ پہلے یہ زمین ہے!

زمین کے چاند سورج

تو پہلے فرماتا ہے کہ :۔''بڑی برکت والا ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں چراغ بنایا اور ایک روشن چاند چمکتا ہوا۔ چاند۔ بنایا''!

تو جب آسمان میں اس نے یہ کیا تو زمین میں کیا کیا؟ لیکن زمین میں نہ برجوں سے فائدہ اور چراغ سے فائدہ اور نہ ''قمرا منیرا'' وہ آسمان کا ہے اور پوری اس کی روشنی یہاں زمین پر پڑ رہی ہے!

یہاں کے جو چاند سورج ہیں، وہ آدمی ہیں، یہاں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کا بہترین نمونہ ہے وہ یہاں کے آدم کی اولاد ہیں۔ جن میں انبیاء ہیں، اولیاء ہیں، عارفین ہیں، کاملین ہیں، عشاق ہیں، اور عشاق الٰہی ہیں، محبوب رب العالمین ہیں، مجاہدین ہیں، مصلحین ہیں، شہدا ہیں، یہ سب زمین میں ہیں،!

تو اللہ تعالیٰ نے آسمان کی چیزیں بنائی، برج بنائے اور ایک چراغ جلتا ہوا اور ایک چمکتا ہوا چاند،!

تبدیلی روز وشب میں تذکیر کا سامان

اللہ پاک آگے فرماتا ہے۔﴿وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً﴾ ۔اور وہ پاک ذات ہے جس نے کہ رات اور دن کو بدلنے والا بنایا۔ یعنی باری باری سے آنے والا، ابھی رات ہے، پھر دن ہے، دن ہے، پھر رات ہے۔

''لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوراً'' ''اس کے لیے جس نے ارادہ کیا کہ وہ نصیحت حاصل کرے یا شکر کرے۔''

یہ جو تبدیلی ہے یہ تبدیلی بہت بڑی معاون ہوتی ہے تذکیر کے لیے اگر بالکل یکساں حالت رہی تو آدمی بالکل سوسا جاتا ہے اور اس کے ذہن میں کوئی نیا تقاضہ اور کوئی احساس نہیں پیدا ہوتا، دن ہی اگر رہتا تو لوگ دن کا کام کرتے رہتے، وہی کھانا کھانا، دوڑنا دھوپنا وغیرہ! لیکن دن کے بعد رات کا آنا اور رات کے بعد دن کا آنا اس تبدیلی میں بہت بڑا تذکیر کا سامان ہے کہ اب دن گیا بھی تو دن میں تھوڑی کوتاہی ہوئی ہوگی تو رات کو ہم اس کی کمی پوری کریں تہجد سے، عبادت سے، رات کو سو گئے اور پوری رات سوتے رہے، تو دن میں اب ہم کچھ قرآن شریف پڑھ لیں، نفلیں پڑھ لیں، کچھ خدمت کر لیں!

یہ دن رات کا الٹ پھیر جو ہے یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک ہدایت کا اور ترقی کا ترقی روحانی کا سامان ہے۔ (۱)

اللہ کے خاص بندوں کی تعریف

اب اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ یہاں سے اپنے خاص بندوں کی تعریف کرتا ہے:-

قدر مشترک... ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' ''رحمٰن کے وہ بندے'' اب اس میں ہر چیز ایک اعجاز ہے.......! ان انسانوں کو جو تعریف کی ہے، اس میں جو قدر مشترک ہے، جو ان کی صفات کا محرک ہے یعنی کہ ان کی ہر صفت میں اس کا پرتو پایا جاتا ہے وہ ان کا آہستہ آہستہ چلنا، کوئی کیڑا مر نہ جائے، یہاں تک کہ کسی کی کوئی چیز خراب نہ ہو جائے اور جب لوگ ان سے الجھتے ہیں تو کہتے ہیں ''بھائی سلام ہو'' ''معاف کرنا'' ''ہمارے پاس وقت نہیں ہے''۔

(۱) اور ہماری کوئی بڑی وقیع شہادت نہیں۔ لیکن بہرحال ذوق ہے اپنا اپنا اور یہ رکوع ہے جو ہمارے استاد خلیل عرب کو بہت ہی محبوب تھا اور وہ اکثر فجر کی نماز میں یہ پڑھتے تھے، اکثر ان پر گریہ ایسا طاری ہوتا تھا کہ ختم کرنے سے پہلے رکوع ان کو کرنا پڑتا تھا اور انہوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ ہم آ رہے تھے یونیورسٹی سے تو کچھ غیر مسلم، ہندو عیسائی، یہ لوگ! انہوں نے ایک کمیٹی بنائی تھی کہ مذاہب کا مطالعہ کیا جائے۔ ہر ایک کا نمونہ پیش کیا جائے، پہلے سے ان سے کہہ رہے رکھا تھا، یہ ہمیں یاد نہیں بہت پرانی بات ہے، ہم طالب علم تھے یا وہ ادھر سے گذرے تو ان کو بھی دعوت دی کہ آپ اسلام کو پیش کریں! تو جب وہ اپنا اپنا پیش کر چکے، جو کچھ انہیں پیش کرنا تھا اس کے بعد ہم نے یہ رکوع پڑھا۔ جہاں تک ہمیں یاد ہے کہتے ہیں کہ ان پر گریہ طاری ہو گیا کہ یہ ایسی جماعت انسانوں کی ہوتی ہے!

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی جو تعریف کی ہے ان سب میں قدر مشترک ہے وہ رحمت کی صفت ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کا ظہور ہوا ہے، بشری دائرہ میں، بشری قالب میں جتنا ظہور ہو سکتا ہے رحمت کا، وہ ہوا ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کی صفت تجلی ہے!

اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اسمائے حسنیٰ میں، کم سے کم ننانویں تو مدون ہیں اور محفوظ ہیں ان میں سے کوئی اسم اعظم لے سکتا تھا "عبادالرحمن" کہا جا سکتا تھا۔ لیکن یہاں "عِبَادُالرَّحْمٰن" کہا، اس لیے کہ "عِبَادُالرَّحْمٰن" کی صفت ان سب میں مشترک ہے!

سب سے زیادہ معروف تو یہی ہے، اسم ذات ہے اور "عِبَادُالْكَرِيْم" کہا جا سکتا تھا اور "عِبَادُالْقَادِرْ" کہا جا سکتا تھا اور "عِبَادُالْقَهَّار" کہا جا سکتا!

ان کا "رحمٰن" کا بندہ ہونا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا طرزِ عمل، ان کا طرزِ زندگی، ان کی سیرت ساری کی ساری "عبادالرحمٰن" کو ظاہر کرتی ہے! کہ یہ اس پروردگار کے بندے ہیں، جس کی خاص صفت "رحمٰن" ہونے کی ہے! تو ان "رحمٰن" کے بندوں میں بھی اس کا پرتو آیا ہے۔

۱- دیکھ بھال کر چلنا

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا" "جو زمین پر ہلکے ہلکے چلتے ہیں" اللہ کے وہ بھلے انسان وہ معقول انسان جو زمین پر شریفوں کے چال چلتے ہیں، بھلے مانسوں اور انسانوں کی طرح چلتے ہیں، "يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ" "دبے پاؤں چلتے ہیں" کہ چیونٹی بھی ان کے پاؤں کے نیچے نہ آنے پائے، کوئی کمزور ہستی ان کے پاؤں سے روندی نہ جائے، کسی پر ظلم نہ ہونے پائے، ان کی زندگی کی حرکت کسی کی زندگی کا خاتمہ نہ کر دے۔ (تحفۂ برما، صفحہ ۳۳)

یعنی ان کی چال سے نہ تو تکبر ظاہر ہوتا ہے اور نہ کسی کو ایذا پہونچتی ہے۔ کوئی سو رہا تھا اتفاق سے یا کوئی بچہ بیٹھا ہوا تھا، یا کوئی درخت کسی نے لگایا وہ دب گیا کچل گیا، یہ نہیں بلکہ

ہلکے ہلکے چلتے ہیں اور دیکھ بھال کر چلتے ہیں۔

اوراس کے لیے "ھَوْناً" کا لفظ استعمال کیا جس کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا، اس وجہ سے اس کا ترجمہ بہت مشکل ہے۔ جو زمین پر (غالباً حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے "دبے پاؤں" ترجمہ کیا ہے) ہلکے ہلکے چلتے ہیں دبے پاؤں چلتے ہیں۔

۲- جاہلانہ بات کا شریفانہ جواب

"وَاِذَاخَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ قَالُوا سَلَاماً" اور جب جاہل ان سے منہ لگتے ہیں تو کہتے ہیں بھائی صاحب! سلامت، معاف کرو، ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تم سے لڑنے کا، تم سے بحث کرنے کا، جب جاہل ان سے الجھتے ہیں ان کو خطاب کرتے ہیں، مثلاً کوئی ایسی اشتعال انگیز بات کہدی کہ مقابلہ پر آجائیں اور پھر وہ دھینگا مشتی بھی ہوجائے اورلڑائی ہوجائے تو جب جاہل ان کو مخاطب کرتے ہیں کوئی جاہلانہ بات کہتے ہیں تو"قالو اسلاماً"" کہتے ہیں بھائی سلام جاؤ" سلامتی ہو تم پر ہمیں فرصت نہیں۔

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ "اگر کوئی شخص تمہیں (روزے کی حالت میں) گالی دے یا تم سے جہالت کا سلوک کرے تو تم اس سے کہدو "انی صائم" بھائی میں روزے سے ہوں" میرے لیے گنجائش نہیں اس جھگڑے کی۔ ویسے ہی وہ ہیں کہ جب جاہل ان کو خطاب کرتے ہیں اور جاہل کا خطاب ان سے یہ مطلب نہیں "خاطبھم" کا کہ وہ ان کی عزت کے ساتھ کہ "آیئے مولانا صاحب،،،، تشریف لایئے حضرت ......اس طرح تھوڑی.....جب جاہل کا لفظ یہاں لایا گیا تو مضاف الیہ سے مضاف کا تعین ہوجاتا ہے۔

وَاِذَاخَاطَبَھُمُ الْعُلَمَاء" سمجھئے کہ کسی نے کوئی عالمانہ بات کہی......!

وَاِذَاخَاطَبَھُمُ الشُّعَرَاء" معلوم ہوا کوئی شاعرانہ بات کہی......!

وَاِذَاخَاطَبَھُمُ الْمُلُوکَ" معلوم ہوا کوئی بادشاہانہ بات کہی......!

تو "وَاِذَاخَاطَبَھُمُ الْجَاھِلُوْنَ" جب جاہل ان سے خطاب کرتے ہیں تو یہ عام کوئی خطاب نہیں ہوا کہ "صاحب یہ راستہ بتادیجئے، ہم کدھر جائیں، کیا کریں...؟ یا آج

کیا تاریخ ہے...؟ یہ نہیں جاہل اس وقت خطاب کرتے ہیں...جاہل جاہلانہ خطاب کرتے ہیں۔تو کیا اس کا جواب ہوتا ہے ان کا "سلاما"!

ایک مفرد لفظ میں سب کچھ کہہ دیا، یعنی لمبی ایک اگر عبارت ہوتی تو وہ بھی اس کو پورے طور پر ادا نہ کرتی۔"سَلَاماً"۔

''سلام میں سلامتی ہے'' سلام میں خاموشی ہے اور صلح پسندی ہے اور ایک ہمدردی کا جذبہ ہے!

تو "سَلَاماً" میں سب کچھ آگیا یعنی صرف یہی نہیں کہ وہ پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ کہہ دیں ! بھائی ہمیں فرصت نہیں.....ایک یہ بھی ہے.....بڑے زور لہجے سے کہا تو کچھ بھی نہیں۔

یعنی جو تعریف ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی ہے وہ اس پر صادق نہیں آتی اب کسی نے ایک دم سے بلایا بھائی ہمیں فرصت نہیں....بیٹھو! تو یہ نہیں ہوا "قَالُوا سَلَاماً" یہ نہیں ہے بلکہ بھائی معاف کرنا، ہاتھ اٹھا دیا یا کچھ ''سلام کر دیا معاف کرنا بھائی، ہمیں فرصت نہیں تم اپنا کام کرو۔

۳-شب بیداری....

"وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَّقِیَاماً" اور یہ تو ان کے دن کی حالت ہوئی ہے چلنے پھرنے کی اور لوگوں میں گزارنے کی اور رات ان کی کیسی گزرتی ہے؟ اور وہ کہ جو رات گزارتے ہیں اپنے رب کے لیے۔"سُجَّداً وَّقِیَاماً"''سجدے اور قیام میں'' یہ ان کی رات اس طرح گزرتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ پوری رات اس طرح گذرے کہ سوئے نہیں ! مگر ان کی رات کا ایک معتد بہ حصہ اور جس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''رات گذارنا'' وہ سجدے اور قیام کی حالت میں گذرتا ہے !ابھی کوئی دیکھے تو ''سجدے'' میں پڑے ہیں، پھر دیکھے تو ''قیام:: میں کھڑے ہوئے ہیں، اس طرح ان کی رات گذرتی ہے۔

چنانچہ جب ہرقل نے پوچھا اپنے ان جرنیلوں سے جو عربوں کے مقابلہ کے لیے آئے

تھے اور شکست کھا کر واپس ہوئے کہ بتاؤ تو صحیح ان عربوں کے اندر وہ کیا خوبی ہے....؟

''تو ایک رومی سردار مسلمان فوجوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے،'' رات کو تم ان کو عبادت گزار پاؤ گے اور دن کو روزہ دار، عہدوفا کرتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور آپس میں پورا انصاف اور مساوات برتتے ہیں''۔

دوسرے کے الفاظ ہیں'' وہ دن کو شہسوار ہوتے ہیں اور رات کو عبادت گذار، اپنے مفتوحہ علاقہ میں وہ قیمت دے کر کھاتے ہیں، سلام کر کے داخل ہوتے ہیں اور ایسا جم کر لڑتے ہیں کہ دشمن کا خاتمہ ہی کر دیتے ہیں''۔

ایک تیسرے نے ان الفاظ میں تعریف کی'' رات کو دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ ان کو دنیا سے کچھ تعلق نہیں اور عبادت کے سوا کوئی کام نہیں اور دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح نظر آئیں گے کہ گویا یہی کام ہے، بڑے تیر انداز اور بڑے نیزہ باز، خدا کی یاد میں اس طرح مشغول وورد زبان کہ ان کی مجلس میں کسی بات کا سننا مشکل ہوتا ہے''[(۱)]

۴- خوف خدا اور فکر آخرت.....

''وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ، اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاماً''

''اور وہ جو رات گذارتے ہیں کہ ابھی سجدے میں پڑے ہیں، ابھی ''قیام'' میں کھڑے ہیں اس سے نفسیاتی طور پر ایک اطمنان پیدا ہوتا ہے''۔

بلکہ غرور بھی پیدا ہوسکتا ہے، اعجاب بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ رات ہم نے ایسی گذاری، پوری رات ہماری آنکھوں میں گذر گئی اور ہم کبھی سجدے میں تھے اور کبھی قیام میں ....اور ہمارا کیا کہنا ہمیں تو کوئی ڈرنے کی ضرورت نہیں!

لیکن یہ ان میں خاص بات ہے کہ رات تو گذارتے ہیں ''سجدے'' اور ''قیام'' میں لیکن اس کے ساتھ یہ کہتے ہیں۔

(۱) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر: ۱۴۳

"رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّم" ان کو اس سے کوئی غرور یا عجب نہیں پیدا ہوتا، جیسے کہ بہت سی امتوں کے عابدوں میں پیدا ہوتا ہے...رشیوں اور منیوں میں پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو سمجھتے ہیں ...اوتار ہو گئے ....اور ہم جو چاہیں کرلیں نہیں بلکہ وہ رات تو گذارتے ہیں اس طرح کہ معلوم ہوتا ہے ان سے زیادہ عبادت کرنے والا کوئی نہیں اور اب ان کو کوئی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

"اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاماً" یہ ان کی جامعیت ہے اور یہ گویا ایک طرح کا جمع بین الضدین ہے کہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اے اللہ ہم کو جہنم کے عذاب سے دور کر یہی اس امت کے عابدوں اور اولیاء اللہ کی صفت ہے۔ اگر آپ ان کی عبادت دیکھیں تو کہیں کہ اب ان ڈرنے کی ضرورت نہیں، لیکن جب دعاء اور گریہ و بکا کرتے ہوئے دیکھیں تو معلوم ہو جیسے ان سے بڑھ کر کوئی ڈرنے والا نہیں اور ان کو اپنی عبادت پر گویا اطمینان نہیں یہ ایک تعلیم ہے کہ اللہ کی عبادت اور بندگی تو ایسی کی جائے جتنی آدمی کر سکے لیکن اللہ کے عذاب سے بھی ڈرتا ہے۔ یہی چیز مطلوب ہے شریعت میں اور سیرت نبوی اس کی آئینہ دار ہے پوری رات آپ صلی اللہ علیہ وسلم گریہ و بکا کرتے اور سوال و دعاء میں لگے رہتے اور دن میں دعوت کا کام، پھر بھی مطمئن ہو کر نہ بیٹھے رہتے۔ تو بظاہر یہی جمع بین الضدین ہے حقیقۃ ضدین نہیں ہے۔

لیکن یہ ان کی جامعیت ہے اور یہ گویا ایک طرح کا جمع بین الضدین ہے کہ اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ "اے اللہ! ہم جہنم کے عذاب سے دور رکھ"!

"اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَاماً" "اس کا عذاب تو بڑا تاوان ہے اور بہت سخت چیز ہے۔

یہی اس امت کے عابدوں اور اولیاء اللہ کی صفت ہے کہ ان کی آپ عبادت دیکھیں تو کہیں یہ تو اب ان کو کوئی خشیت کی کیفیت یا ڈرنے کی ضرورت نہیں، لیکن آپ جب ان کو دعاء کرتے ہوئے اور گریہ بکا کرتے ہوئے دیکھیں سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ ہوئے ....اور یہاں کے بزرگانِ دین ہوئے.....تو معلوم ہوا کہ جیسے ان سے بڑھ کر کوئی ڈرنے والا نہیں اور جیسے یہ ہیں کہ اپنی عبادت پر ان کو کوئی اطمینان ہی نہیں۔

یہ تعلیم ہے کہ اللہ کی عبادت اور بندگی تو ایسی کی جائے کہ جتنی آدمی کر سکے لیکن اللہ کے

عذاب سے بھی ڈرتا ہے۔

تو یہ بظاہر جمع بین الضدین ہے، ضدین نہیں ہے (حقیقۃ) لیکن لوگوں کے فہم نے لوگوں کے طرز عمل نے اس کو ضد بنا دیا ہے ایک دوسرے کی آنکھوں سے ہم دیکھتے ہیں کہ بالکل دوسری قوموں میں دوسرے مذاہب میں ان کی حیثیت ضدین کی سی ہے لیکن اسلام میں نہیں ہے۔

''اِنَّهَا سَاءَ تْ مُسْتَقَراً وَمُقَاماً'' جن کی شان یہ ہے کہ ''يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَقِيَاماً'' وہ اس طرح سے سہمے ہوئے ہیں مانگ رہے ہیں اللہ سے کہ ''جہنم کے عذاب سے اس کا عذاب تو ایک برا تاوان ہے ....اور بہت نا قابل برداشت ہے'' وہ برا ٹھکانہ اور بری قیام کی جگہ ہے''۔

۵-میانہ روی اور اعتدال پسندی

''وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَاماً'' اب یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام سے ناواقف آدمی، سطحی خیال کا آدمی یہ توقع رکھتا کہ جہاں خرچ کرنے کا ذکر آئے وہاں تو پھر کوئی تحدید ہو ہی نہیں سب اللہ کے راستے میں لٹا دیا۔لیکن نہیں۔ چونکہ یہ عملی تعلیم ہے اور قیامت تک کے لیے نمونہ ہے تو یہاں ان کی اس صفت کی تعریف کی کہ ''جب وہ خرچ کرتے ہیں تو حد سے بھی آگے نہیں بڑھتے''۔

ورنہ توقع یہ کی جاتی ہے کہ ایک صحیفۂ آسمانی میں تو یہ ہوگا...گھر لٹا دیا انہوں نے.....کچھ بھی نہیں لیکن یہ چلنے والی نہیں اور وہ امت جس کو دنیا میں قیامت تک رہنا ہے اور دعوت کا کام کرنا ہے اور نمونہ بننا ہے اور دوسروں کے اندر یہ اطمینان پیدا کرنا ہے کہ دین میں آنے سے دنیا بالکل ختم نہیں ہو جاتی۔تو ان کی شان یہی ہے ''اِذَا اَنْفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوْا'' جب وہ خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے اور حد سے نہیں گزرتے ''وَلَمْ يَقْتُرُوا'' اور بخل سے بھی کام نہیں لیتے ''وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَاما'' اور حقیقت میں ان دونوں کے درمیان ایک اعتدال ہے۔ یہ قرآن مجید کا امتیاز ہے کہ اس میں اس اعتدال کی تعلیم آئی ہے

اگر آپ پڑھیں ہندوؤں کے، مجوسیوں کے مذہب کے بارے میں، اول تو ہے ہی کہاں اور کہاں تک صحیح ہے یا اس میں اور چیز پڑھیں تو اس میں صرف ایک رخ دکھایا گیا خرچ کرنے کی تعلیم ہے تو بس سب کچھ لٹا دیا.... اور سب کچھ خرچ کر دیا، رِشی منی بن گئے اور انتظام کی تعلیم ہے تو بخیل ہیں، ایک ایک پیسہ، ایک ایک پائی کا حساب دینا اور لینا، لیکن قرآن مجید میں اعتدال و جامعیت ہے۔

۶- غیر اللہ کی عبادت سے اجتناب...

''وَالَّذِيْنَ لَايَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً آخَرَ'' ....''اور وہ لوگ کہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے''۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ خدائے تعالیٰ ہی حاکم حقیقی اور فرماں روائے مطلق ہے اور شریعت سازی صرف اس کا حق ہے .....درحقیقت خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کا تعلق، حاکم ومحکوم، آمر ومامور ایک بادشاہ اور رعیت کے تعلق سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ عمیق، کہیں زیادہ لطیف اور کہیں زیادہ نازک ہ،....اس لیے بندے سے صرف اتنا مطلوب نہیں ہے کہ وہ اس کو اپنا حاکم اعلیٰ اور آمر مطلق سمجھ لے اور اس کے اقتدار اعلیٰ میں کسی کو شریک نہ کرے بلکہ ان اسماء وصفات اور ان افعال الٰہی کے ذکر کا جن سے قرآن شریف بھرا ہوا ہے اور ان آیات کا جن میں خدا تعالیٰ سے محبت وتعلق اور بکثرت اور ہمیشہ اس کے ذکر کی ترغیب آئی ہے، صاف تقاضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دل وجان سے محبت کی جائے اور اس کی طلب ورضا میں جان کھپا دی جائے، اس کے حمد وثنا کے گیت گائے جائیں، اٹھتے بیٹھتے اس کے نام کا وظیفہ پڑھا جائے، اسی کی دھن ہر وقت دل ودماغ میں سمائی رہے، اسی کے خوف سے انسان ہر وقت لرزاں اور ترساں رہے اسی کے سامنے دست طلب ہر وقت پھیلائے رہے، اسی کے جمال جہاں آرا پر ہر وقت نگاہیں جمی رہیں اسی کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے، مٹا دینے، حتی کہ سر کٹا دینے کا جذبہ بیدار رہے''۔ (۱)

(۱) دستور حیات: ۴۳

۷-۸-قتل ناحق اور زنا سے دوری....

"وَلَایَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِی حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَایَزْنُوْنَ" اور وہ کیس ایسی جان کو نہیں لیتے ایسے شخص کو ایسی ذات کو وہ قتل نہیں کرتے، جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا مگر حق کے ساتھ"۔

حق کے ساتھ یہ ہے کہ میدانِ جہاد میں گریں گے، یا قاتل ہے، موذی ہے اور اس سے خطرہ ہے اور اس پر جرم ثابت ہو گیا ہے تو وہ پھر اس کی گرفت کریں گے اور انصاف و قانون کے ساتھ۔

"وَلَایَزْنُوْنَ" "اور زنا (وغیرہ) سے بہت دور ہیں"۔

"وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَاماً یُضٰعَفْ لَه' الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ" "اور جو ایسا کرے گا" یعنی وہ چیزیں جس کی نفی کی ہے، ناحق کسی کو مارے گا اور اسی طرح سے اپنی خواہش نفسانی کو ناجائز طریقے سے پورا کرے گا تو یہ "یَلْقَ اَثَاماً" اس کو اس کا تاوان دینا پڑے گا، اس کے وبال کا سامنا کرنا پڑے گا" "یُضٰعَفْ لَه' الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ" "یہ عذاب قیامت کے دن دوگنا کیا جائے گا کئی گنا کیا جائے گا "وَیَخْلُدْ فِیْهِ مُهَاناً" "اور وہ اس میں ذلیل ہو کر رہے گا"۔

۹-توبہ وانابت...

"اِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَأُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنَا تٍ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْراً رَّحِیْماً" اور اس کے بعد ایک درجہ توبہ کا بھی ہے اگر غلطی ہو جائے جب بھی مایوسی نہیں، توبہ کر سکتا ہے، یہ بھی اسی حکم میں اللہ تعالیٰ لے آیا ہے۔

"اِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحا" "مگر جس نے توبہ کی اور جو ایمان لایا اور جس نے نیک عمل کئے" "فَأُولٰئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنَا تٍ" "تو اللہ تعالیٰ ان کے سیات کو حسنات سے تبدیل کردے گا" "وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْراً رَّحِیْما"...."اور خدا تو بخشنے والا مہربان ہے"۔

یہ آخری درجہ ہے کہ سیات کو معاف ہی نہیں کرے گا بلکہ سیات کو حسنات سے بدل دے گا اور یہ منحصر ہے ان کی کیفیت توبہ، انابت، خشیت اور ان کی رقت اور اظہار عبودیت پر کہ بعض مرتبہ اس طرح آدمی توبہ کرتا ہے کسی گناہ سے کہ اور درجہ اس کا بلند ہوجاتا ہے اور بعض صالحین سے بھی وہ بڑھ جاتا ہے یہ توبہ کی خاصیت ہے۔

''توبہ... ایک اضطراری وسیلہ ہی نہیں ہے کہ جس کے ذریعہ انسان تلافی مافات کرلیتا ہے بلکہ توبہ کا مقام اتنا اونچا ہے کہ وہ افضل ترین عبادت اور تھوڑے سے وقت میں قرب ولایت کے انتہائی درجات تک پہونچنے کا آسان راستہ ہے، جس پر بڑے بڑے عابدوں، زاہدوں اور ان پاکیزہ نفوس کو بھی جو گناہ سے محفوظ رہے ہیں، رشک کرتے ہیں''۔ (۱)

توبہ ایک طرح کی نہیں ہوتی ہے، یعنی توبہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ کہہ دیا اے اللہ! میری توبہ بس یہی توبہ ہے، توبہ کے ناقابلِ شمار طریقے ہوتے ہیں، بعض توبا تیں ایسی ہوتی ہیں کہ آسمان کو رحم آنے لگتا ہے، فرشتوں کو ترس آتا ہے اور ایک کہرام سا مچ جاتا ہے۔

ایسے بعض توبہ کرنے والے ہیں اور دیکھنے والوں نے ان کو دیکھا بھی ہے اور کتابوں میں تو واقعات ہے ہی ہیں۔

اور توبہ جو ہے وہ صرف توبہ کا لفظ کہہ دینا کہ ''اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَتُوبُ اِلَیکَ'' یہ نہیں۔ بلکہ وہ کیفیت ان پر پوری طرح طاری ہوتی ہے اور مجسم توبہ بن جاتے ہیں۔

''وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحاً فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ مَتَاباً'' ''اور جس نے توبہ کی'' اور صرف توبہ زبانی توبہ کہہ دینا ''استغفر اللہ'' کہہ دینا کافی نہیں بلکہ ''عمل صالحا'' اور پھر نیک عمل بھی کیئے'' زندگی میں تبدیلی بھی آنی چاہیے، عملِ صالح کرتے ہیں'' تو وہ توبہ کرتا ہے اللہ کی طرف پوری توبہ۔

۱۰- جھوٹ سے گریز.....

''وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ'' اور وہ لوگ کہ جو کسی غلط کام، کسی جعل سازی، کسی جھوٹے، کسی سازش، کسی ایسی چیز میں... ''زور'' کا لفظ بہت جامع اور بہت وسیع ہے اس میں

---

(۱) تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات: ۸۱-۸۲

یہ سب چیزیں آجاتی ہیں، سازشیں بھی آجاتی ہیں، جھوٹی گواہیاں بھی آجاتی ہیں، جھوٹی دستاویزیں بھی آجاتی ہیں اور کسی غلط آدمی، مجرم کی تائید بھی آجاتی ہے، سب اس ''زور'' میں ہے، عربی میں ''الزور'' کا لفظ بہت وسیع ہے ''وہ لوگ زور میں شریک نہیں ہوتے''۔

۱۱- لغو مقام سے شریفانہ گذر.....

''وَاِذَا مَرُّا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَاماً'' اور جب وہ کسی لغو کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو شریف طریقے سے گذر جاتے ہیں''۔

یعنی (اس کا ترجمہ ہونا مشکل ہے) کہ جب کوئی غلط کام ہورہا ہے، ایسا کوئی تفریحی یا خلافِ اخلاق کوئی چیز ہے تو ایسے گذر جاتے ہیں، دامن بچا کر گذر جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے یہ اس کی سطح سے بہت بلند ہے اوپر اوپر سے گذر گئے زمین پر ہورہا ہے اور وہ اوپر ہوا میں سے گذر گئے۔

اور ''کـرام'' کرم کا لفظ بھی عربی میں بہت ہی وسیع الفاظ میں سے ہے اور پھر سخاوت نہیں ہے خالی، شرافت نہیں ہے خالی، بلکہ خلالِ مروت، اوصافِ انسانیت، اخلاقِ فاضلہ، مکارمِ اخلاق، یہ سب چیزیں ہیں۔

۱۲- آیات الٰہیہ کی قدر وعظمت....

''وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوا بِاٰيَاتِ رَبِّهِم لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَاناً'' ''اور وہ لوگ کہ جب ان کو اپنے رب کی آیات سے ڈرایا جاتا ہے، یعنی یاد دلائی جاتی ہیں تو ان آیتوں پر وہ بہرے اور اوندھے ہوکر نہیں گرتے۔

''قرآن کی بنیاد خدا کے خیال اور اس کے خوف پر ہے..قرآن نے اپنے کو ان کے لیے مفید بتایا ہے، جن کے دل پر خدا کے نام کا اثر ہوتا ہے اور ان کے خاکستر میں کوئی دبی ہوئی چنگاری موجود ہے، قرآن بہر حال ایک صحیفہ اور ایک تعلیم ہے، اس سے منتفع ہونے کا پہلا ذریعہ یہی ہے کہ اس کو غور سے سنے، جو سرے سے کان لگا کر سنتا ہی نہیں، اس کے بعد کے مراحل کیا طے کرے گا؟.....لیکن صرف غور سے سن لینا کافی نہیں جو حصہ عمل کے قابل

ہواس پر عمل کرنا ضروری ہے اسی لیے فرمایا ’’اوروہ کہ جب ان کو اپنے پروردگار کی باتیں سمجھائی جاتی ہیں تو ان پر اندھے اور بہرے ہوکر نہیں گرتے (بلکہ غور سے سنتے ہیں) یعنی ان کے ساتھ وہ ایسا معاملہ نہیں کرتے، اس طرح ردِ عمل ان کا ’’صماوعمیانا‘‘ کی طرح نہیں ہوتا، بہروں اور اندھوں کی طرح نہیں ہوتا، بلکہ کان سے بھی کام لیتے ہیں سنتے ہیں ادب سے، اور پورے طور پر اس کے الفاظ کی قدر کرتے ہیں اور اس کا لطف لیتے ہیں اور غور کرتے ہیں دیکھتے بھی ہیں کہ اگر گرتے تو یہ ہوتا اور اگر یہ کرتے تو یہ ہوتا.....جو کچھ فرمایا جارہا ہے بالکل صحیح ہے اور ہم نے اس کے نمونے دیکھے ہیں اور دیکھتے رہیں گے‘‘۔ (۱)

۱۳- دین کی بقاء و تسلسل کے لیے دلسوزی و فکرمندی...

’’وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَاتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَجَعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا‘‘ اب دیکھئے یہ بھی اعجاز قرآنی ہے، یہ سب بہت اچھے لوگ ہیں اور بڑے قابل مبارک باد ہیں، اس کا سلسلہ ختم ہو ہی جاتا ہے.....تھے...اچھے تھے.....چلے گئے.....تسلسل قائم رہنا چاہیے...پھر اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ وہ یہ بھی کہتے ہیں ساتھ ساتھ کہ ’’اللہ ہمیں اپنی بیویوں سے ہمیں اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما‘‘ اور ہمیں متقین کا امام بنا‘‘۔

یعنی یہ سلسلہ جو چلتا بھی رہے یہ بھی ذمہ داری ہے صاحبِ دعوت قوم کی اور جو دنیا کے لیے نمونہ بنائی گئی ہے کہ وہ تسلسل کو باقی رکھے کہیں بہتر سے بہتر زمانہ گذرا، بہتر سے بہتر جماعت گذری، فرشتوں کی بھی، لیکن ختم ہوگئی، ان کے بعد ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں.... سب ختم ہوگیا۔ (۱)

---

(۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی۔ تلخیص: ۱۶۳-۱۶۸

(۲) یہی ہندوستان میں کئی بار ہوا اور اب بھی ڈر ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ مدارس قائم کئے جائیں، تبلیغی کام کیا جائے اور اصلاح کی جائے، اس لیے کہ مسلمانوں میں ایسی کمزوریاں پیدا ہونے لگی ہیں جن سے اندیشہ ہوتا ہے کہ اسلام کا جو عملی نمونہ تھا خدانخواستہ وہ کہیں بالکل روپوش نہ ہوجائے، او جھل نہ ہوجائے، نگاہوں سے کہ وہاں ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ مسلمان کبھی ایسے ہوتے تھے، اب تو ہمیں کوئی نظر نہیں آتا تو یہ نہیں۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی گویا توجہ دلائی ہے قرآن مجید کے پڑھنے والوں کو کہ اس کو بھی اپنے ذہن میں رکھیں، اللہ سے یہ بھی دعاء کریں کہ ''رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَاتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَجَعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا''

''اللہ ہمیں اپنی بیویوں سے، ہمیں اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما'' اور ہمیں متقین کا امام بنا''۔

''اُولٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَاصَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا'' یہ وہ لوگ ہیں جو جنت کے بالا خانے نصیب ہوں گے ان کو دیئے جائیں گے ان کے صبر کی وجہ سے ''وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا'' اوران کا وہاں استقبال ہوگا تحیۃ وسلاما سے اس طرح ان کو خطاب کیا جائے گا، بار بار تحیۃ وسلام اور مبارکباد سے۔

''خَالِدِيْنَ فِيْهَا'' ''ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں''۔

''حَسُنَتْ مُسْتَقَرًا وَمُقَامًا'' ''اورخالی کسی گھر کی تعریف یہ نہیں کہ ہمیشہ رہے بلکہ وہ گھر بھی اچھا ہونا چاہیے'' ''حَسُنَتْ مُسْتَقَرًا وَمُقَامًا'' وہ ان کا بہترین ٹھکانہ بھی ہوگا اور قیام کی جگہ بھی''۔

عبودیت وانابت کے بغیر کوئی وقعت وحیثیت نہیں

''قُلْ مَا يَعْبَؤُبِكُمْ رَبِّی لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ'' آپ (عام طور پر لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میرا رب تمہاری ذرا بھی پرواہ نہ کرے گا اگر تم عبادت نہ کرو گے۔

یہاں عبادت کا مفہوم صرف فرائض مقررہ کی ادائیگی نہیں، بلکہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنا اس کی رضا جوئی اور خوشنودی کو سب پر مقدم رکھنا اور دین کو وسیع تر آفاقی وعالمی پیمانہ پر پھیلانے کی سعی کرنا بھی اس میں داخل ہے، لہذا اگر مسلمانوں کا رشتہ عبودیت کی زندگی سے منقطع ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا رشتہ زندگی سے منقطع ہو گیا......اور ان کی حیثیت دنیا کی دوسری قوموں کی طرح رہ گئی کہ اگر وہ دنیا کے عام قانون حیات کے مطابق ترقی وخوشحالی کے کام کریں گے تو ترقی و خوشحالی ہوگی

اوراد بار وزوال کی راہ پر چلیں گے تو ان کے نصیب میں ذلت وزوال آئے گا بلکہ عام قانون کے مطابق جس قدر ذلت وادبار ہونا چاہیے اس سے زیادہ ذلت ورسوائی کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ دوسری قوموں کی بقاء وتحفظ کو کسی شرط سے مشروط نہیں کیا گیا تھا اور ان کے حق میں یہ آیت کریمہ صادق آئے گی۔ (۱)

"قُلْ مَايَعْبَؤُ بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ" "کہدو کہ اللہ تبارک وتعالی تمہاری کوئی پرواہ نہیں کرے گا اگر تمہاری دعاء نہ ہو" اگر تم اللہ سے دعاء نہ کرو، عبودیت وانابت کا اظہار نہ کرو اور دعوت کا کام نہ کرو۔

"فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَاماً" اب یہ منکرین مکہ اور منکرین قریش ان کو خطاب ہے کہ جہاں تک تمہارا تعلق ہے "تو تم نے جھٹلادیا" "فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَاماً" تو عنقریب تمہارے لیے وبالِ جان بن جائے گا۔ (۲)

---

(۱) اقوام عالم کے درمیان اسلامیہ کا حقیقی وزن: ۱۶-۱۷

(۲) درس قرآن، سورۂ فرقان: ۶۱-۷۷ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ اقتباسات حسب ذیل کتب سے باختصار بالترتیب اخذ وتلخیص کئے گئے ہیں: ☆ تحفۂ برما: ۳۳ ☆ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر: ۱۴۳ ☆ دستور حیات: ۴۳ ☆ تہذیب وتمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات: ۸۱-۸۲ ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی (تلخیص): ۱۶۳-۱۶۸ ☆ اقوام عالم کے درمیان اسلامیہ کا حقیقی وزن: ۱۶-۱۷

مومن کامل کے اوصاف (۱)

قَدْاَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ، الَّذِيْنَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ، اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَامَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ، فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ، فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُلٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ، وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ، أُوْلٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ، الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ. (المؤمنون: ۱-۱۱)

"بیشک ایمان والے رستگار ہوگئے، جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں، اور جو بیہودہ باتوں سے منہ موڑے رہتے ہیں، اور جو زکوۃ ادا کرتے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا کنیزوں سے جواُن کی ملک ہوتی ہیں کہ اُن سے مباشرت کرنے سے انہیں ملامت نہیں، اور جو ان کے سوا اوروں کے طالب ہوں وہ خدا کی مقرر کی ہوئی حد سے نکل جانے والے ہیں، اور جو امانتوں اور اقراروں کو ملحوظ رکھتے ہیں، اور جو نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، یہی لوگ میراث حاصل کرنے والے ہیں، یعنی جو بہشت کی میراث حاصل کریں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔

محبوبِ الٰہی صفات کا تذکرہ

قرآن مجید سارا اللہ کا کلام ہے اور کلام صاحب کلام کے مرتبے اور مقاصد کے مطابق ہوتا ہے، دونوں کا فرق سمجھیں، مرتبے اور مقاصد کے مطابق ہوتا ہے اس لیے سارا اللہ کا کلام ہے اور سارا معجزہ ہے اور سارا انسانی زندگی اور فلاح دین ودنیا اور کمالِ انسانی ہی نہیں، بلکہ خلقی جس لیے اللہ نے پیدا کیا ہے انسان کے ذہن سے وہ ایک محدود تخیل ہوتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے انسان کے پیدا کرنے کے مقصد کی تکمیل کے لیے قرآن مجید کا ہر حصہ مفید ہے اور دستور العمل ہے، لیکن یہ آیات جو ابھی آپ کے سامنے پڑھی گئیں ہیں یہ اپنے خاص طرز کی ہیں، یعنی کلام میں تنوع ہوتا ہے، کلام میں مراتب بھی ہوتے ہیں، متکلم کی شان کے مطابق، کوئی اس سے فروتر نہیں ہوتا لیکن متکلم کے مقاصد کے مطابق اس میں تنوع ہوتا ہے یہ سورت اس حیثیت سے کہ اس میں زندگی کا پورا دستور العمل پیش کر دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کو جو صفات محبوب ہیں وہ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

''افلح'' کی وسعت وجامعیت

''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْن'' پہلی بات تو یہ ہے کہ دیکھنے میں یہ الفاظ عام زبان کے معلوم ہوتے ہیں، ''بیشک کامیاب ہوئے اہل ایمان'' کامیاب اور یہ کہنا ''کامیاب ہوا'' یہ کہنے والے کے درجے کے اور کہنے والے کی عظمت کے، کہنے والے کی شان کے، کہنے والے کے علم کی وسعت کے، کہنے والے کی قدرت کی وسعت کے، اور کہنے والے کے منشاء اور مقصد کے مطابق ہوا کرتا ہے (ایک استاد کہتا ہے یہ کامیاب ہوگیا، مطلب یہ کہ یہ پاس ہوگیا، طلبہ بہت سے بیٹھے ہیں، سب کی رعایت سے کہہ رہے ہیں، ایک استاد کہتا ہے درجہ میں یا باہر کہتا ہے کہ فلاں کامیاب ہوگیا ہے، فوراً ذہن جائے گا کہ یہ امتحان میں پاس ہوگیا، ایک تاجر کہتا ہے فلاں کامیاب ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا دوکان چل گئی، کاروبار اس کا چلنے لگا، ایک حکومت کہتی ہے فلاں ملک کامیاب ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو فتح ہوئی، یا اس کے سیاسی حالات، انتظامی حالات بہتر ہیں، یا اس کے پاس اچھی فوجی طاقت ہے، ایک

شاعر کہتا ہے کہ فلاں آدمی کامیاب ہوا، فلاں ہمارا شاگرد کامیاب ہوا، مطلب یہ کہ شعر کہنے پر قادر ہوا، ایک ادیب کہتا ہے، اسی طرح مصنف کہتا ہے، تو جس ذوق اور جس کا جو مشغلہ ہے اور جو اس کے نزدیک قابل تعریف ہے اس کے مطابق سمجھ میں آئے گا، جب اللہ تبارک وتعالیٰ جو قادر مطلق ہے، حکیم برحق ہے، خالق ارض وسماوات ہے، مالک خزائن السماوات والارض ہے وہ کہتا ہے کہ ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤمِنُونَ'' تو اس ''أَفْلَحَ'' کو یہ عربی کا ایک لفظ ہے ''کامیاب ہوا'' اس کو اس طرح کہے ''کامیاب ہوا'' کے معنی میں نہیں سمجھنا چاہیے جیسے کہ مختلف زبانوں میں، خود عربی زبان میں ''نجح'' کے معنی میں ''فاز'' کے معنوں میں ''سبق'' کے معنی میں ''سعد'' کے معنوں میں، اس میں نہیں لینا چاہیے، دوسری زبانوں میں آپ ترجمہ کرسکتے ہیں، جب اللہ کہتا ہے ''فلاں کامیاب ہوا'' اس نے فلاح پائی، تو اس لفظ کی عظمت کو، وسعت کو، ندرت کو، جامعیت کو، ایک بڑی نعمت اور بڑی بشارت کے طور پر اس لفظ کو سمجھنا چاہیے، کیا کامیابی ہے، وہ جس کے ہاتھ میں کامیابی ہے اور کامیابیوں کا خالق ہے، دونوں ہے اور کامیابی کی اشیاء کا بھی خالق ہے اور کامیابی کے اسباب ووسائل کا بھی خالق ہے۔ جب وہ کہتا ہے، کامیاب ہوئے تو کامیابی کا جو بڑے سے بڑا بلند تخیل ہوسکتا ہے اور پیمانہ ہوسکتا ہے سامنے رکھنا چاہیے، یعنی ''وہ خدا کے یہاں مقبول ہو'' سب سے بڑی اصل چیز ہے خدا کے یہاں مقبول ہوا، خدا اس کو مدرسی زبان میں پاس کررہا ہے اور پاس ہی نہیں کررہا ہے، بلکہ درجہ اول کا نمبر دے رہا ہے۔ ''قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤمِنُونَ''۔

اور ہم پڑھتے چلے جاتے ہیں قرآن مجید، ذہن کام ہی نہیں کرتا ہمیں عربی اتنی آتی ہے کہ ''أَفْلَحَ'' کے معنی سمجھتے ہیں کہ ہاں بہت بولتے رہتے ہیں ''أَفْلَحَ فُلَانٌ'' ''ذَهَبَ فُلَانٌ لِغَرَضٍ مِنَ الاَغْرَاضِ إِلَى الْبَلَدِ الْفُلَانِي'' ''فَأَفْلَحَ'' یہ ''أَفْلَحَ'' کا لفظ ایسے معنوں میں کم بولا جاتا ہے عربی میں ''نَجَحَ'' وغیرہ کے چھوٹے لفظ بولے جاتے ہیں، لیکن قرآن مجید کی زبان کا خاص لفظ جو ہے وہ ''أَفْلَحَ'' ہے فلاح پائی، اب یہ ''فلاح'' جو ہے اس ''فلاح'' کا جو تصور ہے وہ کہنے والے کی عظمت، کہنے والے کی سخاوت اور کہنے والے کے جو مطلوبات ہیں، معیارات ہیں ان کے مطابق سمجھنا چاہیے، ''کامیاب ہوئے مومنین'' مطلب یہ کہ دنیا کی

زندگی میں اللہ کے جو مقبول بندے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نصرت ان کے ساتھ ہے اللہ تعالیٰ کی رضا ان کے ساتھ ہے اور یہاں سے جانے کے بعد جنت ان کو ملے گی اور جنت کی خالی جو نعماء ہیں وہی نہیں بلکہ "ورضوان من اللہ اکبر" جو اصل چیز ہے جنت کا جو اصل امتیاز ہے "وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ أَکْبَرُ" وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ایک نشان ہے۔

تو اس لیے ہم نے کہا کہ "أَفْلَحَ" جو مفردات اور کلمات کثرت استعمال سے زبان سمجھنے والوں کے لیے ان کی قدر کرنا اور ان کی پوری وسعت کو سمجھنے کی عادت جاتی رہتی ہے اس لیے بتانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱- کمالِ خشوع

فرماتا ہے "اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلَاتِھِمْ خَاشِعُوْنَ" "کامیاب ہوئے اہل ایمان جو کہ اپنی نماز میں خاشع ہوتے ہیں" جو نمازیں خشوع کے ساتھ پڑھتے ہیں یعنی متوجہ الی اللہ ہوتے ہیں، منہمک ہوتے ہیں اور غیر اللہ سے بالکل یکسو ہوتے ہیں۔ جہاںتک عربی زبان کا تعلق ہے اس "خشوع" اور "خوف" کے لفظوں میں یہ ضرور یاد رکھئے آپ کہ زبانوں کے جو الفاظ ہیں ان کو مترادف کہا جاتا ہے، اس مترادف میں بڑی غلط فہمی ہے جو زبان کے ماہرین ہیں کہتے ہیں مترادفات کا وجود ہی نہیں اصل میں یعنی بالکل دو لفظوں کے ایک ہی معنی ہو، یہ نہیں ہوتا، ایک درجہ میں یہ بات ہوتی ہے یعنی کسی چیز میں اشتراک ہوتا ہے، یا مثلاً دس اگر جز ہیں تو پانچ میں اشتراک ہوتا ہے کبھی سات آٹھ میں اشتراک ہوتا ہے کبھی نو میں اشتراک ہو جاتا ہے لیکن ایک جز پھر بھی باقی رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ لفظ وضع کیا گیا ہے تو "خوف" ہے "وجل" ہے "اشفاق" ہے سب الفاظ ہیں۔

نماز سے معلوم ہوتا ہے کہ "خشوع" کسے کہتے ہیں، ورنہ لفظ تو عربی میں لغت کا ایک لفظ ہے کہ جو اپنی نماز میں "خشوع" سے کم لیتے ہیں، "خاشع" ہوتے ہیں، لیکن بعض مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ اولیاء کرام کے اور مشائخ عظام کے واقعات میں کہ بڑی سے بڑی چیز گذر گئی بڑا سے بڑا واقعہ گزر گیا خبر ہی نہیں ہوئی کیا ہوا؟ اور خود ان پر بھی بعض مرتبہ ایسی کوئی چیز طاری ہوئی، یا اطلاع

ہوئی اور بالکل انہوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، ''خشوع'' کا لفظ وہ ہے جو روح، قلب، جسم، تینوں پر اثر انداز ہو۔ وہ خشوع ہے اور خوف یہ ہے کہ آدمی ذہنی طور پر ڈر جائے، گھبرا جائے، ایسے میں ''وجـــل'' کا لفظ ہے، قلب صرف اس سے متاثر ہوتا ہے، جتنے لفظ ہیں ان سب کے الگ الگ حدود ہیں، یہ نماز کے لیے جو نماز کا انہماک ہے، توجہ الی اللہ ہے اس کے لیے ''خشوع'' ہی کا لفظ مناسب تھا، عربی زبان کی وسعت کے باوجود '' اَلَّذِيْنَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ'' وہ لوگ کہ جو اپنی نماز میں سہمے ہوئے ہوتے ہیں اور یکسو اور متوجہ ہوتے ہیں۔

۲-لغو سے اعراض

''وَالَّـذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ'' اور وہ لوگ کہ جو لغو چیز سے اعراض کرنے والے ہیں، بظاہر دیکھو، اللہ تبارک وتعالی کی توفیق ہے کہ دونوں میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوئی کہ یہیں اس کے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، کہیں بھی کہا جا سکتا تھا، جو لوگ اپنے نماز میں خشوع میں رہتے ہیں اور جو لغو سے اعراض کرنے والے ہیں، ان دونوں میں جوڑ کیا ہے؟ رشتہ کیا ہے؟ نماز نماز ہے، عبادت ہے اور چیز تو اور ہے وہ بازار میں ہوتی ہے، گھر میں ہوتی ہے، وہ متنازع چیزوں میں ہوتی ہے وہ جو چیزیں کشش رکھتی ہیں ان دونوں کا ذکر کیوں کیا؟ مگر اس میں ایک بڑی دونوں میں مناسبت ہے اور تلازم ہے وہ یہ کہ جو اتنے بڑے، اتنے بڑے آقا سے، ہم کلام ہوتا ہے اور اس میں اس پر کیفیت طاری ہوتی ہے اس کی شان یہ ہونی چاہیے کہ لغو میں اس کا جی نہ لگے اور لغو سے وہ اعراض کرے۔ (۱)

(۱) ہم نے اپنے بچپن میں ایک قصہ سنا تھا، لطیفہ ہے مگر اس سے ذرا سمجھ میں آئے گا اس زمانے میں انگریز تو آقا سمجھے جاتے تھے، صاحب آئے اور سرکار آئے، تو کسی زمیندار کو کسی ڈپٹی کمشنر نے بلایا بات کرنے کے لیے، ان کو بلایا ہی نہیں تھا کبھی، وہاں جانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا وہ آئے تھوڑی دیر بیٹھے بات کی، اب گھر میں آئے تو بات نہیں کرتے تھے، ایک گھنٹہ گذرا، دو گھنٹے گذرے، کیا بات ہے؟ کوئی تکلیف، بہت پوچھنے پر بتایا کہ میں ایسے سے بات کر کے آیا ہوں کہ اس کے بعد اب کسی سے بات نہیں کر سکتا، جو صاحب سے بات کر کے آیا سرکار سے بات کر کے آیا اس کے بعد وہ اب بچوں سے بات کرے، نوکروں سے بات کرے؟ گھر والوں سے بات کرے؟ تو ہے تو یہ بالکل فضول بات، لیکن یہاں پر دونوں کی مناسبت یہ ہے۔

جس کو اللہ تعالیٰ نماز میں خشوع نصیب فرمائے اس کا لغو میں جی کیسے لگ سکتا ہے؟

''وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْن'' دونوں میں بہت ہی لطیف مناسبت اور رشتہ ہے پھر بھی نماز کو تبدیلی لانے والی چیز، نماز کو ایک انقلاب انگیز عنصر ہونا چاہیے، فعال اور موثر عنصر ہونا چاہیے نماز بھی چلتی ہے اور غیبت بھی چل رہی ہے، نماز بھی چلتی ہے اور باتیں بھی چل رہی ہیں، نماز بھی چلتی ہے اور کھیل تماشے، ویسے ریاضت کے طور پر کوئی کرے تو دونوں میں جتنی اونچی جگہ پہونچ جائے آدمی تو اس کے بعد خیال رکھنا چاہیے کہ اب اسے اتنا نیچے بھی نہیں جانا چاہیے کہ دونوں میں کوئی کسی قسم کی مناسبت نہ ہو، کسی کو عہدہ ملتا ہے نہ تو پھر وہ بہت سی چیزیں خود بخود نہیں کرتا اور نہ اس سے توقع کی جاتی ہے۔ مثلاً کسی کو فلاں عہدہ مل گیا، وزارت مل گئی اب وہ بازار میں کھڑا ہوا ہے اور بازاریوں سے بات کر رہا ہے اور تماشے دیکھ رہا ہے ایسا نہیں ہوتا، تو دونوں میں ایک خاص تعلق ہے، یہ اعجاز ہے قرآن کا، اس کو بعد میں بھی کہا جا سکتا تھا، لیکن نماز کے ساتھ اس لیے کہا کہ نماز کو تبدیلی لانے والا اور زندگی کو ڈھالنے والا، زندگی کو ایک نیا سانچہ اور ایک نیا ذوق، نئی طلب اور نیا ذہن عطا کرنے والا ہونا چاہیے اور اس میں پھر گنجائش نہیں۔

۳-زکوۃ یا تزکیہ کی فکر

''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكوٰةِ فَاعِلُوْنَ'' اس کی تفسیر دو کی ہیں مفسرین نے، ایک تو یہ جو اپنے نفس کی صفائی اور اپنے اخلاق کے سنوارنے اور اپنی اندرونی اصلاح کی فکر کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں، یہاں ''زکوۃ'' سے مراد ''تزکیہ'' ہے، تزکیہ لکھا بھی ہے اور عام ترجمہ اور تفسیر یہ ہے کہ جیسے نماز ایک رکن ہے، زکوۃ بھی ایک رکن ہے، ادھر نماز کا ذکر تھا یہاں زکوۃ کا ذکر ہے، دونوں معنی کئے گئے ہیں ''اور وہ لوگ جو زکوۃ کے ادا کرنے کے والے ہوتے ہیں''۔

۴-شرمگاہوں کی حفاظت

''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْن...... '' ''اور وہ لوگ کہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

اب بظاہر کوئی انسان ہوتا، کوئی ادیب ہوتا، کوئی خطیب ہوتا تو اس کے کہنے میں ذرا اس کو تامل ہوتا کہ کیسی اونچی اونچی چیزیں نماز اور زکوۃ کا ذکر ہے۔ پھر اب یہاں پر یہ کہہ رہے ہیں لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات غنی ہے اور اس کے سامنے انسانوں کی کمزوریاں اور انسانوں کی کمزوریوں کی لاکھوں برس کی تاریخ ہے اور مشاہدہ ہے اور وہ خالق ہے اور وہی قدرت دیتا ہے تو یہ اسی کے کہنے کی بات تھی کہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک طرف عابد ہوتا ہے ایک طرف بڑا صدقہ خیرات کرنے والا ہوتا ہے ایک طرف اس میں بے احتیاط ہوتا ہے تو یہ بھی ہمیں سبق دیدیا گیا ہے کہ یہ نہیں سمجھنا چاہیے، اب ان چیزوں کے احتیاط کی ضرورت نہیں، یا ان چیزوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور بہت اس کے واقعات معاشرے میں گذرتے رہے ہیں اور گذرتے رہتے ہیں۔

"اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ أوْ مَامَلَكَتْ أيْمَانُهُمْ، فَإنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ" (لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی شرعی باندیوں سے حفاظت کرتے ہیں کیونکہ ان پر اس میں الزام نہیں، "فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَاءَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْعَادُوْنَ" پس جس نے اس کے علاوہ کچھ چاہا تو وہ لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔

۵- امانت وعہد کا پاس

"وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ" اور اپنے عہد کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کا پاس کرتے ہیں اور ان کی پابندی کرتے ہیں کہ اگر کسی کی امانت ہے ادا کردیا۔

اب بہت سے ہمارے صالحین ایسے ہیں دیندار لوگ، نماز پڑھتے ہیں، نماز میں ذوق آیا ہے خوب جی لگتا ہے، لیکن امانت وغیرہ کے لحاظ سے اور امانت کا وسیع مفہوم ہے، امانت یہ نہیں کسی نے پیسے رکھوائے، رقم رکھائی تھی یہ امانت ہے، امانت کا دائرہ بہت وسیع ہے، اپنا فرض منصبی ادا کرنا حقوق ادا کرنا، قرض ادا کرنا اور احسان ادا کرنا، یہ سب چیز اس میں آتی ہے تو وہ اپنی امانتوں کی اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں کہ صرف اللہ تعالیکا حق ادا کرنا اور اس کی عبادت کر لینا کافی نہیں، بلکہ جس کو کہتے ہیں حقوق العباد، حقوق اللہ کے

ساتھ حقوق العباد کا خیال اور ہماری دینی جماعتوں میں یہ کمزوری کبھی کبھی داخل ہو جاتی ہے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حقوق اللہ تو ادا کیے کوشش کی لیکن حقوق العباد میں کوتاہی ہوتی ہے۔جیسا بھائی کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے، محلے والوں کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے جیسے اولاد کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے، جیسے شرکاء جو ہیں تجارت وغیرہ میں، ان کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے اس میں کمی ہوتی ہے آدمی کہتا ہے، کیا ہے اس میں تو آپس کے لوگ ہیں بھائی بندے ہیں کوئی خدا کا گناہ تھوڑے ہی کر رہے ہیں، یہ خدا ہی کا گناہ ہے۔

۶-اوقات نماز کے پابند

"وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ" "اور وہ لوگ کہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں" وہاں تو نماز کی کیفیت کا ذکر تھا، "خشوع" کا اور یہاں نماز کے اوقات کا ذکر ہے نماز کے اوقات کی تعداد، نماز کے مقررہ نصاب اس کا ذکر ہے، اگر بہت اچھی نماز پڑھی ہے، ایک وقت کی یہ کافی نہیں ہے کہ کوئی نماز چھوٹ جائے تو اب کیا ہے، فجر کی نماز تو ایسے مزہ سے پڑھی کہ بس دنیا جہاں کی خبر نہیں تھی ہمیں اور وہ لطف آیا اور ظہر کی نماز میں سو گئے یہ نہیں کوئی کیسی اچھی نماز پڑھی جائے دوسری نماز اپنی جگہ پر ہے۔

جنت الفردس کے وارث

"أُوْلٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ، الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ"

"یہ وارث ہیں جو کہ فردوس کے وارث ہوں گے" اتنے ہی نہیں کہا گیا کہ " أُوْلٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُوْنَ، الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ " بلکہ ان کا استحقاق بھی بتایا گیا ان کی صفت اور اسم فاعل کے وزن کے ساتھ کہ یہ ورثہ پانے والے ہیں، جو کہ "فردوس" کا ورثہ پائیں گے، یعنی ان کے اندر یہ استحقاق پیدا ہو گیا ہے، صفت پیدا ہو گئی ہے،" وَهُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ" اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۱)

(۱) المومنون: ۱-۱۱ (غیر مطبوعہ)

یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور اس دنیا میں بھی، دین کا جو مقام ہے جو مرتبہ ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اس کی عزت ہے جس کا تو تقاضا یہ ہے کہ آخرت ہو اور آخرت میں وہ سب کچھ ملے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آخرت کی زندگی بنائی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ان انعامات کی اور اس خوشنودی کی یہاں سمائی نہیں۔

اصل تو اس دین کا فائدہ اور اس دین کی برکت ظاہر ہوگی مرنے کے بعد، آنکھ بند ہوئی اور پتہ چل گیا کہ نماز کیا دلا رہی ہے اور کلمہ کیا دلا رہا ہے اور کہاں ہو تم......؟ اللہ نصیب کرے ہر مسلمان کو، لیکن اس دنیا میں بھی اس شریعت کی برکت ظاہر ہو کر رہتی ہے۔(۱)(۲)

---

(۱) تحفۂ دین ودانش (تلخیص): ۹۹-۱۰۰

(۲) درس قرآن، المومنون: ۱-۱۱ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ تحفۂ دین ودانش (تلخیص): ۹۹-۱۰۰

مومن کامل کے اوصاف (۲)

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِآیَاتِ رَبِّهِمْ یُؤْمِنُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا یُشْرِكُوْنَ. وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا أٰتَوْا وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ اِلٰی رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ. أُوْلٰئِكَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ. وَلَا نُكَلِّفُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا. وَلَدَیْنَا كِتَابٌ یَنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ﴾ (المؤمنون: ۵۷-۶۲)

”بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرے ہوئے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور وہ لوگ کہ جو بھی دے سکتے ہیں دیتے ہیں اور (اس کے ساتھ) ان کے دل ڈرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف واپس جانے والے ہیں، یہی لوگ ہیں جو نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ان (خیرات) کے لیے آگے بڑھنے والے ہوتے ہیں اور ہم نہیں مجبور کرتے کسی نفس کو مگر اسی چیز کا جو اس کی گنجائش میں ہے اور ہمارے پاس کتاب ہے جو حق بولتی ہے اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے گی“۔

اپنے رب کے خوف سے لرزاں وترساں

"اِنَّ الَّذِیْنَ ھُمْ مِنْ خَشْیَۃِ رَبِّھِمْ مُشْفِقُوْنَ" " بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے لرزاں وترساں ہیں"۔

"مُشْفِقُوْنَ" ڈرے ہوئے ہیں "مُشْفِقُوْنَ" یہ عربی میں نہیں بلکہ ہر زبان میں ہر لفظ کے بارے میں جو ماہرین السنہ ہیں، کہتے ہیں ک مترادفات کا وجود ہی نہیں، کوئی کسی فرق کی وجہ سے لایا جاتا ہے، تو یہ جو "مُشْفِقُوْنَ" ہے اس کو بھی عربی کے لحاظ سے سمجھنا چاہیے، لرزاں اور ترساں ہم نے اس کا ترجمہ کیا ہے، خوف ایک ذرا ظاہری چیز ہے اور محدود ہے کسی کسی وقت ڈر جانا، یا کسی خاص چیز سے سوچ کر کے ڈر جانا، لیکن جو کیفیت طاری ہو جائے اور آدمی ڈرا ہوا سہا ہوا جس کو ہم اردو میں سہا ہوا کہتے ہیں، جو ڈررنے والا اور سہا ہوا دونوں میں جو فرق ہے، وہی فرق "مُشْفِقُوْنَ" میں ہے یہاں پر "مُشْفِقُوْنَ" ہی کی ضرورت تھی، بیشک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے لرزاں اور ترساں ہیں اور یہ صحابہ کرام کی اور صالحین امت کی اور عاملین قرآن کی صفت تھی، ہر وقت ان پر اگر آپ ان کے حالات پڑھیں کتابوں سے معلوم ہوگا اور اگر اللہ نے موقع دیا بقیہ جو لوگ جانشیں ہوتے ہیں ان کے راستے پر ہوتے ہیں تو آپ یہ دیکھیں گے کہ بالکل لرزاں اور ترساں ہیں، کسی چیز میں ان کو وہ لطف نہیں آتا جو لطف عام لوگوں کو آیا کرتا ہے، ہم نے خود ایسے نمونے دیکھے ہیں، آج یاد ہے کہ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے نبض دکھائی ہمارے سامنے ایک حکیم صاحب کو کہا کہ حکیم صاحب ایک منٹ جینے کو جی نہیں چاہتا، یعنی حالات سے اپنے انجام سے یہ سب سے ڈر ہے ایک منٹ جینے کو جی نہیں چاہتا اور لوگوں کو دیکھا ہے کہ نماز میں کس طرح ان پر گریہ طاری ہوتا تھا اور بہت سے لوگوں کی تو جان نکل گئی۔

"جس کا دل بالکل خدا کے خوف سے خالی ہے اور جس کے لیے خدا کے نام میں کوئی اثر اور کشش نہیں اس میں درحقیقت دین کا مادہ نہیں اور وہ گویا کہ دین کے حاسہ سے محروم ہے اور جب کسی کا کوئی حاسہ کم ہو تو اس کے محسوسات کا وہ کسی طرح حس اور ادراک نہیں کر سکتا"۔ (۱)

(۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۱۶۴

اپنے رب کی آیات پر ایمان

''وَالَّذِيْنَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ'' ''اور وہ لوگ جو اپنے رب کی آیات پر ایمان رکھتے ہیں'' یہ چیز ہر ایک کہہ سکتا ہے کہ کون مسلمان ہے جو اللہ کے کلام پر ایمان نہیں رکھتا اللہ کی خبروں پر ایمان نہیں رکھتا لیکن یہاں پر جس موقع پر یہ آیت آئی ہے وہ اس سے زیادہ کا مفہوم اور تاثر دیتی ہے، یعنی ایک تو ہے نظری، عقلی اور اعتقادی ایمان، سب اللہ کا کلام ہے، اللہ کی سب باتیں صحیح ہیں لیکن جب وقت آئے تو اس وقت اس کا استحضار ہو کہ یہ بات اتفاقاً نہیں ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور اسی میں رحمت ہے اور ایسے ہی ہونا چاہیے تھا، اللہ تعالیٰ کو اس کا کا اختیار ہے اور اس میں ذرا بھی شک نہ ہو ذرا بھی اعتراض نہ ہو ذرا بھی شکوہ نہ ہو وہ جو نظری اعتقادی ایمان ہے جو مشترک ہے سب مسلمانوں میں، جس کے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا یہ اس سے زیادہ کی بات ہے، ''وَالَّذِيْنَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ'' اور آیات میں بھی صرف آیات قرآنی نہیں بلکہ وہ نشانیاں جو اللہ تعالیٰ کی ظاہرہ ہوتی ہیں، کبھی ناراضگی کی، کبھی رضامندی کی، کبھی نعمت کی، کبھی نقمت کی سب ایمان ہو۔

شرک سے اجتناب

''وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ'' ''اور وہ لوگ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے''

اب آدمی کہے گا کہ جب اتنی بڑی تعریف کی، جو لوگ سہمے رہتے ہیں اللہ کے ڈر سے اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں'' اس کے بعد شرک کا کیا اندیشہ تھا، شرک کا کیا امکان ہے ان سے لیکن ہے یہ بات۔

''شرک کے معنی صرف یہ نہیں ہے کہ کسی کو خدا تعالیٰ کا ہم مرتبہ وہ ہم سر قرار دیا جائے بلکہ شرک کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کسی کے ساتھ وہ کام یا وہ معاملہ کرے جو خدا تعالیٰ نے اپنی بلند و بالا ذات کے ساتھ خاص فرمایا ہے اور جس کو ''عبودیت'' بندگی کا شعار بنایا ہے جیسے کہ کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونا کسی کے نام پر قربانی کرنا، یا نذریں ماننا، مصیبت و تنگی میں کسی

سے مدد مانگنا اور یہ سمجھنا کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور اس کو کائنات میں متصرف سمجھنا یہ ساری وہ چیزیں ہیں جن سے شرک لازم آتا ہے اور انسان ان سے مشرک ہو جاتا ہے خواہ اس کا یہ اعتقاد ہی کیوں نہ ہو کہ یہ انسان، فرشتہ، یا جن، جس کے سامنے وہ سجدہ ریز ہو رہا ہے یا جس کے نام پر قربانی کر رہا ہے، نذریں مان رہا ہے اور جس سے مدد مانگ رہا ہے اللہ تعالی سے بہت کم مرتبہ اور پست مقام ہے اور چاہے یہ مانتا ہو کہ اللہ ہی خالق ہے اور یہ اس کا بندہ اور مخلوق ہے اس معاملہ میں انبیاء، اولیاء، جن و شیاطین، بھوت پریت، سب برابر ہیں، ان میں سے کسی کے ساتھ بھی جو یہ معاملہ کرے گا وہ مشرک قرار دیا جائے گا''۔ (۱)

بعض مشرکانہ عقائد و اعمال

''یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ، ناخوشگوار اور بہت سے لوگوں کے لیے نامانوس ہو، مگر حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں میں کچھ مشرکانہ عقائد و اعمال پائے جاتے ہیں اور شرک جلی کے وجود کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اعتراف کے لیے تھوڑی سی قرآن فہمی اور کسی قدر اخلاقی جرآت کی ضرورت ہے، اگر شرک کی کوئی حقیقت ہے اور وہ ''عنقا'' کی طرح خیالی و فرضی پرندہ نہیں اور اگر قوموں اور ملتوں کے لیے ایک ہی میزانِ عدل اور ایک ہی پیمانۂ انصاف ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سے مسلمان (خواہ ماحول سے متاثر ہو کر خواہ علم اور صحیح تبلیغ کی کمی کی وجہ سے) اس ذہنی گمراہی اور عملی بے راہ روی میں مبتلا ہو گئے ہیں جس کو قرآن میں صاف صاف شرک کہا گیا ہے اگر کسی کو اس میں شبہہ ہو یا وہ کسی خیالی دنیا میں رہتا ہو تو کسی ''مرجع خلائق'' مزار پر جا کر اور کسی عرس میں شریک ہو کر دیکھ لے یا ان عقائد و خیالات کے سننے کی کوشش کرے، جو بہ کثرت عوام اور کہیں کہیں خواص نے اولیاء کرام، بزرگانِ دین اور اپنے سلسلہ کے مشائخ کے متعلق قائم رکھتے ہیں کہ ''صفت خلق'' (پیدا کرنے کی طاقت) ''ایجاد عالم'' (عالم کو عدم سے وجود میں لانے کی قدرت) اور مشکل سے ایک دو صفتوں کے علاوہ صفات و افعال الٰہی میں سے کون سی صفت

(۱) دستور حیات: ۷۷-۷۸

اور کون سا فعل وتصرف ہے جو انہوں نے ان بزرگوں سے منسوب نہیں کر رکھا ہے اور سجدہ سے لے کر دعا واستعانت تک کوون سا معاملہ ہے جو خدا کے ساتھ ہونا چاہیے، انہوں نے ان ہستیوں کے ساتھ روا نہیں رکھا ہے؟ قرآن مجید ہاتھ میں لے کر کسی بڑی بستی یا خوش اعتقادی کے کسی خالی مرکز میں چلے جایئے اور اس کا امتحان کر لیجئے''۔ (۱)

یہ اللہ تبارک وتعالی کے کلام ہی کی بات ہے ''وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ '' اس بس کے باوجود بعض مراحل ایسے آتے ہیں، ایک مومن کی زندگی میں کہ آدمی کو اس میں اندیشہ ہوتا ہے کہ شرک میں نہ پڑ جائے کہ یہ بات اس کی وجہ سے ہوئی، یہ ہم نے فلاں عمل کیا تھا، اس لیے ہمیں یہ انعام ملا، یہ فلاں آدمی ہم سے راضی ہے اس لیے ہمارا کام بن گیا اور آدمی کبھی کسی کی قدرت کو شریک کر لیتا ہے کہ اگر وہ اس مدد کرے تو یہ بات جو بالکل ناممکن ہے وہ ہو جائے تو یہ شرک یہ بت پرستی کا شرک ہے اس سے آگے اس سے زیادہ ممتد اور وسیع وطویل اور باقی رہنے والی چیز ہے ﴿وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ﴾ ''کسی حالت میں بھی یہ اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا'' نہ قدرت میں، نہ رحمت میں اور نہ سزا دینے کے اختیار میں اور نہ برکت ونحوست جسے کہتے ہیں، کسی چیز میں نہیں، یعنی یہی نہیں کہ یہ فلاں چیز کی نحوست ہوئی، یہ فلاں آدمی سے ہم نے اس طرح بات نہیں کی تھی، تو یہ ہمیں سزا ملی، اگر ہم اس طرح ملتے، خوشامد کرتے تو یہ بات نہیں ہوتی، تو یہ حضرات جن کی تعریف کی جا رہی ہے یہ توحید کامل کے اس مقام پر ہوتے ہیں جن کے یہاں وسوسہ بھی نہیں گذرتا کہ خدا کے سوا اس کائنات میں کوئی اور کچھ کر سکتا ہے۔

خیرات میں سبقت اور خوف خدا

''وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا أَتَوْا'' اور وہ لوگ کہ جو دیتے ہیں جو بھی دیتے ہیں ''وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ'' اور اس کے ساتھ ان کے دل ڈرتے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف واپس جانے والے ہیں، یعنی دیتے ہیں تو فخر نہیں کرتے، ہم نے یہ خیرات کی،

(۱) مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں: ۱۶-۱۷

ہم نے فلاں کا کام نکال دیا، فلاں کی مدد کردی، ہم نے فلاں کو کھانا کھلا دیا، وہ نیکی کے ساتھ ڈرتے رہتے ہیں کہ اللہ قبول فرمائے، قبول کرنے والا وہی ہے اور قیامت میں ہمیں اس کا اجر ملے اس میں ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہ ہو اس مال میں کوئی خرابی نہ ہو اس کے دینے کی حالت میں ہمارے دل میں کوئی فخر یا غرور نہ ہو تو یہ مقام ہے اولیاء اللہ کا اور خاصان خدا کا، کہ وہ عبادت کے کام، وہ سخاوت کے موقع پر صدقے کے موقع پر ایثار کے موقع پر بھی ڈرتے ہیں کہ یہ اللہ کو قبول بھی ہے یا نہیں۔

"وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ" ان کے دل اس وقت بھی ڈرتے ہوتے ہیں کہ اللہ کے یہاں جانا ہے۔ اگر اللہ نے یہ سوال کیا کہ کہاں سے لائے تھے؟ کیسے یہ ملا تمہیں، دیتے وقت یہ جذبہ تمہارے اندر کیوں تھا؟ فخر کیوں ہو رہا ہے تھا؟ یہ خیال کیوں آرہا تھا؟ کہ ابھی تک اتنی بڑی خیرات کسی نے نہیں کی، اتنا بڑا چندہ کسی نے نہیں دیا جو ہم نے فلاں ادارے کو دیا ہے ہم نے اتنے روزہ داروں کا روزہ کھلوایا، کس کو توفیق ہوتی ہے اور بہت سے جو خیرات اور نیکی کے کام ہیں وہ اپنے ذہن میں تصور میں لا کر آدمی کے ذہن میں ایک ذرا سا خود پسندی، ترجیح پیدا ہوتی ہے وہ لوگ جو دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حالت میں کہ ان کے دل ڈرتے ہوتے ہیں کہ وہ "أَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ"۔

"أُوْلٰٓئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ" "یہی لوگ ہیں جو نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ان خیرات کے لیے ان نیک کاموں کے لیے آگے بڑھنے والے ہوتے ہیں"۔

یعنی ان کے اندر سبقت کی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی خاصیت ہوتی ہے، استطاعت ہوتی ہے جذبہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے سے آگے بڑھ جائیں اور بڑھ جاتے ہیں۔

"وَلَا نُكَلِّفُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا" اب یہ جو اتنے بڑے بڑے کام بتائے، خیال یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ بھائی یہ کس سے ہو سکتا ہے اور کون کرے گا؟ تو اس کے بعد کہا اور ہم کسی نفس پر بھی اس سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے جو اس کی وسعت اور استطاعت سے زیادہ ہو یہ وہ ایک نفسیاتی طور پر (Psychological) پر ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ اللہ کے ڈر

سے ہمیشہ سہمے رہیں اور اس کی تمام آیتوں پر ہمارا ایمان ہو اور شرک کا کہیں شائبہ کیا تصور بھی نہ آسکے اور ہم دیں بھی خیرات بھی کریں اس کے بعد بھی ڈرتے رہیں، معلوم نہیں قبول ہو یا نہیں یہ تو بڑا مشکل ہے فرماتا ہے "وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" یہ ایسی بات نہیں ہے کہ جو بالکل انسان کی طاقت سے باہر ہو اور تکلیف مالا یطاق ہو اور ہم نہیں مجبور کرتے کسی نفس کو مگر اسی پر ہم نہیں مکلّف کرتے کسی نفس کو مگر اسی چیز کا جو اس کی وسعت کا ہے اس کی گنجائش میں ہے۔

"وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ" اور ہمارے پاس کتاب ہے جو حق بولتی ہے، ہر ایک کا اعمال نامہ ہے اور ہر ایک کا بالکل نقشہ ہے ہمارے یہاں ہر چیز لکھی ہوئی ہے محفوظ ہے اور ہم ان سب جزئیات سے واقف ہیں لہذا اُن کے ساتھ کوئی زیادتی کی جائے گی۔[1]

(۱) درس قرآن، سورۃ المومنون: ۵۷-۶۲ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ اقتباسات حسب ذیل کتب سے بالترتیب باختصار تلخیص و اخذ کئے گئے ہیں: ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۱۶۴ ☆ دستور حیات: ۷۷-۷۸ ☆ مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں: ۱۶-۱۷)

خلوص واستغناء

﴿قُلْ مَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَن يَتَّخِذَ إِلٰى رَبِّهِ سَبِيْلًا﴾
(الفرقان.۵۷)

''آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے اس (تبلیغ) پر کوئی معاوضہ (مالی یا جاہی) نہیں مانگتا، ہاں جوشخص یوں چاہے کہ اپنے رب تک (پہنچنے کا) راستہ اختیار کرلے''۔

اندازِ خسروانہ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''قُلْ مَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ'' ''کہہ دیجئے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں''۔

آپ دیکھئے سورہ شعراء میں کہ ایک ایک نبی کا نام اللہ تعالیٰ لیتا ہے اور ہر ایک کہتا ہے ''وَ مَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ'' یعنی ایک کافی تھا لیکن اس نے پھر حضرت نوح کا نام لیا تو کہا، ہود کا نام لیا تو کہا صالح کا نام لیا تو کہا حضرت شعیب کا نام لیا تو کہا ہر ایک کہتا ہے ''وَ مَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ'' کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یا ''اجر'' لے لیں یا ''اجرت'' لے لیں!

اس میں ایک بات یادرکھنے کی ہے خاص طور پر دینی علم حاصل کرنے والوں کو

اور آئندہ دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے والوں کو کہ یہ بنیادی شرط ہے کہ ''وَ مَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ''۔

اور اللہ تبارک وتعالی نے فطری خلقی اور دائمی طور پر اس میں بہت بڑی طاقت رکھی ہے! ساری خوبیاں جمع ہوں، لیکن آدمی نے کچھ اپنی ضرورت کا اظہار کیا، کسی طریقے سے بھی اشارے کنایہ سے بلاغت کے ساتھ تو ایک دم سب پر پانی پھر جاتا ہے، اگر پوری نہیں تو کبھی آدھے پر پانی پھر جاتا ہے اور کبھی چوتھائی پر!

مثلاً تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ سب سے زیادہ جو چیز متاثر کرتی ہے بڑے بڑے دولتمند کو اور کروڑ پتیوں کو وہ ''استغناء'' ہے۔ اللہ تعالی نے اس میں بالذات خاصیت رکھی ہے، بعض چیزوں میں بالذات خاصیت ہوتی ہے اسی لیے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب ملکہ سبا نے تحفہ بھیجا تو انہوں نے کہا، تم میری مدد کرنا چاہتی ہو کچھ مال سے، ہمیں جو اللہ نے دیا ہے،..... وہ جو ملکہ سبا بعد میں ایمان لائی تو اس میں اس کا یعنی پہلا اثر اس کا پڑا ہوگا۔

یہ تو خیر حضرت سلیمان علیہ السلام تھے، ہر طرح سے ان کے لیے مناسب نہیں تھا ان کو ضرورت ہی نہیں تھی لیکن ہم آپ کو بتاتے ہیں، بزرگان دین کی سیرت پڑھ کر اور جنہوں نے اصلاحی کام انجام دیئے اور اللہ نے جن کے ذریعے سے اسلام اس وقت تک محفوظ رکھا ہو یعنی اسلام کو اس کے احکام اور اس کی اشکال کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی روح اور طاقت کے ساتھ جو اس وقت تک محفوظ رکھا ہے ان میں سب سے بڑی صفت یہ تھی کہ اجر کے طالب نہیں ہوتے! لوگوں کو معلوم تھا کہ اس پر کوئی معاوضہ نہیں!!! اس میں اللہ تعالی نے (سحر کا لفظ بے ادبی ہے) ایسی دل کشی اور ایسی دلوں کو جیت لینے کی اور دلوں کو فتح کرنے کی طاقت رکھی ہے جو نہ کسی بلاغت میں ہے نہ کسی خطابت میں ہے۔

یعنی ایک شخص بہت بڑا مقرر ہے اور مسحور کر دینے والا ہے، بڑا اعالی نسب ہے اور بہت وجاہت سب کچھ لیکن اگر اس میں کسی طریقے سے یہ معلوم ہوگیا کہ یہ چاہتا ہے کہ کچھ اس کی خدمت کی جائے، کچھ اس کی قدر کی جائے، کسی (بلاواسطہ یا بالواسطہ) طریقے پر اس کی مدد کی جائے تو تقریباً سب پر پانی پھر جاتا ہے۔

اور یہ دیکھا ہے کہ اس میں اتنا اثر ہے کہ اگر کسی شخص نے اس کا اظہار کر دیا تو جو دینے والا ہے اس کے نزدیک یہ کوئی فائدے کی بات نہیں ہوگی، یعنی وہ اس پر خوش نہیں ہے کہ ہمارا پیسہ بچ گیا بلکہ اس کا اثر ہی پڑتا ہے۔

استغناء و بے غرضی کی طاقت وتاثیر

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی سنت ہے کہ جو مانگے لوگ اس سے گھبرائیں اور جو دامن پھیلائے اس سے بھاگیں اور جو اپنی مٹھی بند کر لیے اور دامن سمیٹ لے اس کے قدموں میں پڑیں اور خوشامد کریں کہ وہ کچھ قبول کر لے۔ استغناء میں ازل سے محبوبیت ومقبولیت ہے اور طلب میں ذلت، گویا مستغنی سے احتیاج کا معاملہ ہے اور طالب سے استغناء کا یہ بھی ایک ایسی سنت خداوندی ہے جس میں زمانہ کی تبدیلی کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں، چوتھی صدی کے حالات آپ پڑھیں تو یہی نظر آئے گا، آٹھویں صدی کے پڑھیں گے تو اسی طرح کے واقعات ملیں گے اور چودھویں صدی میں بھی یہی ہو رہا ہے(۱)

یہ تجربہ ہوا اور علمائے دین ۲ کے جو حالات پڑھے ان میں کہ بالکل وہ انہوں نے گویا قسم کھائی ہے کہ کسی والی سلطنت سے کسی سرمایہ دار سے، کسی صحب وجاہت سے، کسی سے کچھ نہیں لینا ہے، (یہ بات سب کو معلوم تھی اور یہ قصے ہم نے یہاں سنائے بھی) ایک چھوٹی سی مثال دیتے ہیں۔

حضرت شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ (جہاں ہم آپ بیٹھے ہوئے ہیں) پروانہ آتا ہے عالمگیر کی طرف سے جاگیر کا پروانہ، اس زمانہ میں جاگیر تھی اور حضرت صاف معذرت کر دیتے ہیں، وہ آدمی (قاصد) بڑا ہوشیار تھا اس نے سمجھا کہ یہاں تو دال گل نہیں سکتی، لیکن اگر اس کے گھر والوں سے کہا جائے (اس لیے کہ اول تو وہ علمی حیثیت سے بھی اور دوسرے روحانی حیثیت سے بھی اس درجہ فائق نہیں ہیں، خواتین میں اور مردوں میں بڑا فرق ہوتا ہے چاہے وہ کسی کی بیوی ہو کسی کی بیٹی ہو اس لیے کہ ضرورتیں تو ان کو پوری کرنا پڑتی ہے اور یہ تو پکا پکایا کھانا کھاتے ہیں، تو ان سے کہا جائے) تو ان کی ضرورت ہوگی

اوراس بات کا احساس ہوگا تو کہد یں گی، کیا حرج ہے لےلواس کو (اس لیے کہ کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں تھا)۔

توانہوں نے (اہلیہ) کہا (ہم اپنے بزرگوں سے سنا ہے یہ قصہ) کہ اللہ تعالی نے ہمارا نان ونفقہ شاہ علم اللہ کے ذمہ کیا ہے، عالمگیر کے ذمہ نہیں، تو مسئلہ بتایا انہوں نے کہ بیوی کا نان ونفقہ تو شوہر کے ذمہ ہوتا ہے، کسی بادشاہ کے ذمہ نہیں ہوتا۔(۱)

تو استغناء سے ہدایت پھیلتی ہے اور خاص جوڑ ہے ہدایت کا استغناء سے اسی لیے تو قرآن شریف میں جا بجا اسکے اشارے ملتے ہیں اور یہ جواب ہوگیا ہے کہ ہر ایک سے مانگنے کے لیے تیار اور ہر ایک سے لینے کے لیے تیار اور ہر ایک کے محتاج اس کی وجہ سے بڑی دقت ہو رہی ہے اور اس میں تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے۔

"قُلْ مَاأَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ" کہہ دیجئے کہ میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں۔

"اِلَّا مَنْ شَاءَ أَن يَتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلاً" سوائے اس کے کہ جس نے چاہا کہ وہ اپنے رب کا رستہ حاصل کرے، ہدایت پائے تو یہ اجر تو ہے، یعنی یہ تمہاری اجرت تو میں قبول کرنے کے لیے تیار ہوں، اس سے جو خوشی ہوگی، اللہ تعالی کے یہاں قبولیت کی، یہی گویا انعام ہے اس کا۔

(۱) اسی طرح کا واقعہ ہے کہ...... حضرت شاہ مولانا غلام علی (ان کی خانقاہ دہلی میں ہے) نقشبندیہ مجددیہ وہ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ ہیں، نواب امیر الدولہ والی ٹونک ان کے مرید تھے یہ امیر الدولہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ جنگ میں شریک رہے ہیں، انگریزوں سے تو ان کو معلوم ہوا کہ حضرت شاہ کی تنگدستی کا، تو نواب صاحب نے نذرانہ کے طور پر ایک بڑی رقم یا جاگیر پیش کی تو حضرت شاہ نے فرمایا "فقیر نے روزہ رکھا تھا اور آفتاب غروب ہونے کے وقت کوئی روزہ نہیں توڑتا" یعنی اب میں عمر کے اس مرحلہ میں پہونچ گیا ہوں، باب کوئی کتنا ہی مر رہا ہو اور بالکل سورج ڈوب رہا ہو اب ان سے کوئی کہے کہ پانی پی لیجئے تو کہیں گے اب پانی پئیں؟ ارے دیر کیا ہے؟ ابھی سورج ڈوبتا ہے تو پئیں گے، بڑا بلیغ فقرہ ان کا ہے کہ "فقیر نے روزہ رکھا تھا اور آفتاب عمر غروب ہونے کے وقت کوئی روزہ نہیں توڑتا اور اس کے بعد یہ شعر لکھ کر بھیجدیا۔

ما آبروئے فقر وقناعت نمی بریم — باابرخان بگو روزی مقدر است

ہم فقر وقناعت کی روزی کی آبرو نہیں ختم کرتے میر خاں سے کہدو کہ روزی مقدر ہے۔

زہد وتواضع کے نمونے

اور ہم نے بتایا کہ ابھی تک کا تو تجربہ ہے کہ اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قیامت تک سب سے زیادہ جو چیز مفید ہوتی ہے یعنی کسی خیر خواہ کے لیے، بہی خواہ کے لیے، ناصح کے لیے مبلغ کے لیے، معلم کے لیے وہ اس کی غرض ہے، یہ تمام دنیا میں (یہیں نہیں) یہاں سے لے کر کے آپ امریکہ چلے جائیے کہیں چلے جائیے سب سے زیادہ جو چیز مؤثر ہوتی ہے وہ یہ کہ کچھ لینا نہیں ہے۔(۱)

تو اس میں یہ جو ہم تک دین پہنچا ہے اور لوگوں نے مانا ہے بڑے بڑے سرکشوں نے اس میں بہت دخل اس کا تھا اب یہ بات بہت کم ہوگئی ہے اور اب تو ہر چیز کو ذریعہ بنایا گیا ہے پہلے تو یہ تھا کہ عربی ذریعہ نہ تھی اس کی، انگریزی ذریعہ تھی، انگریزی پڑھتے تھے لوگ پڑھتے ہی اس لیے تھے کہ ملازمت ملے کوئی ناجائز نہیں، لیکن اب عربی بھی ذریعہ بن گئی، اس لیے کہ اب ان ملکوں میں دولت آگئی، جہاں عربی بولی جاتی ہے اور دوسرے ملکوں سے زیادہ دولت آگئی ہے۔ تو اب عربی سے وہ کام لیا جانے لگا، جو پہلے انگریزی سے لیا جاتا تھا، ہمیں

(۱) ہمارے شیخ اول اور ہمارے مربی اور ہمارے قرآن مجید کے استاد (جن سے قرآن مجید ہم نے پڑھا اول سے آخر تک وہ حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ تھے) ان کا حال یہ تھا کہ کہیں سے دعوت آئی تھی کہ آپ آیئے اور وعظ فرمایئے یہاں بڑی ضرورت ہے تو اس وقت تک انتظار کرتے تھے ان کے پاس روپیہ ہو، چاہے اس میں کتنی دیر ہو، تو اپنے ہی کرایہ سے جاتے تھے، کرایہ نہیں لیتے تھے اور ہم نے خود فرمایا کہ ''ایک گلاس شربت پی لینے سے اس کے بعد وہ اثر نہیں رہتا جو مؤثر کردے'' اچھا وہاں جاتے تھے تو لوگوں نے بتایا کہ اسٹیشن پہونچے اور لوگ آئے ہیں استقبال کے لیے (حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ ان بہت نام تھا تو پورے پنجاب میں یہاں سے لے کر سندھ تک ان کی روحانیت، اخلاص، اس کی وجہ سے) تو انہوں نے بتایا کہ لوگ آئے ہوئے ہیں لینے کے لیے، تو چپکے سے نکل گئے، تھرڈ کلاس سے اترے اور کسی دروازے سے نکل کر رکشہ (رکشہ تو اس زمانے میں نہیں تھا) پر بیٹھے اور سیدھے وہاں پہونچ گئے، بلانے والے کے یہاں اور مولانا کی عادت یہ تھی کہ اپنا استقبال نہیں کراتے تھے۔ ایک مرتبہ پونہ ان کو بلایا گیا تھا (انہوں نے غالباً خود ہی ہمیں سنایا) کہ لاہور سے پونے کتنی دور ہے تو گھر میں کہہ دیا کہ تین چار دن کے لیے اتنا کھانا ایسا تیار کردو جو کہ ناشتہ ہی کی قسم کی کوئی چیز ہو تو وہ لے گئے اور اپنا ہی کھانا کھاتے رہے۔

اس سے مناسبت نہیں، ابھی تک نہیں ہے، مگر معاملہ ہے بڑا نازک اور مشکل اگر اللہ توفیق دے کسی کو تو ہمارا جی چاہتا ہے کہ ان ممالکِ عربیہ سے بھی صرف دعوت کا تعلق ہو، جب ہی فائدہ ہوگا، ہم نے تو کہا ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ تھوڑی سی رقم مولوی صاحب کے پاس بھیجدی جائے کہ آپ کا خرچ بہت ہے، خرچ بہت سے تھوڑا سا ہم بھی اس میں شامل ہو جائیں، ہم نے کہا، ہمارا تو کچھ ایسا خرچ ورچ نہیں، آپ کا بہت خرچ ہے یعنی ہمیں آپ کی خدمت کرنی چاہیے، یعنی حوصلہ یہ ہونا چاہیے تب جا کر پھر زبان سے جو لفظ نکلے گا وہ دل پر چوٹ لگائے گا اور اس سے زندگیوں میں انقلاب ہوگا اور ملکوں میں انقلاب ہوگا اور بالکل سینکڑوں برس کی جو جمی جمائی چیزیں تھیں وہ مٹ گئیں یہ ایسے ہی نہیں ہو گیا بلکہ حضرت فضیل بن عیاضؒ، حضرت جنید بغدادیؒ، سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ جیسی شخصیات کی اس کے پیچھے بڑی قربانیاں اور مجاہدہ ہے، اس کے پیچھے حضرت فضل بن عیاض حضرت جنید بغدادی اور سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ جیسی شخصیات کی قربانیاں اور مجاہدات ہیں کہ آج مسجدوں میں آذانیں ہو رہی ہیں یہ سب عبدالقادر جیلانیؒ کا فیض ہے۔

ان سب میں یہ چیزیں تھیں اس کی کوشش کرنی چاہیے، جہاں تک "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَھَا" کا تعلق ہے تو بعض مرتبہ میتۃ کھانا بھی جائز ہوتا ہے لیکن اس کی قدر ہونی چاہیے اور جذبہ ہونا چاہیے کہ ہم مستغنی ہو کر کام کریں گے۔ (۱)

(۱) درس قرآن سورۃ الشعراء: ۵۷۔ غیر مطبوعہ۔ کے علاوہ: ☆ دعوت فکر و عمل: ۲۰۵-۲۰۶، سے اخذ و استفادہ کیا گیا ہے۔

امانت ودیانت

"اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ" (سورۃ الشعراء:۱۰۷)

"میں تمہارے لیے خدا کا امین پیغمبر ہوں"۔

نوع انسانی اپنی طویل تاریخ میں ہمیشہ خود ساختہ رہنماؤں اور برسر اقتدار شخصیتوں کا کھیل اور مذاق اور قانون سازوں اور حکماء کے تجربات کا نشانہ بنتی رہی ہے ایسے لوگوں نے اپنے ابنائے جنس اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک بچہ کاغذ کے کسی پرزے کے ساتھ کرتا ہے بچہ کبھی کاغذ کو لپیٹتا، کبھی کھولتا کبھی بند کرتا اور جب جی چاہے پھاڑتا اور جلا ڈالتا ہے۔

ان کے لیے انسانی زندگی اس کی ترقی کے امکانات اور اس کی سعی و مضمرات کی کوئی قیمت نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے انسان میں اطاعت وفرمانبرداری کی جو صلاحیت ودیعت فرمائی ہے اور قائدین پر اعتماد اور جاں نثاری کی جو صفت رکھی ہے اس کے سلسلے میں انہوں نے نہ خدا ترسی سے کام لیا نہ حق وانصاف کے تقاضے پورے کیے نہ کسی تعلق اور ذمہ داری کا لحاظ کیا اور اسے انہوں نے اپنی خواہش ومنشا کا آلۂ کار اور قیادت وسیادت اور اغراض کا ذریعہ بنالیا ان قائدین کی کوتاہ نظری، خطاکاری و گمراہی اور غلط فہمی وغلط بیانی نفس پرستی و بولہواسی، انفرادی واجتماعی انانیت، قومی ووطنی عصبیت نے بدقسمت انسان کے سر پر طویل بدبختی اور مصیبت لادی ہے، انہوں نے اپنے اخلاص، بصیرت خلائق دوستی اور احترامِ انسانیت

کے بارے میں مستقل شبہات پیدا کردیئے اوراس بات کی اب کوئی ضمانت نہیں رہی کہ انسانیت ان کے زیرسایہ پھل پھول سکتی ہے ......تاریخ انسانی ان المیوں اوررسوائیوں اورایک ساتھ ہنسانے اورلانے والے واقعات سے بھری ہوئی ہے اورمشرق ومغرب میں آج بھی بہت سی قومیں انہیں طالع آزماستم ظریف قائدین کے رحم وکرم پر زندگی گذررہی ہیں جواس سے کھیلتے، اسے گیند کی طرح لڑھکاتے اوراس پر ہرروز نئے تجربے کرتے رہتے ہیں اورپھرخود ہی ان تجربات کی غلطی وناکامی کا اعتراف بھی کرتے ہیں اورکبھی ان سے اقتدارحاصل کرنے والا اوران کا جانشین انہیں رسوا کرتا اوران کے کرتوتوں سے پردہ اٹھاتا ہے اورکبھی انہیں تاریخ محفوظ کردیتی اورآنے والی نسلیں ان سے واقف ہوجاتی ہیں۔

غلطیوں سے پاک انبیاء کی ضرورت

ان ناکام تجربوں اورغلط نتائج کی زد سے عقائدوایمانیات بھی محفوظ نہیں رہے جن پر حسن انجام، دنیا کی سعادت اورآخرت کی نجات کا دارومدار ہے اورجو صحیح اخلاق، صالح تہذیب، بندے کو خدا سے ملانے والی عبادت اورشریعتوں کی تشکیل وتکمیل کرتے ہیں اورجن میں کسی غلطی کی تلافی بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتی ہے اس لیے ایسے قائدین کی ضرورت پیدا ہوئی جو امانت دار، گمراہیوں اورغلطیوں سے پاک ہرلالچ اورنفع اندوزی اورمادی معاوضہ کی خواہش سے بری ہوں، جوخواہشات سے مغلوب اورجذبات سے متاثر نہ ہوتے ہوں، جو اپنی رائے اورناقص معلومات، محدود تجربوں اورذاتی مصلحتوں کے ماتحت کوئی فیصلہ نہ کرتے ہوں اورجب ان سے کبھی کوئی اجتہادی غلطی ہوجائے تو اللہ تعالیٰ کی تنبیہ کے بعد وہ ان غلطیوں پر قائم اورمصر نہ رہتے ہوں۔

امانت داری اوراخلاص

اسی لیے آپ اکثر دیکھیں گے (سورہ شعراء میں) کہ پیغمبروں کے ساتھ "اِنِّی لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ" یعنی ہرمبعوث ہونے والا نبی اپنی امت کو اپنی امانت اوراخلاص

و بے غرضی کا پورا یقین دلاتا ہے ایک ایک نبی کی زبان سے وضاحت فرمائی گئی ہے اور یقین دلایا گیا ہے: ''اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ''۔

یہ مقصد کی وحدت جو مختلف امتوں اور مختلف زمانوں کے انبیاء کے بارے میں مشترک ہے اپنے اندر بڑے عمیق معنی رکھتی ہے ''لفظ امانۃ'' ایسا جامع لفظ ہے جو صداقت وحی خداوندگی کو صحت کے ساتھ قبول کرنے، صحت کے ساتھ امت تک پہنچانے کے معانی پر مشتمل اور رسالت و نبوت کے نظام کا رکن اساسی ہے، عربی زبان میں اس مقصد کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اور جامع و بلیغ لفظ نہیں۔

اور یہ حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ رسول عربی ﷺ نے نبوت سے پہلے ہی اس صفت کے ساتھ شہرت پائی اور ''الصادق الامین'' کا لقب ہی قریش نے حضور کو دیا اور مکہ کے امیوں کے دل میں یہ بات خود بخود آ گئی کہ وہ آنحضرتؐ کو ''صادق امین'' کے معزز لقب سے پکاریں اور وہ آپ کی عام بشری زندگی میں بھی صفت تھی اور پیغمبرانہ سیرت میں بھی صفت تھی۔

''اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ'' بے شک میں تمہارے لیے رسول امین ہوں''۔

''رسول'' کو ''امین'' کے ساتھ ایک خاص مناسبت ہے رسالت کی بھی سب سے بڑی ضرورت اور رسالت کا سب سے بڑا تقاضہ اور رسالت کا سب سے بڑا خاصہ اور رسالت کی سب سے بڑی ضرورت امانت ہے کہ جو چیز اللہ سے جو پیغام لیا اس کے بے کم وکاست پہنچا دیا جائے۔

پہلا کام یہ ہے پیغمبر کا کہ جو کام اس کو خدا کی طرف سے ملا ہے اس میں کوئی کمی زیادتی نہ ہو! اور یہ صرف پیغمبر کے لیے ہی نہیں بلکہ یہ گویا ان کے نائبین کے لیے بھی ایک سبق ہے اور ایک تنبیہ ہے کہ ان کو ''امین'' ہونا چاہیے۔

اور یہ ''امین'' کا لفظ اتنا عام ہے، اتنا وسیع ہے، خاص طور پر عربی زبان میں ''امانۃ'' جب کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ آتا ہے کہ کوئی چیز رکھوائی گئی تھی، اس نے پوری کی پوری پہنچا دی، کوئی تحفہ دیا تھا، کوئی رقم دی تھی کہ فلاں کو پہنچا دینا تو اس نے پوری

پہنچادی لیکن ''امین'' عربی میں جو ہے اور معنوی حیثیت سے بھی دیکھئے کہ امانت کا تعلق پوری بات پہنچادینے سے اسی طرح پہنچادینے سے اور بلا اس کے خیال کے کہ یہ موقع پہنچانے کا ہے یا نہیں۔ پہنچانے کا ہے، بغیر ڈرے، بغیر لالچ کے، بے کم وکاست، پوری بات پہنچادے۔

پھر دوسری بات ''امین'' میں یہ بھی شامل ہے کہ کوئی غرض اس کی نہ ہو یعنی اس کی کوئی نیت یہ نہ ہو، مثلاً بہت ادنی اغراض میں سے یہ ہے کہ مالی نفع ہو اور اس سے کچھ بہتر یہ ہے کہ ہمارا فلاں کام ہو جائے اور اس سے زیادہ نازک اور بلند چیز یہ ہے کہ حب جاہ! کہ ہمارا مرتبہ ہو، ہماری عزت کی جائے، یہ سب ''امین'' میں داخل ہے کہ اس کے اندر ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو ان میں سے ہر چیز ''امانت'' کے خلاف ہے۔

چنانچہ رسول کے لیے اور رسول کی نیابت کا کام کرنے والے کے لیے اب جو مبلغین ہیں ان کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ امین ہوں اور بے غرض ہوں اور آج عالم اسلام کو ایسے مردانِ کار کی ضرورت ہے، جو صرف اسی دعوت کے پیچھے ہو رہیں، اپنا علم، اپنی صلاحیتیں اور اپنا مال و متاع اس کے لیے وقف کردیں، کسی جاہ ومنصب یا عہدہ وحکومت کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھیں، کسی کے لیے ان کے دل میں کینہ وعداوت نہ ہو، فائدہ پہنچائیں، مگر خود فائدہ نہ اٹھائیں، دینے والے ہوں، لینے والے نہ ہوں، ان کا طرزِ عمل سیاسی رہنماؤں کے طرزِ عمل سے ممتاز اور ان کی دعوت وجد وجہد سیاسی تحریکات (جس کا مطمحِ نظر محض حصول اقتدار ہوتا ہے) مختلف اور جداگان ہو، اخلاص ان کا شعار ہو اور نفس پرستی، خود پسندی اور ہر قسم کی عصبیت سے بالاتری ان کا امتیاز۔ [(۱)(۲)]

(۱) نیا طوفان اور اس کا مقابلہ: ۲۸

(۲) درس قرآن، سورۃ الشعراء: ۱۰۵ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین: ۱۰۹-۱۱۳ ☆ نیا طوفان اور اس کا مقابلہ: ۲۸، سے ماخوذ ہے۔

سخاوت وایثار اور عفو عالی ظرفی

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ. وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا، أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ، وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ (النور: ۲۲)

''اور جو لوگ تم میں صاحب فضل اور وسعت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ رشتہ داروں اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں وطن چھوڑ جانے والوں کو کچھ خرچ پات نہیں دیں گے ان کو چاہیے کہ معاف کر دیں اور در گذر کر دیں، کیا تم پسند نہیں کرتے ہو کہ اللہ تعالی تم کو بخش دے اور اللہ تو بخشنے والا مہربان ہے''۔

ایثار وعالی ظرفی

اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے ''وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ'' ''کہ جن کو اللہ تعالی نے کچھ گنجائش دی ہے اور کچھ عطا فرمایا ہے ان کو اس بات میں کمی نہیں کرنی چاہیے کہ وہ اپنے قرابت داروں کو دیں۔

یہ پہلے سمجھ لیجیے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ان کے ایک عزیز (مسطح بن اثاثہ) نے ایسی تکلیف پہنچائی تھی جس سے بڑھ کر تکلیف کا تصور کوئی شریف آدمی کر نہیں سکتا اور ان کا تو معاملہ ہی دوسرا ہے اس لیے کہ ہمیں آپ کو تکلیف پہونچے یا کسی بیٹی کے باپ کو تکلیف

پہونچے تو ایک ہزار بیٹی کے باپ ایک طرف اور اس بیٹی کا باپ جس کا نام ابوبکر تھا ایک طرف اور بیٹی بھی کیسی؟ اور کس کی بیوی؟ اس مسئلہ کا تعلق اس ذات سے تھا جن سے ان کو عزت حاصل ہوئی تھی، عزت کیسی عزت؟ اس پر بند نہ لگایا اس پر حملہ کیا اس سے بڑھ کر کسی شریف آدمی کے لیے کیا کسی حساس آدمی کے لیے بھی زندہ آدمی کے لیے بھی کوئی آزمائش ہوسکتی ہے؟

ہوا یہ کہ ام المؤمنین حضرت صدیقہؓ پر جو الزام لگایا عبداللہ بن ابی نے جو سردار المنافقین تھا اس میں دو صحابی (ذہن ہوتا ہے، طبیعتیں اور مزاج ہوتے ہیں اس کو مزاج کہتے ہیں) بھی شامل ہوگئے، یعنی کہیں مجلسوں میں انہوں نے کہدیا کہ بھئی کیا تعجب ہے، کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے انسان انسان ہی ہے ایسی کچھ بات کہی اس میں دو تھے ان میں سے مسطح بن اثاثہ تھے وہ ابوبکر کے دور کے رشتے دار ہوتے تھے اور تھے ذرا تنگ معیشت سے، بہت تنگ تھے اس کے پاس گذر اوقات کے لیے کوئی ذریعہ نہیں تھا کوئی تجارت یا رقم ملتی ہو، حضرت ابوبکر کا جو طریقہ تھا کہ وہ مدد کرتے تھے اس سے ان کا گذارا ہوتا تھا جب حضرت ابوبکرؓ کو یہ معلوم ہوا کہ مسطح بھی ان میں شامل ہیں تو اب یہ بالکل بشریت کا تقاضا تھا، قسم کھا بیٹھے کہ اب میں ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کروں گا، یہ مستحق نہیں رہے، میری بیٹی پر اتنا بڑا الزام اور پھر وہ بیٹی بیٹی ہی نہیں تھی جن کی وجہ سے ان کو ایک شرف حاصل تھا یعنی خسر ہونے کا شرف نبی کے خسر ہونے کا شرف، اتنا بڑا شرف حاصل تھا کہ وہ صدیقیت، صحابیت اور سفر میں معیت، غار ثور میں ٹھہرنا اور یہ سب چیزیں اپنی جگہ، لیکن یہ خود اپنی جگہ بہت بڑی چیز تھی کہ ان کی بیٹی سب سے زیادہ قریب ترین اور حضور ﷺ کی محبت اور قدر تھی وہ حضرت عائشہ تھیں (اخیر میں آپ ﷺ نے ازواج مطہرات سے اجازت لی تھی کہ میں بیماری کے یہ دن جو ہیں حضرت عائشہؓ کے گھر گذاروں)

تو یہ اتنا بڑا دھکا لگا حضرت ابوبکرؓ کو وہ دھکا صرف اتنا نہیں تھا کہ ان کی بیٹی پر بلکہ اس شرف پر الزام اس شرف پر چوٹ جس سے آپ کو نسبت سے حاصل تھی اور یہ بالکل بشریت تھی کہ ان کی زبان سے نکل گیا کہ اب میں ان کی مدد کروں گا......لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو بھی پسند نہیں کیا فرمایا:-

سخاوت و ہمدردی

"وَلَايَاتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ" تم میں سے جن کو اللہ تعالی نے کچھ دیا ہے دولت دی ہے "فضل" کا لفظ یہاں استعمال کیا ہ یعنی ان کی ضروریات سے کچھ چیز جو اس کو زائد دیا ہے، جو اس کو بچ سکتا ہے بچتا ہے جو دوسروں کو دیا جا سکتا ہے، دوسروں تک منتقل کیا جا سکتا ہے اس کے لیے بہترین لفظ یہاں پر "فضل" کا ہے کہ قسم نہ کھا بیٹھیں فراغت والے جن کو اللہ نے فراغت نصیب فرمائی ہے تم میں سے۔

"وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" .....اور جن کو گنجائش دی ہے کہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں اہل قرابت کو دینے کے بارے میں کہ ہم نہیں دیا کریں گے اور مسکینوں کو اور مہاجرین کو جو اللہ کے راستے میں ہجرت کر کے آئے ہیں ان کو دینے کے سلسلے میں قسم نہ کھا بیٹھیں کہ بھئی مجبوری ہے ہم نے قسم کھالی ہے اس وقت دراصل طبیعت پر ایسا اثر تھا کیا کریں، مغلوب ہوئے ہم، ہم نے قسم کھالی کہ اب ان کے ساتھ کوئی سلوک نہیں کریں گے، ہم کیسے دیں؟ تو اللہ تعالی فرماتا ہے، قسم نہیں کھانی چاہیے اگر قسم کھائی ہے تو اس کے خلاف کرنا چاہیے دینا چاہیے۔

عفو و درگذر

"وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا" اگر ان کی کوئی بات بری لگی ہے تو ان کو معاف کرنا چاہیے اور درگذر کرنا چاہیے، "أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ" کیا تم نہیں پسند کرتے کہ اللہ تمہاری مغفرت فرمائے، جب یہ آیت اتری تو انہوں نے کہا کہ نہیں بیشک میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ میری مغفرت فرمائے اور اسی وقت سے انہوں نے دینا شروع کر دیا اور جو بند کر دیا تھا وہ جاری کر دیا اور معاف کر دیا اور کہا کہ بیشک میں چاہتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کر دے، بیشک مجھے اس کی ضرورت ہے کہ اللہ مجھے معاف کرے اس سے بڑھ کر کوئی نمونہ نہیں ہو سکتا صلہ رحمی کا اور پھر حدیث میں آتا ہے کہ "لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِيْ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلُ الَّذِيْ إِذَا قُطِعَتْ رَحِمَهٗ وَصَلَ" رشتہ ناتوں کو جوڑنے والا وہ نہیں ہے جو

بدلہ دینے والا ہو ہم سے کوئی رشتہ جوڑ دیا ہے تو ہم بھی جوڑ رہے ہیں اصل رشتہ جوڑنے والا وہ ہے کہ اس کا رشتہ توڑا جائے تو وہ جوڑے"۔

"وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَحِيْمٌ" اور اللہ تعالیٰ بہت مغفرت کرنے والا ہے اور رحمت والا ہے اب یہ جو ہے کہ جن سے تکلیف پہونچی ہو ان کے ساتھ سلوک کیا جائے اور ان کی ظلم کا اور ان کی بیجا کاروائی کا ان کی ایذا رسانی کا جواب سلوک سے دیا جائے اور مدد سے دیا جائے یہ واقعات صحابہ کرام کی زندگی میں ملیں گے کثرت سے یا پھر صوفیاء کرام کے یہاں آپ کو ملیں گے کہ ذہن بھی نہیں دیا جاسکتا کہ ایسا آدمی کسی ہمدردی کا مستحق ہوگا۔

اعلیٰ اخلاق کا نمونہ

ایک واقعہ سنا دیتا ہوں سید احمد شہید کا کہ ایک جنگ ہو رہی ہے مسلمان کہلاتے تھے۔ وہ یار محمد خان، خدا ان کی مغفرت کرے انہوں نے زہر دلوایا شہیدوں کے میدان میں جنگ تھی جنگ شروع کرنے سے پہلے انہوں نے حضرت کے کھانے یا ناشتے میں زہر دلوایا، ایک آدمی کے ذریعہ سے اور زہر نے پورا کام کیا اور میدان جنگ میں غشی آنے لگی اور صاف معلوم ہونے لگا کہ خدا جانے کا حادثہ پیش آئے کہ حضرت شاہ اسماعیل کو شہید کو فوراً احساس ہوا اور انہوں نہ اپنے گھوڑے پر بھا کر یا ہاتھی پر فوراً گھر پہنچا دیا اور وہاں جو کچھ ہوسکتا تھا اس زمانے میں وہ کیا گیا اور دعائیں ہوئیں اور زہر کا اثر جاتا رہا اس آدمی کا پتہ چل گیا جس کے ذریعہ سے زہر دیا گیا تھا وہ حضرت سید صاحب کے یہاں آگیا کسی طرح سے، سید صاحب نے اس کو رات بھر رکھا اور رات کو کہا کہ لو یہ روپے لو اور جلدی سے دریا پار کر کے چلے جاؤ ورنہ لوگ تمہیں چھوڑیں گے نہیں، لوگوں کو اس وقت پتہ نہیں چلے گا کہ کہاں ہیں تو پناہ بھی دی اور رات کو رقم دے کر اس کو دریا پار کروا دیا کہ پھر تمہیں چھوڑیں گے نہیں، ماردیں گے نکل جاؤ یہاں سے، ایسے واقعات آپ کو حضرات صوفیاء کرام کے یہاں کثرت سے ملیں گے، ایک چھوٹا سا واقعہ بتاتے ہیں یہ اس لیے کہ یہ چیزیں قابل تقلید ہیں اللہ اگر توفیق دے۔

لطیفہ لکھا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں لوگ تحفہ لاتے

تھے جیسے بزرگوں کے یہاں لاتے ہیں، کوئی مٹھائی لایا، کوئی گھر کی پکی ہوئی چیز لایا تو وہ اکثر کسی برتن میں ہوتی تھی، یا ڈبے میں ہوتی تھی یا کسی کاغذ میں بندھی ہوتی تھی، ایک منطقی آدمی تھے، معقولی انہوں نے تو کہا کہ حضرت کو تو اچھا وہ سب جمع ہو جاتا تھا سامنے سب رکھ دیا جاتا تھا (یہ ہم نے ہندوؤں کو بھی سنایا پیام انسانیت کے جلسے میں) دیکھئے ہمارے بزرگوں کا یہ معاملہ تھا تو وہ سب جمع ہو جاتا تھا اور حضرت دائم الصوم تھے سوائے عیدین کے سال بھر روزہ رکھتے تھے تو حضرت کو تو کھانا بھی نہیں ہوتا تھا، افطار بھی برائے نام اور سحری بھی برائے نام، جب سب جمع ہو جاتا تھا مجلس برخاست ہونے لگتی تھی تو خوان اقبال حضرت کے خادم تھے ان سے فرمایا کرتے تھے کہ لو یہ اٹھا لے جاؤ اور بچوں میں تقسیم کر دو یہ ہماری خانقاہ میں جو لوگ ہیں یا ان کے گھروں میں بھیج دو سب تقسیم ہو جاتا تھا پتہ بھی نہیں چلتا ہوگا کہ کیا آیا کیا نہیں، وہ منطقی صاحب تھے انہوں نے کہا حضرت کو تو پتہ نہیں چلتا کیا ضرورت ہے کہ پیسہ خرچ کرکے آدمی کوئی چیز خرید کر لے جائے اپنے گھر میں مٹی لی اور پیکنگ اس کی بہت عمدہ کی، ذرا دھوکے میں ڈالنے والی کہ اچھے کاغذ میں اس کو اچھی طرح سے باندھا اور کہا کہ ہم سے بھی حضرت خوش ہوں گے، دعا دیں گے پتہ بھی نہیں چلے گا کسی کو اتنا سامان ہوتا ہے کہ یہ کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہ کون لایا یہ نہیں پتہ چلتا تھا کہ کون کیا لایا تھا خیر وہ چیز آئی رکھی گئی اس کے اوپر اور چیزیں رکھی گئیں، اچھے اچھے تحفے آنے شروع ہوئے اب جب لے جانا کا وقت ہو ج کسی کو مجلس میں خبر نہیں، حضرت کو کشف ہوتا تھا جب اس کو اٹھانے لگے تو کہا کہ نہیں اس کو مت اٹھاؤ یہ میری آنکھ کا سرمہ ہے اور کیوں، کیوں نہ اٹھاؤ اس لیے کہ جب کھولیں گے دیکھیں گے کہ مٹی ہے کسی نے کسی کو یاد آ جائے گا کہ فلاں آدمی لایا تھا یہ ہوتا ہے بعض دوبین خوردبین ہوتے ہیں اس طرح کا جو پیکٹ تھا اس طرح کی جو پڑیا تھی یہ فلاں آدمی لایا تھا یاد آ گیا تو پھر ان کی خبر لی جاتی، ان کو اس تکلیف سے بچانے کے لیے اور بلکہ بڑی قدردانی کے طور پر کہا کہ نہیں یہ تو میری آنکھ کا سرمہ ہے یہ رہنے دو پھر اس کو اٹھایا ہوگا خود ہی اپنے ہاتھ سے اور پھینک دیا ہوگا۔

ایسے صدہا واقعات آپ کو صوفیاء کرام کے یہاں ملیں گے کہ جنہوں نے ظلم کیا ان

کے ساتھ ان کی اولاد کے ساتھ یا ان کے تعلق والوں کے ساتھ ان کے ساتھ انہوں نے بڑے کرم کا معاملہ کیا یہ اس سب کا جو ماٰخذ ہے، بنیاد ہے یا تو وہ واقعہ ہے کہ وہاں مشکل تھا وہاں اتنی بڑی تکلیف پہنچائی اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف نہیں ہوسکتی ایک شریف آدمی کو اور پھر وہ جو آپ کا مرتبہ تھا صدیقیت کا، صحبت کا لیکن آپ نے کہا نہیں ''اُحِبُّ أن یَغْفِرَ اللّٰہ لِیْ'' ''أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ یَغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ'' کیا تم کو نہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت کرے، کہا نہیں میں چاہتا ہوں، اللہ ہماری مغفرت کرے اور اب سے میں دینا شروع کرتا ہوں اور دینا شروع کر دیا........ بہت بڑا ایثار اور بہت بڑی قربانی تھی۔

یہ ہمیں تعلیم دی جارہی ہے کہ اگر ہمیں کوئی تکلیف پہنچائے آج، مسلمان اگر اس پر عمل کرتے اور یہ عمل لوگوں کے سامنے آتا تو پتہ نہیں کتنے مسلمان ہوجاتے دیکھ دیکھ کر اگر ہمارا تعلق یہاں کی آبادی کے ساتھ کاروباری رہا یا محلے والی رہا یا ہم شہری اور ہم وطنی کا رہا، ہم ان کے سامنے اخلاق کا نمونہ بن کر نہیں آئے، یہ صرف صوفیاء کرام بزرگانِ دین یا خاص خاص مصلحین امت جو ہیں ان کا ہے ان کا اثر پڑا ہندوؤں پر اور بہت واقعات ہیں ایسے کہ غیر مسلم اسلام لے آئے ان چیزوں کو دیکھ کر اور آج پھر اس کی ضرورت ہے کہ اس کو کوشش کر کے دکھائے کہ مسلمان کا کیا ظرف ہوتا ہے، مسلمانوں کو کیا تعلیم دی گئی ہے، مسلمان کے سامنے کون سا اسوہ ہے اسوۂ رسول اور اسوۂ صحابہ، سیرت صحابہ، یہ آج ہندوستان میں مسلمانوں کے عزت کے ساتھ باقی رہنے اور اسلام کی اشاعت اور اسلام کے قدر دانی کے لیے یہ چیزیں جتنی مفید ہوسکتی ہے کہ نہ لیٹریچر ہوسکتا ہے نہ تقریریں ہوسکتی ہیں، سیاسی کوششیں ہوسکتی ہیں..... ہم سے جتنا بھی ہوسکے ایثار سے کام لیں ہماری زندگی جتنی سادہ ہوگی اور ہماری زندگی میں جتنی قربانی ہوگی اتنا ہی اثر پڑے گا، اتنا ہی بہتر نتیجہ نکلے گا۔(۱)

---

(۱) درسِ قرآن سورہ نور۔آیت۔۲۲۔غیر مطبوعہ کے علاوہ: ☆تحفۂ دین ودانش: ۲۷-۲۸، سے استفادہ کیا گیا ہے۔

استیذان وآداب ملاقات

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتاً غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَانِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰی أَهْلِهَا. ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ. فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْهَا أَحَداً فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰی یُؤْذَنَ لَکُمْ وَاِنْ قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ أَزْکیٰ لَکُمْ. وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْم﴾ (النور: ۲۷-۲۸)

''اے ایمان والوتم اپنے (خاص رہنے والے) گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں مت داخل ہو، جب تک تم (ان سے) اجازت حاصل نہ کرلو اور (اجازت لینے سے قبل) ان کے رہنے والوں کوسلام نہ کرلو، یہ تمہارے حق میں بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو، پھر اگر تم سے کہہ دیا جائے کہ لوٹ جاؤ تو تم لوٹ جایا کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہے (اس وقت) اور اللہ خوب جانتا ہے جوتم کرتے ہو''۔

ایک اہم ضروری تمہید

قبل اس کے کہ آیات کا مفہوم بیان کیا جائے اور اس میں جو فقہی احکام آئے ہیں ان کی تشریح کی جائے یہ اس سے پہلے ہم لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے، (ایک تمہید کے طور پر) کہ

کتنے ہی منزل من اللہ، صادق ومصدوق دین کو اول سے آخر تک غیر محرف اور حد درجے کا مؤثر انقلاب انگیز، عہد آفریں، اور معصیت سوز، طاعات آفریں اور کیسی ہی مخلص، سرفروش، خودسناش، خدا پرست اور عارف باللہ امت ہو، جب تک اس کا جس جگہ جو اس دین کے ظہور کی جگہ ہے یا اس کے انتشار واشاعت کی جگہ ہے اور وہ انسانی جماعت جو اس کی حامی اور علمبردار ہے، ذمہ دار ہے، اس میں اگر اس کا معاشرہ صحیح نہیں ہ اس کی جو معاشرتی زندگی ہے سوشل لائف (Social Life) وہ اگر درست نہیں ہے تو وہ نہ دین اپنا پورا اثر دکھا سکے گا نہ وہ امت اپنے پورے فرائض انجام دے سکے گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانی معاشرہ کا یعنی خاندانی زندگی، مرد وعورت کے رشتے ایک دوسرے کے ساتھ ان کا برتاؤ اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کے طرزِ عمل کی حیثیت اور ان کے نفوذ کے اندر نفسانیت جو ایک فطری چیز ہے مقدار کا حد ہے نہ بڑھ جانا فطرت انسانی کا ایک مزاج جو ہے کہ اس کے اندر طبقۂ اناث کی طرف انجذانیت پیدا کیا گیا ہے اگر وہ تناسب کے خلاف ہے تو اس کا اثر پڑے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے جو دنیا کی تاریخ سے، قوموں کی تاریخ سے، تہذیبوں کی تاریخ سے، صرف معاشرتوں کی نہیں، تہذیبوں کی تاریخ سے، سیاسی تاریخوں سے بھی بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے جن لوگوں کی اس پر نظر ہے کہ اگر کسی قوم کا معاشرہ بگڑ جائے اس میں مرد وعورتوں کے زندگی کے ساتھ رہنے کے حدود اگر قائم نہ رہیں سرحدیں اگر ٹوٹ جائیں اور ان کے معیار بدل جائیں اور ان میں شرافت عدم شرافت اور تہذیب وعدم تہذیب اور اخلاقیت اور غیر اخلاقیت اس کا مفہوم اگر بگڑ جائے، بدل جائے تو پھر اس ماحول میں کہیں باہر اس کے اثرات کو پہنچانا اس کے فیض کو پہنچانا مشکل ہے اس میں دینی زندگی کا قائم رہنا، خالص دینی زندگی کا قائم رہنا مشکل ہے۔

آپ دیکھئے کہ معاشرے کے کرپٹ ہو جانے ان حدود کے ساقط ہو جانے سے، درہم برہم ہو جانے سے ان حدود کے قائم نہ رہنے سے اور انسان کے اندر جو اللہ تعالی نے فطری خواہشات رکھی ہے ان کے اپنے حدود کے اندر نہ رہنے سے اور اس سے تجاوز کرنے

سے کیا اثر پڑتا ہے پوری قوم پر، پورے ملک پر اور ملک کی زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہے اور پھر اس کی خود اپنی زندگی ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ خدا کے کسی پیغام کی حامل نہیں بن سکتی، نمونہ بن سکتی۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے مسلمانوں کے لیے ''کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ'' اور ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اور اس امت کو خیر امت کہا گیا ہے، اس لیے بہت کچھ اس پر منحصر ہے کہ معاشرہ صحیح ہو اب اس معاشرہ کے لیے قرآن مجید جیسی آسمانی کتاب جو قیامت تک پڑھی جانے والی ہے ساری دنیا کا اس میں حصہ ہے اور اس کے معانی اس کے نکات اس کے مضمرات کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے اور جس کا ایک ایک لفظ ضرورت کے مطابق ہے اور وہ ساری انسانیت کا سرمایۂ دولت، ساری انسانیت کی رہنمائی کے لیے کافی ہے اس میں معاشرتی حقوق کو حدود کو معاشرتی زندگی گذارنے کے نظام کو اور آداب کو اور طریقے کو اتنی تفصیل سے اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ معاشرہ کی خرابی اور معاشرے کی اچھائی، بہتری اور خرابی دونوں کا بہت شدید اور بہت عمیق اور بہت وسیع اثر پڑتا ہے۔

اور پھر یہ ساری اسلام کی اساس ہے، تمام مسائل اسی سے نکلے ہیں، فقہی استنباطات اسی سے ہیں اور عبادات بھی اسی سے متعلق ہیں۔ اس کتاب میں اسی مضمون کو جگہ دینی چاہیے، اسی تناسب سے جگہ دینی چاہیے، جو تناسب ضروری ہے اس سے بالکل آگے نہیں اس لیے ہم اتنی تفصیل کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔ یہ پورا رکوع اس کے بارے میں ہے کہ مسلمان مرد عورت کس طرح رہیں ایک دوسرے کے تعلقات کے حدود کیا ہوں اور کس طرح ملنا جلنا ہو کس طرح گذارنا ہو اور کہاں تکلیف ہو کہاں بے تکلفی ہو؟ کہاں پردہ ہو، کہاں پردہ نہ ہو؟ اور کیا آداب ہیں اس کے؟ یہ اس لیے اس کو اہمیت دی گئی جو شخص اس کو نہیں جانتا اس کی دنیا کی اخلاقی تاریخ پر نظر نہیں ہے اور وہ معاشرہ کی اہمیت سے واقف نہیں ہے وہ کہے گا کہ یہ کتاب تو عبادت کے لیے تھی یہ کتاب تو ایک ایک حرف کا کتنا ثواب ہے؟ کتنا ثواب ہے؟ کتنا دس دس نیکیاں اور سو سو نیکیاں تک اور اس کا ہر لفظ وظیفہ ہے ہر

لفظ اس کا وحی الٰہی ہے اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے اس میں ان باتوں کو یوں پردہ کریں اور یوں پردہ کریں یوں گھروں میں جائیں اور اس طرح اجازت لیں اور اگر یہ نہ ہو تو نہ جائیں فلاں جگہ نہ جائیں یہ سب اس لیے ہم نے بتایا کہ دنیا کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے انسانی تجربہ تصدیق کرتا ہے کہ اگر معاشرہ بگڑ گیا تو بالکل ہی بنا نہیں سکتی اور پھر وہ جس کا معاشرہ ہے وہ دنیا میں کوئی مفید تعمیری انقلابی اصلاحی ہدایتی کام نہیں کر سکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ عربوں کی زندگی ایک بدویانہ زندگی تھی اس میں تمدن کا حصہ بہت کم تھا تو ان کو اور بھی زیادہ اس کی ضرورت تھی ان کو نمونہ بننا تھا اور دنیا کے سامنے داعی بن کر جانا تھا تو پہلے ان کو بھی ضرورت تھی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

بغیر اجازت کسی گھر میں داخل نہ ہو

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتاً غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَأنِسُوْا'' اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو جب ایمان لا چکے ہو تو اب اس کے بعد عبادت کی باتیں بتانی چاہیے کس طرح نماز پڑھو کس طرح اللہ کو یاد کرو، کس طرح دعا کرو، کس طرح حج کرو، کس طرح روزہ رکھو؟ لیکن وہ اللہ تعالیٰ ہی تو دین کا نازل کرنے والا ہے اسے کوئی مشورہ تھوڑے ہی دے سکتا ہے، وہ تو جس تناسب سے جو چیز جس مقام پر جس جگہ کہ وہی ٹھیک ہے اس لیے کہ شارع حقیقی وہی ہے اور خالق حقیقی وہی ہے انسان پیدا کرنے والا وہی ہے انسان کی طبیعت ''أَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ'' کیسی بدیہی بات کہی ''أَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ'' کیا وہ اپنے پیدا کیے ہوئے کو نہیں جانے گا کسی استاد سے کوئی کہے کہ ہم ہی لوگ ہیں، پڑھاتے ہیں، طالب علم آپ جانتے ہیں ہمیں کون بتائے گا وہ تو روز ہمارے درجے میں آتے ہیں وہ پڑھتے ہیں ہم ان کی استعداد سے خود واقف ہیں ہم ان کے اخلاق سے بھی واقف ہیں کوئی نگراں سے کہے تو اللہ تعالیٰ تو آخری درجے کی چیز کہہ دی ''أَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ'' کیا وہ اپنی پیدا کی ہوئی چیز نہیں جانے گا '' وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ'' جب لطیف وخبیر کے ساتھ خلق کی صفت بھی لگ جائے کہ ایک

طرف لطیف وخبیر ہوایک طرف خالق ہوتو پھر کون سی چیز ان سے چھپی رہ سکتی ہے۔

یہ ہم نے اس لیے کہہ دیا کہ اگر غیر مسلموں کے سامنے یہ چیز آئے، یا نئے تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے کے ان باتوں کو کہنے کی کیا ضرورت تھی یہ تو خود ہی سمجھتا ہے، کامن سینس (Common Scence) سے سمجھتا ہے، پھر ایک عرف ہوتا ہے، ہر جگہ کا ایک اخلاقی معیار ہوتا ہے، تہذیب ہوتی ہے یہ بات نہیں صرف معاشرہ کی بڑی فکر کی ضرورت ہے، اس کے پورے احتساب کی ضرورت ہے اور ہر مرتبہ اس کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور اس کو دینی احکام وآداب کے ماتحت رکھنے کی ضرورت ہے۔

ملاقات واستیذان کا مسنون طریقہ

''اے ایمان والوں ''لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتاً غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰی اَھْلِھَا'' مت داخل ہو گھروں میں اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے گھروں میں، جب تک کہ تم اطمینان نہ کرلو، سلام نہ کرلو، آہٹ نہ کرلو کہ گھر میں کوئی ہے اور گھر میں صرف عورتیں ہی ہیں یا مرد بھی ہے اور مرد آنے پر رضا مند ہیں خوش ہوں گے، بلا رہے ہیں یا نہیں، یا یہ وقت وہاں جانے کا ہے کہ نہیں، یہ سب باتیں کہی گئیں، اس لیے کہ اب آج کل ہمارا جو طرزِ زندگی دوسرا ہے گھروں کے دروازے ایسے ہوتے ہیں کہ بہت سخت کوئی چیز گھروں میں نہیں جاتی، لیکن یہ بات اس وقت نہیں تھی، اس وقت بے تکلفی تھی، لوگ آتے جاتے تھے، نیتیں بھی اچھی ہیں اور طبائع بھی سلیم تھیں اتنا فساد نہیں پھیلا تھا جیسا کہ مغربی تہذیب نے اس وقت پھیلا دیا ہے۔

اے ایمان والو مت داخل ہو ان گھروں میں جو تمہارے گھروں کے علاوہ ہیں یہاں تک کہ تم اطمنان حاصل کرلو اور انس حاصل کرلو یہ کہ آہٹ پالو یہ اندازہ کرلو کہ وہ لوگ تمہارے آنے سے تمہارا خیر مقدم کریں گے، کررہے ہیں یا نہیں اور تمہارے آنے سے خوش ہوں گے یا نہیں، تمہارے آنے پر رضا مند ہیں یا نہیں۔

اب یہ ''استیناس'' کا ترجمہ نہیں ہوسکتا ''استیناس'' میں سب چیزین آگئیں، یعنی

اطمینان حاصل کرلو کہ اس وقت جانا مناسب ہے اور یہ لوگ خوش ہوں گے اور یہ ان کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

"وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى أَهْلِهَا" اور فرمایا کہ گھر والوں کو سلام کرلو، باہر سے بھی سلام کیا جاتا ہے "السلام علیکم" انہوں نے سن لیا، بڑی بڑی کوٹھیاں تو ہوتی نہیں تھیں کہ وہ تیسری منزل پر بیٹھے ہوئے ہیں، یا بہت دور وہاں سے کمرہ ہے چھوٹے چھوٹے گھر تھے، مکے اور مدینے کے اور یہ ہر جگہ بھی ہوسکتا ہے،"ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ." یہ تمہارے حق میں بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

"فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَا أَحَداً فَلَاتَدْخُلُوْهَا" اگر تم اس میں کسی کو نہ پاؤ تو مت داخل ہو "حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ" یہاں تک کہ تمہیں اجازت دی جائے۔

دو باتیں، اگر مرد نہیں ہیں، عورتیں ہیں، تمہارا اندر جانا بھی شبہ پیدا کرتا ہے اور بہت خرابیاں اس سے بدگمانیاں پیدا ہوسکتی ہیں اور بدگمانیاں ہی نہیں اس میں کچھ نامناسب باتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ اچھایوں بھی اگر عورتوں کا مسئلہ نہیں ہے آپ جائیں اور چلے آئیں کوئی شخص کوئی چیز ڈھونڈے اور نہ ملے تو کہے گا اچھا او ہو بھئی یہاں کوئی آیا تو نہیں تھا تو کہا کہ ہاں فلاں صاحب آئے تھے انہوں نے کہا کہ بس وہی لے گئے ہوں گے اور اس میں خواہ مخواہ شبہ پیدا کرانا ہے اپنے متعلق اب ایک چیز ایک شخص نے ایک جگہ رکھی اور گھر والوں ہی نے اسے اٹھا کر کہیں رکھدی لیکن معلوم ہوا کہ یہاں کوئی اور آدمی آیا تھا تو پھر اس کے متعلق شبہ ہوسکتا ہے۔

"وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا" اگر کہہ دیا جائے تم سے اور مہذب طریقے پر بھی کہا جاسکتا ہے اور بعض مرتبہ آدمی اپنے لہجے کے مطابق بھی کہہ سکتا ہے کہ اس وقت آنے کا موقع نہیں، پھر تشریف لایئے گا کہنے کا انداز یہ ہے یا اور کسی طریقے سے ہاتھ کا اشارہ کردیا یہ سب "یرجع" کے معنی میں ہے، یا آوازیں نہیں آرہی ہیں، جواب ہی کوئی نہیں دے رہا ہے، یہ بھی "ارجعوا" کے معنی میں ہے "فارجعوا" تو واپس چلے جاؤ برا نہ مانو کہ ہم کوئی بری نیت سے تھوڑے آرہے تھے ملنے آرہے تھے، ملنے کے شوق میں آرہے

تھے لیکن اس کے ساتھ اور جو نتائج نکل سکتے ہیں اور جو اس سے اور خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں ان کے مقابلے میں یہ واپس جانا یہ اس سے بدرجہا آسان اور معقول چیز ہے ﴿هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ ﴾ یہ تمہارے لیے بہتر ہے "ازکی" کا لفظ بھی بہت وسیع معنی رکھتا ہے، تمہاری اخلاقی شہرت، اخلاقی حیثیت اور عرف کے لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ تم جس مقام کے آدمی ہو تمہارے لیے یہی مناسب تھا کہ تنہا گھر میں نہ جاؤ یہ بھی ہے کہ کوئی تہمت لگا بھی نہیں سکتا اور یوں بھی ہے کہ کوئی شکایت بھی نہیں کرسکتا بعد میں، "ازکی لکم" میں یہ بھی ہے، خودداری کے خلاف بھی ہو جاتا ہے کہ صاحب آپ خالی گھر میں کیوں گئے تھے، آدمی کو کتنا برا معلوم ہوگا تو یہ "ازکیٰ لکم" میں یہ سب آ جاتا ہے، جتنی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں ایک انسان کی اس کی عرفی حیثیت اور اس کی دینی حیثیت اور اس کی خاندانی حیثیت، نسبی حیثیت اور اس کی مشغولیت جس طرح کا وہ کام کرتا ہے اس حیثیت کا آدمی ہے اس کیٹیگری کا آدمی اس اسٹنڈرڈ کا آدمی ہے اس سب کے لحاظ سے "هوازکی لکم" اس میں سب آ جاتا ہے، کسی آدمی کا کام نہیں کہ اس کو ادا کرے "وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْم" اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ (۱)

(۱) درسِ قرآن، سورۃ النور: ۲۷-۲۸ (غیر مطبوعہ)

ستر وحجاب اور عفت و پاکبازی

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ. ذٰلِكَ أَزْكٰى لَكُمْ. إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌم بِمَا يَصْنَعُوْنَ. وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ. وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا. وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ. وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِيْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِيْ أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِيْنَ غَيْرِ أُوْلِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرَاتِهِنَّ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ. وَتُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ جَمِيْعاً أَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (النور: ۳۰-۳۱)

''مومن مردوں سے کہدو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں یہ ان کے لیے بڑی پاکیزگی کی بات ہے اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں خدا ان سے خبر دار ہے اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی آرائش

(یعنی زیور کے مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں مگر جو اس سے کھلا ہے
اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں اور اپنے خاوند اور باپ اور خسر
اور بیٹوں اور خاوند کے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں اور بھانجوں اور اپنی (ہی
قسم کی) عورتوں اور لونڈی غلاموں کے سوا نیز ان خدام کے جو عورتوں کی
خواہش نہ رکھیں یا ایسے لڑکوں سے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف
نہ ہوں (غرض ان لوگوں کے سوا) کسی پر اپنی زینت (اور سنگار کے
مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیں اور اپنے پاؤں (ایسی طور سے زمین پر) نہ
ماریں (کہ جھنکار کی آواز کانوں میں پہونچے اور) ان کا پوشیدہ زیور معلوم
ہو جائے اور مومنو! سب خدا کے آگے توبہ کرو تا کہ تم فلاح پاؤ"۔

عفت و پاکبازی کا ایک واقعہ

دیکھئے.....! اب کوئی کہے کہ قرآن میں تو عقائد کی باتیں ہونی چاہیے، مابعد الطبیعات اللہ کے صفات اور پھر عبادات اور پھر تقرب الی اللہ کا ذریعہ اور یہ گھروں میں جانا نہ جانا یہ تو ایسی روز مرہ کی باتیں ہیں، سب جانتے ہیں یہ بات نہیں ہے، برے اس سے نتائج زبردست نکلتے ہیں، اب دیکھئے صرف ایک واقعہ آپ کو بتائیں کہ یہاں سے مناسبت رکھتا ہے اس لیے کہتے ہیں، آکسفورڈ میں بھی سنایا اور یورپ میں بھی کئی بار سنایا، واقعی بہت قابل اعتناء ہے وہ کہ حضرت سید احمد شہیدؒ نے جب پشاور فتح کیا تو کئی ہفتے گذر گئے ہوں گے، کئی دن گذر گئے ہوں گے مہینہ دو مہینہ گذر گیا، سید صاحب کی جو فوج تھی اس میں زیادہ تر یہ پورب کے لوگ تھے، نوجوان تھے، جنگ میں تو نوجوان ہی ہوتے ہیں، جہاد کرنا تھا وہاں حج کرنے نہیں جارہے تھے تو نوجوان تھے، اچھے اور تندرست ہوتے ہیں، جہاد کے لیے جنگ کرنے کے لیے نوجوانی بھی چاہیے، یا وہ عمر جس میں جنگ کی جاسکتی ہے اور کسی درجے کی تندرستی اور طاقت بھی چاہیے تو پورے مردانہ صفات تھے اور سپاہیانہ خصوصیات بھی تھیں، تو کئی ہفتے گذر گئے ایک مرتبہ ایک پٹھان نے افغانی نے، ہندوستانی مسلمان پتہ نہیں کہاں کے ہوں، رائے بریلی کے آس پاس

کے ہوں، رام پور کے ہوں، دہلی کے ہوں، سارا علاقہ تھا جہاں سے لوگ گئے تھے، ایک ہندوستانی کا ہاتھ پکڑا کہا میاں ایک بات تم سے پوچھتے ہیں اس نے پشتو میں پوچھا ہوگا یا فارسی میں یا جس میں وہ سمجھتے ہوں گے کہ ایک بات پوچھتے ہیں، سچ سچ بتانا، کہا ہاں پوچھئے، کہا تم ہندوستانیوں کی دور کی نظر بہت کمزور ہوتی ہے دیکھ نہیں سکتے ہو کہا نہیں خوب دیکھتے ہیں، کہا نہیں نہیں معلوم ہوتا ہے کہ نسلی طور پر پورے ہندوستان کے لوگوں کی قریب کی نظر تو اچھی ہوگی اور سماعت بھی اچھی ہوتی ہوگی یہ ہم کہہ رہے ہیں، سماعت بھی اچھی ہوتی ہے سب چیزیں لیکن دور کی نہیں دیکھ سکتے، انہوں نے کہا نہیں ہم دیکھ سکتے ہیں (دیکھئے وہ فلاں چیز، یہ ہم سب تفسیر بیان کررہے ہیں، ضروری نہیں کہ لفظ بلفظ ویسے ہی واقعہ ہو) اس کے بعد پوچھا، اس ہندوستانی نے کہ یہ آپ پوچھ کیوں رہے ہیں؟ یہ پوچھنے کی ضرورت کیا پیش آئی کہ ہم جانتے ہیں کہ آپ لوگ بعض مہینوں سے نکلے ہوئے ہیں گھر سے اور بعض کئی کئی برس سے نکلے ہوئے ہیں اور پھر آپ جوان ہیں اور تندرست ہیں اور پھر آپ گھر بار کو چھوڑ کر آئے ہیں آپ کی بیویاں آپ کے ساتھ نہیں ہیں جہاد میں جنگ میں جب جاتا ہے آدمی تو کوئی اپنے گھر والوں کو ساتھ لے جاتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آپ نے شہر فتح کرلیا اب گویا ایک طرح سے آپ مالک بن گئے اور آپ کو اب کوئی ٹوک نہیں سکتا روک نہیں سکتا، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اتنے دن میں ہم نے کسی مجاہد کو آپ کے لشکر جہاں دمیں سے کسی سپاہی کو کسی نامحرم عورت کو نہ دیکھے، تو ہم نے پھر یہی اس کا حل تلاش کیا سمجھا کہ دیکھ ہی نہیں سکتے جب کوئی چیز امکان میں نہ ہو تو بیکار ہے، بہت سے لوگ دور نہیں دیکھ سکتے ہیں نظر کمزور فہے دور کا چشمہ بھی لگانا پڑتا ہے تو جب نہیں دیکھ سکتے اس لیے نہیں دیکھتے ورنہ وہ ضرور دیکھیں تو کیا بات ہے انہوں نے کہا نہیں ہم سب دیکھتے ہیں ہم بتا سکتے ہیں اور یہ کوئی مجبوری کی بات نہیں۔

پردۂ نسواں حفاظت وعصمت کا ایک اہم باب

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ" سورہ نور کی یہ آیت پڑھی کہ یہ تعلیم ہے اسلام کی کہ نگاہیں نیچی رکھیں

اور یہ ہمارے امام امیر المؤمنین کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ تو ہم نے کہا کہ یورپ وغیرہ میں کہ یہ چیزیں اگر مسلمانوں میں ہوتیں یہ امتیاز ہوتا تو لوگ مسلمان ہوتے اور کہتے کہ کس طرح کی قوم ہے، یہ کسی نامحرم کو کوئی جوان آدمی نظر اٹھا کر دیکھتا نہیں۔ کوئی برا ارادہ نہیں ہوتا کوئی زبان سے فحش لفظ نہیں نکلتا کوئی بداخلاقی کی بات نہیں کرتا تو اس کا اثر پڑتا اور اثر پڑا جو مسلمان فوجیں گئیں مصر، شام، عراق وغیرہ تو واقعات میں ملتا ہے۔

جب قیصر نے پوچھا کیا بات ہے میں فوجوں کو بھیجتا ہوں اور سب ہار ہار کر آتی ہیں، بڑے آزمودہ کار اور مشاق جنرلوں کو بھیجتا ہوں جنہوں نے ایرانیوں کے دانت کھٹے کر دیئے اور علاقہ واپس لے لیا ان کو شکست دی، لیکن وہ بھی ہار کر آتے ہیں بتاؤ کیا بات ہے تو انہوں نے کہا جس سے پوچھا تھا وہ رومی تھا۔ کہا اگر جاں بخشی ہو، برا نہ مانیں تو میں صاف صاف کہوں، کہا کہ یہ لوگ رات کو اگر آپ دیکھیں، مسجدوں میں تو آپ کہیں کہ لڑنا وغیرہ کچھ نہیں جانتے، "بالليل رهبان"۔۔۔۔اور اگر دن کو دیکھیں تو آپ کہیں کہ یہ لوگ نماز ہی نہیں پڑھتے "بالنهار فرسان" دن میں جب گھوڑے کی پیٹھ پر دیکھیں تو معلوم ہوا کہ یہ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے اور رات کو اگر مسجدوں میں دیکھیں تو سمجھیں کہ ان کو لڑنے سے کیا کام دوسرے وہاں اتنے مشغول رہتے ہیں کہ "لو حدثك جليسك ما سمع" اگر آپ قریب والے سے بات کریں تو اتنی آواز قرآن مجید کی گونج رہی ہوتی ہے کہ اس کو کہتے ہیں کہ جیسے شہد کی مکھی کی بھنبھناہٹ ہوتی ہے کہ "كصوت النحل" کہ آپ کا ساتھی بات نہیں سن سکتا اور یہ کہ کسی ملک یا شہر کو فتح کر لیتے ہیں، یا غالب ہوتے ہیں" کسی دکان کا سودا بے قیمت نہیں لیتے ہیں پیسے دیں گے اور پھر لیں گے یہ نہیں کہ اب یہ فتح ہو گیا سب ہمارا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر ان کے امیر کا لڑکا بھی اگر چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹیں گے، قیصر نے کہا، قیصر روم کا قصہ ہے اس نے کہا کہ تم نے اگر صحیح کہا تو یہاں تک آ کر رہیں گے، "ليملكن موضع قدمي هاتين" جس جگہ میں بیٹھا ہوں یہاں تک ان کا قبضہ ہوگا اس لیے کہ وہ جانتا تھا اس نے آسمانی صحیفے پڑھے تھے اور بائبل وغیرہ سے خوب واقف تھا کہ جس قوم کے یہ اخلاق ہوں گے اس کو کوئی روک نہیں سکتا، کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا، انہوں نے

کہا میں فوج پر فوج بھیجتا ہوں، بڑے آزمودہ کار جنرل بھیجتا ہوں وہ سب شکست کھاتے ہیں، چلے آرہے ہیں اور سنتا ہوں فلاں فوج بھی ہاری ہوئی ہے فلاں فوج بھی ہاری ہوئی ہے تو یہ معاشرہ بہت ضروری ہے، آپ لوگوں کو جب اللہ موقع دے درس قرآن کا یا آپ کو داعی بنائے کسی شہر کا عالم دین اور مقتداء اور قابل احترام شخصیت عطا کرے تو معاشرے کی طرف توجہ کرنی ہے کہ معاشرہ درست کو، معاشرہ خراب نہ ہو جس کو کہتے ہیں کرپٹ، نہ ہونے پائے غلط تعلقات ناجائز تعلقات، نفسانیت اور اس سے بڑھ کر آگے۔

تو اللہ فرماتا ہے "قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ" اس پر نے ابھی واقعہ سنایا اہل ایمان سے کہہ دو کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں "وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ" اور اپنے ستر کی حفاظت کریں اور خاص طور پر عربوں کا لباس ایسا تھا کہ اس میں لنگی وغیرہ زیادہ تر ہوتی تھیں اور بہت سے ملکوں میں اب بھی بھٹکل میں بھی اس لیے ہوا کا تیز جھونکا آیا اور چادر اڑ گئی لنگی کا کونہ اڑ گیا۔

"ذٰلِكُمْ أَزْكٰى لَكُمْ" بیشک اللہ تعالیٰ خبردار ہے اس سے جو وکرتے ہیں اگر وہ یہ سمجھیں کہ کون دیکھتا ہے اس کو تو یہ نہ سمجھے ﴿إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌم بِمَا يَصْنَعُوْنَ.﴾

غیر محرم کی طرف نظر کرنے کی ممانعت

"وَ قُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ" ایسے ہی ایمان والی عورتوں سے کہئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ یہ مردوں ہی کا فرض نہیں ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے دل دونوں کو دیئے ہیں اور دونں کو بشریت کے صفات سے اور اس کے اثرات سے متصف کیا ہے "وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ" اور وہ بھی اپنے ستر کی حفاظت کریں "وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ" اور اپنا سنگار یا اپنی زیبائش، زیبائش کبھی لباس کی شکل میں ہوتی ہے یعنی وہ زینت کی کپڑوں کی شکل میں اور کبھی جسمانی ہوتی ہے جسمانی زیبائش بھی ہوتی ہے اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک عضو میں دلکشی رکھی ہے صفائی رکھی ہے اور حسن بھی دیا ہے اور اپنی زیبائش کو ظاہر نہ کریں۔

"اِلَّا مَاظَهَرَ مِنْهَا" مگر جس کا ظاہر کرنا ضروری ہے ہاتھ ہے آنکھ ہے جب تک کھلی

نہ ہو دیکھ نہیں سکتا آدمی، چہرے سے نقاب ہٹ جائے ہوا کے اثر سے یا اس کے بغیر راستہ نہیں چل سکتے تو اس کو اللہ نے مستثنیٰ کر دیا۔

"وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ" اور وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے جو دوپٹے ہیں اپنے پہلوؤں پر بھی رکھیں "وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ أَوْ أٰبَائِهِنَّ" اور پھر زیبائش کو ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں کے لیے، یا باپ کے لیے، یا شوہروں کے باپ کے لیے، خسر وغیرہ جو کہلاتے ہیں "أَوْ أَبْنَائِهِنَّ" یا اپنے بیٹوں کے لیے "أَوْ أَبْنَاءِ بُعُوْلَتِهِنَّ" یا شوہروں کے بیٹوں کے لیے جو دوسری ازواج سے ہیں یا پہلے سے تھے اور "أَخْوَانِهِنَّ" اور اپنے بھائیوں کے لیے ان کے سامنے ظاہر کر سکتی ہیں "أَوْ بَنِيْ اِخْوَانِهِنَّ" اور بھتیجوں کے سامنے "أَوْ بَنِيْ أَخَوَاتِهِنَّ" بھانجوں کے سامنے "أَوْ نِسَائِهِنَّ" گھر کی لونڈیوں اور کام کاج کرنے والیوں کے سامنے "أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ" خادمات وغیرہ کے سامنے یا جو ملنے جلنے آئیں "أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُنَّ" یا باندیوں کے سامنے "أَوِ التَّابِعِيْنَ غَيْرِ أُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ" یا اس طرح کے مرد جو اتنے بوڑھے ہو چکے ہوں اور اتنے معذور ہوں یا کچھ فطری طور پر کچھ ایسے ہوں کہ ان کو ادھر توجہ ہی نہیں ہوتی۔ یہ ایک صنف ہوتی ہے پانی بھرنے والے ہیں بعض جھاڑو دینے والے ہیں بھنگی ہیں یہ صرف اپنا کام کرتے ہیں پیسے لیتے ہیں وہ کسی چیز کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھتے ہیں نہ توجہ ہوتی ہے "أَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ" یا پھر ایسے بچے کہ جو عورتوں کی جو ستر ہیں جو چیزیں ان کی چھپانے کی ہوں ان کا ان کو کوئی علم نہیں ہوتا ہو چھ برس کا بچہ ہے سال بھر کا جانتا ہی نہیں کچھ۔

"وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ" اور اپنے پاؤں زور سے زمین پر نہ رکھیں اور ایسی چال نہ چلیں کہ معلوم ہو جائے کہ ہاں زینت ان کے پاؤں میں ہے جھنکار ہے زیوروں کی آواز ہے یا پازیب وغیرہ کی آواز آئے۔

"وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ" اور اللہ کی طرف رجوع کرو تم سب کے سب اے ایمان والو تا کہ تم کامیاب ہو۔ (۱)

---

(۱) درسِ قرآن، سورۃ النور: ۳۰-۳۱ (غیر مطبوعہ)

طلباء مدارس کا بہترین تعارف

﴿یَا یَحْیٰ خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ، وَآتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا. وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَکٰوۃً ☆ وَکَانَ تَقِیًّا، وَبَرًّا بِوَالِدَیْہِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّاراً عَصِیاًّ﴾ (مریم: ۱۲-۱۴)

''اے یحیٰ اللہ کی کتاب کو مضبوط پکڑو اور ہم نے بچپن ہی میں ان کو حکمت عطا فرمائی، اور شوق دیا اپنی طرف سے اور ستھرائی اور وہ متقی تھے اور اپنے والدین کے بڑے فرماں بردار اور وہ نافرمان اور جبر کرنے والے نہیں تھے''۔

کتاب کو مضبوط پکڑنے کی ضرورت ہے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے''یَا یَحْیٰ خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃ ''اے خدا کے پیغمبر یحیٰ ''کتاب'' کو یعنی کتاب آسمانی کو مضبوط پکڑو، طاقت کے ساتھ تھامو، طاقت کے ساتھ ہاتھ میں لو، !

اس میں ایک بات معلوم ہوئی (خاص طور پر طالب علموں کے لیے) کہ''خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃ'' ''کتاب'' کو قوت سے پکڑنے کی ضرورت ہے، مطلب یہ ہے کہ کتاب کو اچھی طرح سے سمجھا جائے، رکھا جائے، پڑھا جائے اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور بغیر قوت کے کسی چیز کو کیے ہوئے وہ کام ہوتا نہیں۔''خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃ ''یہ''الکتب'' جو ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اتاری ہوئی آسمانی کتاب اس کو''قوت'' سے پکڑو۔ سارے جامعہ کا

ماحصل اس میں آگیا کہ ''کتاب'' کو ''مضبوط'' پکڑنا ہے۔آج دنیا میں کیا ہے ؟ یا ''الکتاب'' نہیں ہے،یا''القوۃ'' نہیں ہے،یاتو پکڑنے والا ہاتھ ہے یا پکڑنے والی چیز نہیں ہے کہ کس کو پکڑے ؟ان صحیفوں کو پکڑے ؟ ان کتابوں کو، ان پشتاروں اوران کاغذات کے اوراق کو پکڑے جو ہوا میں پریشان ہیں اوراڑ رہے ہیں؟اب ''الکتاب'' کو پکڑو جو اللہ کی آسمانی کتاب ہے اور جس سے انسانوں کو ہدایت ملی اور قیامت تک اسی سے ہدایت ملے گی۔

''وَمَن لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ نُورًا فَمَالَهُ مِن نُّور'' (سورۃ النور: ۴۰)جس کے لیے اللہ ہی روشنی پیدا نہ کرے اس کے لیے پھر کہیں روشنی نہیں ہے، اللہ کی نازل کی ہوئی الکتاب خواہ وہ زمانۂ سابق میں توریت اورانجیل کی شکل میں ہو یا اورآسمانی صحیفوں کی شکل میں ہو جن کا ہم کو صحیح طور پر سب کا نام معلوم نہیں اور یا وہ اللہ کی آخری کتاب قرآن شریف ہو، اس کو مضبوط پکڑنا ہے، وہی ہے جس سے ساری دنیا میں صحیح علم پھیلا ،لوگوں کو خالق کائنات کی بھی، اس دنیا کے پیدا کرنے والے کے بھی اوراپنی بھی صحیح شناخت ہوئی اوران کو صحیح معرفت حاصل ہوئی، اپنی حقیقت بھی پہچاننا بہت ضروری ہے، اگر آدمی اپنی حقیقت نہیں پہچانتا، اپنی زندگی کا صحیح مقصد نہیں جانتا اوراپنے اور خدا کے تعلق کو نہیں جانتا تو وہ کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے سکتا۔

''خذ الکتاب بقوۃ'' کا صحیح مفہوم

وہ فرماتا ہے ''يَا يَحْيَىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ '' کہ اے یحیٰ !اللہ کی کتاب کو مضبوط پکڑو اوراس طرح پکڑو کہ ہاتھ سے گرنے نہ پائے اورکوئی تم سے چھیننے نہ پائے اوراس طرح پکڑو کہ اس کو پڑھ کر ایک مرتبہ سمجھ کر پھر بھولنے نہ پاؤ۔جیسے اللہ تعالی فرماتا ہے ''سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنسَىٰ'' (سورۃ الاعلیٰ: ٦)ہم تم کو ایسا پڑھائیں گے کہ پھر تم کہیں بھولنے نہ پاؤ گے۔

کتنے پڑھنے والے جو پڑھ پڑھ کر بھول جاتے ہیں، کتنے پڑھنے والے ہیں کہ جو کچھ

انہوں نے پڑھا تھا اس کے خلاف ہی کرتے ہیں، کتنے پڑھنے والے ہیں کہ پڑھا انہوں نے کچھ اور پڑھاتے ہیں کچھ، لیکن جو کچھ پڑھا اس کو یاد رکھے، جو کچھ پڑھا اس پر عمل کرے، جو کچھ پڑھا وہی دوسروں کو دے، جو کچھ صحیح زبان اور صحیح جگہ سے حاصل کیا تھا وہی صحیح طریقہ سے دوسروں تک پہنچائے، یہ سب ''قوت'' کے مفہوم میں شامل ہے۔

''يَا يَحْيىٰ خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ'' اے یحیٰی کتاب کو مضبوط تھامو، مضبوط پکڑو اس طرح کہ پھر تمہارے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے جیسے قوموں سے چھوٹ گئی، ملتوں سے چھوٹ گئی، افراد سے چھوٹ گئی، قوموں سے ایسی چھوٹی کہ آج ان قوموں کو ان کتابوں کے نام بھی یاد نہیں اور نہیں بتا سکتے کہ کون سی کتاب ان کو دی گئی تھی، افراد سے اس طرح سے چھوٹی کہ انہوں نے کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھا اس میں کیا لکھا ہے اور اس کو طاق پر سجا کر رکھ دیا، ہم مسلمان بھی اس کے گنہ گار ہیں کہ قرآن مجید ہم دیا گیا تھا عمل کرنے کے لیے لیکن ہم نے اس کو جزدانوں میں سجا کر، اس کو عمدہ سے عمدہ کپڑا پہنا کر اور طاق پر جو طاق نسیاں ہے، اونچے طاق پر اس کو رکھ دیا (کہ بڑی متبرک کتاب ہے) اور اس کے اوپر گرد جمتی رہی اور ہم نے اس کو کبھی اٹھا کر نہ دیکھا کہ کیا لکھا ہے، ہم نے زندگی میں اس کو منتقل نہیں کیا، ہم نے اپنی زندگی میں اس کا مظاہرہ اور Demonstration نہیں کیا اور ہم نے اپنی زندگی میں اس پر عمل کر کے نہیں دکھایا۔

ستارۂ اقبال مندی

''وَآتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا'' '' اور ہم نے بچپن ہی میں ان کو حکمت عطا فرمائی'' ہم نے ان کو حکمت اور قوت فیصلہ عطا فرمائی بچپن ہی میں) جو عام طور پر اس سن میں، اس عمر میں نہیں ملا کرتی، لیکن وہ نبی ہونے والے تھے اور نبی کے بیٹے تھے اور خاندانی ان کی پشتوں میں کتنے نبی ہو چکے تھے۔

بالائے سرش ز ہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی

شاعر کہتا ہے کہ ان کی پیشانی پر ہوشمندی کی وجہ سے بلندی اور اقبال مندی کا ستارہ چمک رہا ہے۔

پاک دل و پاکباز

"وَحَنَاناً مِن لَّدُنَّا وَزَكٰوةً" اور ہم نے ان کو بچپن ہی میں قوت فیصلہ اور حکمت عطا فرمائی اور ایک اشتیاق، ایک شوق کی کیفیت اپنی طرف سے ان کو عطا فرمائی، یہ دعاء اور عبادت کی روح ہے "وزکوۃ"" اور ستھرائی)" یعنی ان کے اخلاق اسی وقت سے مختلف تھے، بچوں کی طرح سے کھیل، تماشہ، یا چلانا، یا زبان سے نامناسب الفاظ نکال دینا، یا مانگنا، یا لالچ، یہ کچھ نہیں، بلکہ بچپن ہی سے ان کے انداز دوسرے تھے۔

فرمایا "وَحَنَاناً مِّن لَّدُنَّا وَزَكٰوةً" ہاں اپنی طرف سے ہم نے ان کو محبت وشفقت دی، ترس کھانا سکھایا، پاکی اور ستھرائی دی، ان کے اخلاق پاکیزہ، ان کا جسم پاک، ان کے کپڑے پاک، ان کے ارادے پاک، ان کی نیتیں پاک، ان کے کام پاک، یہ لفظ "زکوۃ" سب کو شامل ہے ﴿وَزَكٰوةً﴾ وہ سراپا پاکی تھا، وہ مجسم پاکی تھا۔

"وَكَانَ تَقِيًّا" "اور وہ متقی تھے" یعنی وہ اپنی عمر اور اپنے ماحول، اپنے سن اور ان سب کے لحاظ سے جو "تقوی" ہوسکتا ہے، وہ ان کے اندر تھا، ایک بچوں کے اندر تقوی ہوتا ہے، ایک بڑوں کا تقوی ہوتا ہے ایک انبیاء کا تقوی ہوتا ہے، ایک اولیاء کا تقوی ہوتا ہے، اسی میں بچوں کا بھی ایک تقوی ہے یعنی اس میں احتیاط اور خاموشی اور قناعت "وَكَانَ تَقِيًّا" وہ چالاک نہیں تھے، وہ مال حاصل کرنے اور دولت بڑھانے کے نئے نئے اور ہوشیاری کے طریقے نہیں جانتے تھے بلکہ "وَكَانَ تَقِيًّا" ان کے اندر احتیاط تھی، ان کے اندر ہر ایک کا خیال تھا، کسی کو تکلیف نہ پہنچنے پائے اور کسی کا حق نہ مارا جائے۔

"وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ" اور اپنے ماں باپ کے بڑے فرماں بردار اور بڑے سپوت ان کے بڑے خدمت گزار اور اطاعت شعار۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کو اشتیاق دیا اور ستھرائی دی اور اس کے بعد جب بڑے ہوئے تو تقوی بھی عطاء فرمایا اور اب اپنے والدین کے بڑے فرماں بردار "وَلَمْ يَكُنْ جَبَّاراً عَصِياًّ" "اور وہ نافرمان اور جبر کرنیوالے نہیں تھے"۔

یعنی یہ "جباریت" جو ہے یہ بھی مختلف زمانوں اور مختلف امکانات اور طاقتوں،

صلاحیتوں اور معیار واقدار کے مطابق جبریت ہوتی ہے، ہر زمانہ کی ایک جبریت اور ہر ماحول کی ایک جبریت اور ہر فرد کے مطابق یہ جبریت ہوتی ہے تو "وَلَمْ يَكُنْ جَبَّاراً عَصِيّاً" اللہ تعالیٰ نے نکرہ بول کر کے بالکل سب کی نفی کی، کسی طرح کے جبار، کسی طرح کے وہ جابر نہیں تھے، نافرمان، سرکش، ضدی، ہٹ دھرم اور مغرور اور بہت سختی کرنے والے نہیں تھے"۔

قرآن کی عملی تفسیر کی ضرورت ہے

اگر آج ہم مسلمان اپنی زندگیوں میں اس کا نمونہ دکھاتے تو میں یقین کرتا ہوں کہ آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا! آج خود ہمارے ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا! کیسی محبت ہوتی، کیسی دیانتداری ہوتی، کیسا فرض کا احساس ہوتا، کیسے ملک کی خدمت کا جذبہ ہوتا، کیسے خدا کی معرفت گھر گھر عام ہوتی، سب اس دنیا کے اور اس ملک کے رہنے والے اپنے معبود کو پہچانتے انسان کا مرتبہ پہچانا جاتا، اگر اس کتاب پر اپنی زندگیوں میں عمل کر کے ہم مسلمان دکھاتے تو سب کو معلوم ہوتا کہ انسان کا کیا مرتبہ ہے، انسان کیسی قیمتی چیز ہے، انسان خدا کا کیسا پیارا ہے، "وَبَرّاً بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّاراً عَصِيّاً" "اور ہم نے ان کو بچپن ہی میں حکمت دی" اب اگر خدا کسی کو حکمت دیتا ہے اور اس کا سینہ کھولتا ہے، اس کو علم لدنی حاصل ہوتا ہے، تو سبحان اللہ لیکن ہر ایک کی ایسی قسمت کہاں، اس لیے ایسے مدرسے قائم کیے جاتے ہیں، یہاں سے ابتدائی مدرسوں کی بنیاد پڑی، "وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيّاً"۔

اہل مدارس کا باطن کس طرح ہونا چاہیے

اور پھر اس کے بعد پڑھ لکھ کر بے درد بننا نہیں ہے، ظالم بننا نہیں ہے، انسان کا شکاری بننا نہیں ہے، کام چور، غلہ چور اور دولت چور بننا نہیں ہے، بلکہ پڑھ لکھ کر اور محبت بڑھنی چاہیے، پڑھ لکھ کر دل سے انسانوں کی محبت کے چشمے ابلنے لگیں اور دل کو موم کی طرح پگھلنا چاہیے، دل کو پتھر نہیں ہونا چاہیے بلکہ موم ہونا چاہیے، فولاد نہیں ہونا چاہیے، فولاد ہونے کا موقعہ وہ ہے کہ جب کوئی بہت اہم مقصد ہو ورنہ دل کو تو ریشم بننا چاہیے، دل کو تو بہتے ہوئے

پانی کی طرح ہونا چاہیے، اللہ تعالی فرماتا ہے''وَحَنَاناً مِّن لَّدُنَّا ''ہم نے اپنی طرف سے اس کے دل میں محبت کا چشمہ بہایا، محبت کا چشمہ ابلنے لگا، ہر ایک پر ترس کھانا، ہر ایک کے لیے آنسو بہانا ہر ایک کا غم اپنا غم بنالینا، ہر ایک کے لیے تڑپنا، ہر ایک کے لیے پگھلنا اور سلگنا، ہر ایک کے کئے جلنا اور ہر ایک کے غم میں گھلنا، یہ ہر پڑھے لکھے انسان کا شعار اور MOTO ہونا چاہیے کہ وہ جب کسی انسان کی مصیبت دیکھے تو اس کا دل پگھل جائے، اس کی آنکھ سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگے اور وہ تڑپ کر مرجائے، اس کو کھانے میں مزہ نہ آئے، پینے میں مزہ نہ آئے، جیسے حضور ﷺ تھے کہ جب قیدی آئے جنہوں نے آپ کے اوپر تیر چلائے تھے، جنہوں نے آپ پر پتھر برسائے تھے، جنہوں نے آپ کو گالیاں دی تھیں، جنہوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، جنہوں نے آپ کے ساتھ وہ سلوک کیا تھا جو کوئی کسی خونخوار جانور کے ساتھ بھی نہیں کرسکتا، جب وہ قید ہو کر آئے تو رات بھر آپ کو نیند نہ آئی کہ ان بیچاروں کے ہاتھ پاؤں پر ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، کسی کی کراہ سن لی تو آپ ﷺ بے قرار ہوجاتے تھے اور اگر نماز میں (کہ جس سے بڑھ کر کہ کوئی آپ کے لیے محبوب مشغلہ نہیں تھا، فرماتے تھے کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے(۱) لیکن) کسی بچہ کا رونا سن لیتے تھے تو جلدی نماز ختم کرتے تھے کہ معلوم نہیں کہ اس کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی (۲) وہ نبی رحمت جسکی رحمت ومحبت کا یہ حال تھا اس کے نائبین جو علماء، فضلاء، جامعہ سے نکلنے والے اور مدارس سے فارغ ہونے والے ہیں ان کا دل کیسے سخت ہوسکتا ہے؟''وَحَنَاناً مِّن لَّدُنَّا وَزَكٰوةً''۔

مدارس وجامعات کے لیے بہترین چارٹ

یہ جامعہ کے فارغ کا اور اس کے مقاصد کا بہترین سراپا ہے، بہترین حلیہ ہے اور بہترین نقشہ ہے بہترین تعارف اور بہترین چارٹ ہے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کسی جامعہ کا صحیح الفاظ میں تعارف اور اس کا مکمل تخیل اور وہاں کے فضلاء وہاں کے اساتذہ، وہاں کے طلباء کے اخلاق کا خلاصہ قرآن مجید جیسی کتاب میں (جو لافانی کتاب ہے، جو

(۱) نسائی: کتاب عشرۃ النساء باب حب النساء رقم: ۹۳۹ (۲) مسند احمد، ج:۳، ص:۱۹۹-۲۸۵

انسانیت کا صحیفہ ہے۔ جو قیامت تک باقی رہنے والی ہے اور جس سے ساری دنیا کو پیغام اور رہنمائی ملی ہے)۔

کیا کسی ایسے جامعہ کا تخیل بھی اس کے اندر پایا جاتا ہے؟ چند لفظوں میں بتا دیا گیا ہو کہ جامعہ کس لیے ہوتا ہے؟ اور اس سے پڑھ کر نکلنے والوں کو کیسا بننا چاہیے؟ ان میں کیا صفات ہونی چاہئیں۔ تو میں یہ آیت دوں گا۔

"یَا یَحْیٰ خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّةٍ، وَآتَیْنٰهُ الْحُکْمَ صَبِیًّا. وَحَنَاناً مِّن لَّدُنَّا وَزَکٰوةً. وَکَانَ تَقِیًّا، وَبَرًّا بِوَالِدَیْهِ وَلَمْ یَکُنْ جَبَّاراً عَصِیاً" کہ اس آیت کو بہت سنہرے حروف سے خوشخط لکھ کر اور اس کا ترجمہ کروا کر اس جامعہ کی دیوار پر آویزاں کر دو۔

کسی جامعہ کے فارغ اور جامعہ میں داخل ہونے والے کے لیے اس سے بہتر کوئی پیغام اور اس سے بہتر اس کے لیے کوئی خلعت نہیں ہوسکتا جو اس کو پہنایا جائے، اس سے بہتر کوئی تعارف نہیں ہوسکتا جن لفظوں میں خدا کے اس پیغمبر (حضرت یحیٰ علیہ السلام) کا ذکر کیا گیا ہے۔[۱]

---

(۱) مشترک اخذ و تلخیص از ☆ درس قرآن سورۃ مریم: ۱۲-۱۴ (غیر مطبوعہ) ☆ ملت اسلامیہ کا مقام و پیغام: ۶۵-۷۰

باب سوم

مواعظ وحکم

..........**قرآن حکیم**..........

کتابِ ہدایت ہے، قیامت تک اس سے ہدایت کے چشمے پھوٹتے رہیں گے، اہلِ علم ومعرفت علومِ قرآن کے ناپید کنار سمندر ہیں، غواصی کرکے آبدار موتی نکالتے رہیں، نہ قرآن حکیم کے علوم ومعارف کا سمندر پایاب ہوگا نہ قرآنی احکام وتعلیمات پر کہیں گی وفرسودگی کا اثر آئے گا، زمانہ گذرنے کے ساتھ قرآن سے استفادہ کی نئی نئی راہیں کھلیں گی۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم سے امت مسلمہ کا رشتہ جس قدر استوار اور مضبوط ہوگا اسی قدر یہ امت فلاح وکامرانی کی راہ پر گامزن ہوگی، عزت واقبال مندی اس کے قدم چومے گی۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مقدمہ کتاب: ایمان والوں سے اللہ کا خطاب (الف)

کوہِ صفا پر پہلا اعلانِ حق

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ (الحج: ۴۹)

اللہ تبارک وتعالی ارشاد فرماتا ہے کہ اے نبی ﷺ آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو "اِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ" میں تمہارے لیے کیا ہوں؟ ایک کھلا ہوا ڈرانے والا، "انما" کے معنی کی رعایت کرتے ہوئے ہم نے کہا ہے کہ میری اصل حیثیت جو ہے، جو مجھے ممتاز کرتی ہے دوسرے انسانوں سے (بہت سی چیزیں مشترک ہوتی ہیں، پیغمبروں میں اور انسانوں میں مثلاً شرافت، شرافتِ نسبی، شرافتِ اخلاقی، حسن صورت، حسن سیرت اور اخلاق اور چیزیں تو "اِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ" "انما" اس لیے آتا ہے کہ یری جو اصل حیثیت ہے جو میری امتیازی صورت ہے وہ یہ ہے کہ میں کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

اور یہ "مبیـــن" کا لفظ بھی یہاں محض ایک لفظ کے طور پر نہیں آیا ہے ڈرانے والے بہت ہوتے ہیں، شاعر بھی ڈرانے والے کا کام کرتا ہے، پیشین گوئی کرنے والا بھی ڈرانے والے کا کام کرتا ہے اور قیافہ شناس بھی ڈرانے والے کا کام کرتا ہے اور جو واقعات سے واقف ہوجاتا ہے، جنگ ہونے والی ہے، فلاں قبیلہ ناراض ہے، فلاں شخص سازش کررہا ہے، فلاں ملک حملہ کرنے والا ہے، سب ڈرانے والے ہوتے ہیں، لیکن "نَذِيرٌ مُّبِينٌ" جو ہے وہ پیغمبر ہوتا ہے کہ وہ ایک تو اس خطرے کا انتخاب کرتا ہے جو سب سے بڑا خطرہ ہے، حقیقت میں نذیر اسی کو کہنا چاہیے اور "نَـذِيـرٌ مُّبِينٌ" اس کے ڈرانے میں کسی قسم کا اشتباہ،

التباس اوراشتراک، غلط فہمی وغیرہ نہیں ہوتی، کھل کر کہتا ہے، جیسے کہ آپ نے کوہِ صفا کی چوٹی پر تشریف لے جا کر کہا کہ لوگو، اگر میں تم سے یہ کہوں ''یہ واقعہ بھی نبوت کی تاریخ میں الحمدللہ دوسری زبانوں میں مطالعہ کیا ہم نے اس سے بہتر نبوت کو سمجھانے کے لیے اس وقت کوئی واقعہ نہیں ملا'' آپ اس کو ذہن میں لائیے چونکہ ''نَـذِیـرٌ مُّبِیـنٌ'' اس لیے اس مناسبت سے اس واقعے کو ہم بیان کرتے ہیں یہ سیرت کا واقعہ۔

ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں واقعہ

جب آپ کو حکم ہوا اللہ کی طرف سے کہ ﴿وَأَنْـذِرْ عَشِيْـرَتَكَ الْأَقْـرَبِيْـنَ﴾ ڈرایئے اپنے قریب کے عزیزوں کو (سب قریب ہی کے تھے، مکہ معظّمہ میں جتنے قبائل تھے ان کی آپس میں قرابتیں تھیں، سب قریشی تھے اور پھر ان قریشیوں میں بنی ہاشم آپ اور زیادہ قریب کے تھے، بنی امیہ، بنی ہاشم ان دونوں میں بھائیوں کا فرق تھا) تو آپ خیال کیجئے اپنے ذہن میں نقشہ لایئے کہ مکہ معظّمہ بہرحال ایک شہر تھا (یہ ہم سیرت میں جو پڑھتے ہیں تو مکہ معظّمہ اور مدینہ طیبہ کی جو جغرافیائی، عرفی، اور اقتصادی اور شہری حیثیت تھی اس پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ الحمدللہ ہمارے انورالجندی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے جو سیرت پر لکھا ہے کہ اس میں شاید پہلی مرتبہ مکہ معظّمہ کے متعلق بتایا گیا ہے) کہ وہ قرآن مجید میں تو اس کو قریۃ کہا گیا ہے، لیکن وہ عربی کا محارہ ''قـريـة'' کا یہ نہیں ہے کہ گاؤں جیسے ہوتے ہیں اور پھر ''ام القریٰ'' اس کو کہا گیا ہے تو وہ تمدنی حیثیت سے لسانی حیثیت سے اور ذہنی حیثیت سے اور تاریخی حیثیت سے پورے جزیرہ العرب میں ممتاز شہر تھا، یہ سیرت کے مطالعہ کرنے والے اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ مکہ معظّمہ میں بعثت ہوئی، ایک شہر تھا ایک گاؤں سا تھا، یہ بات نہیں ہے بلکہ جو لوگ عربی شاعری کا مطالعہ کریں اور محاورات کا مطالعہ کریں اور ٹکسالی زبان کا مطالعہ کریں اور پھر ''اعراف'' جسے کہتے ہیں یعنی رسوم وعادات، جو چیزیں مان لی جاتی ہیں کہ نہیں یہ تہذیب ہے یہ بدتہذیبی ہے یہ شرافت ہے یہ عدم شرافت ہے تو یہ جو اعراف، آئیڈیل اور Values جسے کہتے ہیں انگریزی میں اقدار و

معیار، ان کا جو مطالعہ کرے، تاریخ عرب ادبی طور پر لسانی طور پر اور جغرافیائی طریقہ پر تمدنی طریقے پر مطالعہ کرے گا اور ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں، زیادہ تر سمجھتے ہیں کہ عربی سمجھ میں آجائے اور قرآن وحدیث کے معانی سمجھ لیں تو جنہوں نے عرب کا مطالعہ کیا ہے اس کی شاعری کے ذریعہ سے بھی اور اس کے محاورات کے ذریعہ سے بھی اور اس کے اعراف کے ذریعہ سے بھی اور عادات کے ذریعہ سے بھی اور نظریات کے ذریعہ بھی کہ کس نظر سے کس شہر کو دیکھتے تھے اس کو معلوم ہوگا کہ مکہ معظّمہ سب سے بڑا مرکزی شہر تھا اس کی بات معیار سمجھی جاتی تھی یہ بات کہاں ہوتی ہے مکہ میں ہوتی ہے لوگ ایک دم سے اس کو تسلیم کر لیتے۔ (۱)

نبوت کی حکیمانہ اور زندۂ جاوید تمثیل

تو اب ''وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ'' یہ آیت نازل ہوئی سب سے رشتہ ہی تھا پریس نہیں ہے کہ ریڈیو نہیں ہے اور یہ بھی طریقہ نہیں ہ ایک شخص گھومتا پھرے شہر میں کہے کہ آج جلسہ ہونے والا ہے، آج جلسہ ہونے والا ہے، فلاں پارک میں جلسہ ہونے والا ہے، فلاں جگہ جلسہ ہونے والا ہے، یہ بھی دستور نہیں تھا تو اب یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سلامت فکر اور وہاں کے اعراف سے عادات سے واقفیت کی بات تھی اور یہ نبوت کے معارض نہیں ہے بلکہ نبوت کے محاسن میں سے ہے اس کو اپنی دعوت میں اس سے مدد ملتی ہے کہ وہ زمانہ پورے عرب میں ایک عرف تھا جیسے ایک طے شدہ چیز ہوتی ہے ایک کنونشن ہوتا ہے سمجھوتا

(۱) جیسے مثال کے طور پر (اللہ معاف کرے گا) سمجھانے کے لیے کہتے ہیں، دہلی، لکھنؤ، زبان کے اعتبار سے تہذیب کے اعتبار سے اور کچھ ہو نہ ہو تہذیب کے اعتبار سے یہ کہاں ہوتا ہے وہ کہتا ہے لکھنؤ میں ہوتا ہے، لکھنؤ کی تہذیب مسلم تھی ایسے ہی دہلی کی تہذیب تھی میر تقی میر کا شعر ہے۔

دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

تو وہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا جو زمانہ ہے، ۱۸۵۷ء کے بعد کا بھی زمانہ بہت سا ایسا ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کا نام لے لینا یہ کافی ہوتا تھا کہ یہ شرفاء کا طریقہ ہے یہ وضعداری کی بات ہے یہ تہذیب کی بات ہے تو اس حیثیت سے ہم نے دیکھا نہیں بعض کتابیں ہیں ان میں آلوسی کی کتاب بڑی اچھی ہے ''العرب قبل الاسلام'' ہمارے پاس تھی ہم نے فائدہ اٹھایا اس سے تو عام طور پر بس لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادر تھا مکہ میں بھیج دیا۔

جیسے ہوتا ہے کہ اگر کسی خطرہ کا اعلان کرنا ہے، دشمن چھپا ہوا ہے حملہ کرنے والا ہے تو پہاڑ پر چڑھ کر ''واصباحاہ'' یہ نعرہ لگایا جاتا تھا ''واصباحاہ'' بس سارا شہر دوڑ پڑتا تا (عربوں میں جھوٹ بولنے کا رواج نہیں تھا اصل عربی جو فطرت ہے اور عربی نسبی اور قبائلی خون اور متوارث چیز جو ہے وہ جھوٹ بولتا نہیں ہے اگر کبھی جھوٹ بولا تو کسی باہر کے اثر سے یا کسی غلط تربیت کی وجہ سے، اور ان کی شاعری میں بھی آپ دیکھئے اور ان کی گفتگو میں بھی آپ دیکھئے اور پھر سیرت میں بھی جب ان کے واقعات آتے ہیں اور سب کچھ ملتا ہے لیکن وہ جھوٹ بولنا نہیں ملتا ہے بہت کم ہے تو شیطان کا اثر ہے تو جہاں ''واصباحاہ'' کا نعرہ لگایا جاتا، وہاں سب لوگ دوڑ پڑتے تھے) مطلب یہ ہے کہ دشمن چھپا ہوا ہوسکتا ہے میدان میں کہنے سے اگر دشمن ہوتا تو ہم بھی دیکھتے جس طرح آپ دیکھ رہے ہین ہم بھی دیکھ رہے ہیں تو آپ کوہ صفا کی چوٹی پر تشریف لے گئے [1] اور آپ نے ''واصباحاہ''''یاصباحاہ'' کا نعرہ لگایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر جو موقف اختیار کیا اور جس حکیمانہ انداز سے اس مسئلہ کو حل کیا وہ آپ کے لافانی معجزات میں سے ایک ہے،

اب دو باتیں تھیں ایک تو جو عرف چلا آ رہا تھا جو متوارث اور متفق علیہ بات تھی کہ آپ الصادق ہیں اور الامین ہیں اچھا الصادق الامین میں ایک خاص رشتہ ہے الصادق ہونا خالی کافی نہیں ہوتا، الامین جب ہوگا تو اس کے اندر ورد بھی ہوگا الصادق وہ ہے جو واقعہ کو بیان کردے صرف، لیکن الامین وہ ہے جو اپنے اوپر حق بھی سمجھے، یہ بہت نازک چیز ہے اور آپ کو دونوں خطاب دینا یہ آپ کی خصوصیت ہے تو الصادق تو دنیا میں بہت ہوتے ہیں، امین بھی ہوتے ہیں لیکن الصادق نہیں ہوتے ہیں، تو اب یہ بھی عربوں کی ذہانت اور قیافہ شناسی اور اخلاقی جرات تھی کہ انہوں نے دونوں لفظ کا انتخاب کیا، الصادق الامین، چنانچہ جب وہ حجر اسود رکھنے کا معاملہ تھا اس وقت بھی کہا الصادق الامین آ گئے، تو الصادق الامین کا لقب

(۱) اب کوہ صفا ویسا نہیں رہا ہم نے تھوڑا سا دیکھا ہے کوہ صفا کی چوٹی تھی اونچا تھا، ہم مطالعہ کرنے جاتے تھے، حاجی عبدالوہاب صاحب مرحوم کا مکان تھا اور کتب خانہ تھا تو ہمارا روزانہ کا معمول تھا کہ ہم صبح چلے جاتے تھے اور ظہر کی نماز کے وقت آتے تھے ''ماذا خسر العالم'' جب لکھ رہے تھے اس کے عربی مصادر کے لیے تو اس وقت کوہِ صفا کی چوٹی اچھی خاصی اونچی تھی۔

خود عربوں نے دیا تھا اب اس میں کیا شبہہ ہوسکتا تھا تو ایک تو عرف اور دوسرے اس کے ساتھ پھر ذات کی شمولیت.....اور آپ کی آواز بھی ان کے لیے اجنبی یا نا موس نہیں تھی اس مانوس آواز سے ان کے کان آشنا تھے اور اس آواز کو سننے والوں کا بے مثال اعتماد بھی آپ کو حاصل تھا، یہ کسی عام آدمی کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی معمولی آواز نہیں تھی بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہونٹوں سے نکل رہی تھی۔

جن کو لوگ نبوت سے پہلے ہی صادق اور امین کا لقب دے چکے تھے جب اہل مکہ نے اس صادق اور امین کو یہ آواز دیتے ہوئے سنا اور اس پکار کے بارے میں اور نہ کسی بات کے صرف اعلان یا کسی بات پر آمادہ کرنے یا اس سے برگشتہ کرنے کے لیے یہ حرکت کی جاسکتی ہے انہوں نے یہی سمجھا کہ کوئی بہت بڑا خطرہ درپیش ہے اور سب کے سب سنتے ہی آپ کی طرف دوڑ پڑے اور وادئ مکہ کے بسنے والے پہاڑ کے دامن میں جمع ہوگئے، حیرت واستعجاب سے ان کے سر اٹھے ہوئے تھے اور سب کی نگاہیں قریشی ہاشمی نوجوان محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مرکوز تھیں لوگ منتظر تھے کہ دیکھیں کیا کہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے بنی عبدالمطلب، اے بنی فہر، اے بنی کعب ذرا یہ تو بتاؤ کہ اگر میں تمہیں اطلاع دوں کہ اسی پہاڑ کے اوٹ میں سواروں کا ایک دستہ چھپا ہوا ہے جو تم پر ٹوٹ پڑنا چاہتا ہے تو کیا تم سچ مانو گے؟

عربوں کا ذوق سلیم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کو مخاطب کیا تھا اور جن سے یہ سوال کیا تھا وہ ''ناخواندہ'' اور ''غیر ترقی یافتہ'' تھے انہوں نے فلسفہ و منطق نہیں پڑھا تھا نہ بال کی کھال نکالنے کے عادی تھے بلکہ حقیقت پسند اور عملی لوگ تھے ان کو اللہ نے سلامت فہم اور عقل عام کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا انہوں نے موقع ومحل کا جائزہ لیا اور جس مقام پر یہ خطیب کھڑا تھا اس کی طبعی ساخت کو دیکھا۔

انہوں نے دیکھا کہ ایک شخص، جس کی سچائی، امانت، اخلاص اور خیر خواہی کا بارہا

تجربہ کر چکے تھے ایک پہاڑ پر کھڑا ہے وہ سامنے بھی دیکھ رہا ہے جس میں اس کے مخاطبین بھی اس کے ساتھ ہیں اور ساتھ ہی وہ پہاڑ کے عقب کی جانب دوسری طرف بھی دیکھ رہا ہے جہاں سامنے پہاڑ کے دامن کھڑے ہونے والوں کی نظر نہیں پہنچتی، لوگ بغیر شک اورادنی تامل کے سمجھ گئے کہ جو شخص اس پوزیشن میں ہے اس کو حق حاصل ہے کہ پہاڑ کے دوسری طرف چھپے ہوئے دشمن یا خطرے کی خبر دے اور جن لوگوں کے سامنے پہاڑ حائل ہے ان کو یہ حق نہیں کہ اسے جھٹلا دیں اور اس کی خبر صرف اس بنیاد پر رد کر دیں کہ اس مشاہدہ میں وہ لوگ خطیب کے ساتھ شامل نہیں ہیں، کیونکہ بیچ میں حائل ہونے والے پہاڑ نے ان کی حالت اور خطیب کی حالت میں فرق کر دیا ہے اور پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے خطیب کو دوسری طرف دیکھنے اور گواہی دینے کا موقع دیا ہے جو ان لوگوں کو حاصل نہیں، عرب منصف تھے بہادر اور سچے تھے انہوں نے کہہ دیا ''ہاں ہم ایسی اطلاع کی تردید کر سکتے ہمیں اس کو باور کرنا ہوگا۔

دعوت وتربیت کا حکیمانہ انداز

جب یہ فطری، عقلی اور ضروری ابتدائی مرحلہ طے ہو گیا اور سننے والوں کے اعتماد ویقین کا علم ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے عزم ویقین کے ساتھ قدم آگے بڑھایا اور دوسرے اور آخری مرحلہ میں داخل ہوئے اور ارشاد فرمایا ''فَاِنِّی نَذِیْرٌ لَکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ'' تو یہ سمجھو کہ میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈرانے اور آگاہ کرنے آیا ہوں جو بالکل تمہارے ہاتھوں کے سامنے ہے۔

یہ دراصل منصب نبوت کی صحیح تعریف اور نشان دہی تھی اور غیبی حقائق اور وہبی علوم میں نبوت کو جو خصوصیت وانفرادیت حاصل ہے اس کی بڑی حکمت وبلاغت کے ساتھ ترجمانی جس کی نظیر ہم کو مذاہب اور نبوت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مختصر وآسان راستہ اور اس سے زیادہ قابل فہم اور واضح پیرایہ بیان کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ سنتے ہی مجمع پر ایک خاموشی چھا گئی لیکن ابولہب نے کہا جس کی وجہ سے وہ معتوب

ہوا" تباً لک سائر الیوم الھذا جمعتنا" سارے دن تمہارے لیے خرابی ہو کیا صرف یہی کہنے کے لیے تم نے ہمیں بلایا تھا اور ابولہب کا ذہن منکرانہ تھا فطری طور پر بھی۔

یہ جو فرمایا ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ﴾ یہ ایک مثال ہے کوہ صفا کی تنبیہ کی اور لوگوں کو آگاہی دینے کی کہ اس کی فکر کرو اپنا عقیدہ درست کرو اپنی زندگی درست کرو یہ دشمن تمہیں بالکل برباد کردے گا تم کہیں کے بھی نہیں رہو گے یہ دشمن تو شہر میں ٹھہر تو سکتا نہیں، جتنی دیر وہ ٹھہر سکتا ہے، اس میں جو نقصان پہنچا سکتا ہے وہ پہنچائے گا اور باقی پھر تم وہی ہو اور تمہارا شہر وہی ہے لیکن یہ دشمن جو ہے یہ تمہیں کہیں کسی کام کا نہیں رکھے گا ......آپ نے ان کو اس حقیقی اور مستقل خطرہ سے ڈرایا جو ان کے طریق حیات کا جس کے مطابق وہ زندگی گزار رہے تھے ان عقائد کا جن کا وہ اعتقاد رکھتے تھے ان بتوں کا جن کے وہ شیدائی تھے، جاہلی اور فاسد اخلاق وعادات کا جن کو وہ دانتوں سے پکڑے ہوئے تھے اور مختصر الفاظ میں انتہائی جہالت جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے طبعی تقاضا تھا جس میں نہ ایمان تھا نہ علم نہ انصاف تھا نہ خدا ترسی اور اس زندگی کا فطری انجام ہے معاشرہ میں ہمہ گیر فساد زندگی میں تنگی اور پریشانی، قلبی اضطراب اور داخلی عذاب اور اس زندگی کے بعد ہمیشہ کا عذاب ہے جس کے سامنے سارے عذاب اور ہر قسم کی تکلیفات ہیچ و بے قیمت ہیں۔

اس لیے ہم بتا رہے ہیں کہ ﴿نَذِيرٌ مُبِينٌ﴾ یہ "نذیر" کے ساتھ "مبین" کا محض اس لیے نہیں کہ ایک لفظ کے ساتھ دوسرا لفظ آ گیا ہے "نذیر" کے ساتھ دس لفظ آ سکتے تھے (یعنی ہم جیسے آدمی بھی لا سکتے ہیں، جو متوسط عربی داں ہیں) لیکن "نذیر" کے ساتھ نبوت کا جو انداز ہے اور اس کا جو حامل اور مکلّف ہے اس کے لیے "مبین" سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہے اچھا "مبین" کے معنی صرف بیان ہی نہ سمجھو بلکہ عربی میں ابانت کے معنی خود بیان کئے ہیں، وہ وضاحت سے کچھ زیادہ ہیں۔ یعنی وضاحت بھی ہو اور دل پر اثر بھی کرے اور ذہن اس کو قبول کر لے (اس لیے "البیـــان و التبییـن" یہ جو نام رکھے گئے ہیں اور البیان) بلاغت کے لیے جو لفظ آتا ہے ان میں ایک بیان کا لفظ ہے اور قرآن مجید میں جا بجا "مبین" کا لفظ آیا ہے تو اس میں نبوت کا پورا امتیاز آ جاتا ہے۔

انبیاء کرام (علیهم الصلوة والتسلیم) نبوت کے پہاڑ پر کھڑے ہوتے ہیں اور اس عالم کو بھی دیکھتے ہیں اور عالم غیب کو بھی اور انسانیت اور اس کی تہذیب وتمدن پر مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں شب خون مارنے والوں کی خبر دیتے ہیں، چھپے ہوئے خطرات ونقصانات سے آگاہ کرتے ہیں اور شفقت، محبت، مہربانی اور اخلاص کے ساتھ اپنی قوم کو ڈراتے ہیں اور جب کوئی ان کے اس فطری اور عقلی حق کا انکار کرتا ہے اس بدیہی چیز میں شک کرتا ہے یا ان کی بلند حیثیت اور اعتماد کو چیلنج کرتا ہے تو وہ نصیحت واخلاص اور رنج والم کے ساتھ کہتے ہیں۔

﴿قُلْ اِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ أَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْنَ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ. اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾ (سبا:۴۶)

کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم خدا کے لیے دو دو اکیلے اکیلے کھڑے ہو جاؤ پھر غور کرو تمہارے رفیق کو سودا نہیں وہ تم کو عذاب سخت کے آنے سے پہلے صرف ڈرانے والے ہیں۔ (۱)

ہمارا موجودہ معاشرہ

ہمارے موجودہ معاشرہ کی بھی حالت یہی ہے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ یہ بلیغ مثال جس کے لیے آپ نے ایسا حکمت آمیز طریقہ اختیار کیا جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی، قریش مکہ کے تنگ اور محدود معاشرہ ہی کے لیے مخصوص نہیں جواب تاریخ کی زینت بن چکا ہے بلکہ وہ ہر زمانہ کے لیے ایک حکیمانہ اور زندہ جاوید مثال ہے، جو ہمارے اوپر بھی پوری طرح منطبق ہو رہی ہے اور ہمارے معاشرہ کی صحیح اور سچی تصویر کشی کر رہی ہے ہم دباؤں سے ڈرتے ہیں امراض سے گھبراتے ہیں، بلاؤں کی دہشت ہمارے دلوں میں سمائی ہوئی ہے اور اس کے لیے ہر طرح کی احتیاطی تدبیریں عمل میں لاتے ہیں یہاں تک کہ اگر کوئی کہہ دے کہ یہاں کالرا کا ایک کیس ہو گیا ہے تو پورے شہر میں دہشت پھیل جاتی

---

(۱) منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین: ۲۳-۳۰

ہے، ہر شخص پر خوف مسلط ہو جاتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس وبا کا سب سے پہلا شکار وہی ہوگا لیکن اخلاقی امراض، یہ غلط اخلاق وعادات جن کو اللہ اور رسول ناپسند کرتے ہیں یہ مادہ پرستی، شہوت پرستی، ہر جگہ قوت کے سامنے سرنگوں ہو جانا خواہشات کی بے قید اطاعت، جذبات کی رو میں بہہ جانا لہو ولعب میں انہماک، رقص وسرود، ذہنی تسکین اور آرام طلبی وعیش کوشی کے دیگر وسائل میں حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی، قیادتوں اور نعروں کی اندھی تقلید، حقائق سے چشم پوشی، بار بار کے تجربات سے عبرت نہ حاصل کرنا، امیدوں اور آرزوؤں کی بے لگامی، انسانوں کا حد سے بڑھا ہوا احترام، سیاسی اور غیر سیاسی لیڈروں اور رہنماؤں کی تقدیس اور ان کے بارہ میں غلطیوں اور لغزشوں سے معصومیت کا اعتقاد یہ امراض ہمارے انجام اور ہمارے معاشرہ کیلیے ہزاروں دشمنوں اور دشمن کے ہزاروں لشکروں سے کہیں زیادہ خطرناک، کہیں زیادہ مہلک اور کہیں زیادہ تشویش ناک ہیں۔

یہی صحیح مفہوم ہے اس حکیمانہ اور بلیغ مثال کا جسے رسول اللہ ﷺ نے ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لیے بیان فرمایا ہے۔[1]

---

(۱) درس قرآن، سورۂ حج:۴۹ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین:۲۳-۳۰ ☆ عالم عربیہ کا المیہ: ۱۱۰-۱۱۶ ☆ نبی رحمت:۵۳-۵۴، سے مشترک اخذ وتلخیص ہے۔

سرچشمۂ ہدایت ہے فقط ذاتِ الٰہی

﴿اِنَّکَ لاَ تَھْدِیْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَشَاءُ وَھُوَ أَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ﴾ (القصص : ۵۶)

''اے محمدؐ آپ جس کو چاہیں اس کو ہدایت نہیں دے سکتے، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والا کون ہے''۔

دین کی بقا اور تسلسل کے غیبی انتظامات

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''اِنَّکَ لاَ تَھْدِیْ مَنْ أَحْبَبْتَ'' اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے ہیں، یعنی آپ کو مطلق اختیار ہدایت پر نہیں ہے۔ آپ سے ہزاروں لاکھوں کو نفع ہوگا، قیامت تک ہوتا رہے گا، تسلسل باقی رہے گا، آپ ہی ذریعہ ہدایت ہوگی، آپ ہی ذریعہ نجات ہوگی، یہ سب ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ ''اِنَّکَ لاَ تَھْدِیْ مَنْ أَحْبَبْتَ'' آپ جس کو چاہیں اس کو ہدایت دینے کے مختار نہیں ہیں، یعنی یہ کلیہ نہیں ہے کہ آپ جس کو چاہیں اس کو ہدایت ضرور ہو جائے، ''وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَشَاءُ'' لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے، ہدایت دیتا ہے۔

اس کے کہنے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ قدرت مطلقہ اللہ کی معلوم ہو، ہدایت پر قادر ہونا یہ اللہ کا کام ہے، دراصل ہدایت دینا یہ اللہ ہی کا کام ہے، اب وہ کسی کو ذریعہ بنالیتا ہے،

لیکن ہدایت آتی ہے ادھر ہی سے، تو اگر اُدھر سے نہ آئے سرچشمہ سے اپنے نہ آئے منبع ہدایت سے نہ آئے تو پھر جیسے کوئی چیز آئی ہی نہیں، (مثلاً اگر کوئی خط بھیجے نہیں، اگر خط آئے نہیں، کوئی منی آرڈر بھیجے نہیں اور پیسہ آئے نہیں، کوئی پیغام دے ہی نہیں ٹیلیفون پر، تو وہ آئے ہی نہیں) اس طریقے سے منبع ہدایت تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے، ہدایت تو وہاں سے آئے گی، لیکن ہدایت کی نفی نہیں ہے، مگر یہ کہ ہدایت پر پورا اختیار اور یہ کہ ہدایت اختیاری ہو بالکل، آپ جس کی طرف مخاطب ہوں، جس کی طرف توجہ فرمائیں، فوراً اس کو ہدایت ہو جائے۔ یہ ضروری نہیں۔

اس میں کئی فوائد ہیں، ایک تو یہ کہ حضور ﷺ کو دل شکستگی سے بچانا ہے کہ اگر آپ کی انتھک کوشش کے باوجود ہدایت نہیں ہوئی تو کوئی بات نہیں کیونکہ ہدایت کا سرچشمہ دوسرا ہے آپ کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں تو آپ کی مایوسی اور دل شکستگی اس سے ختم ہو جائے گی۔

اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ کے بعد جو اصلاح وتجدید کا سلسلہ ہے قیامت تک اس کو باقی رہنا ہے اور یہ منشائے خداوندی ہے۔

پھر اس کے بعد اس کا فائدہ ایک اور بھی ہے، وہ یہ کہ آپ کے بعد جو اصلاح وتجدید کا سلسلہ ہے حدیث میں آتا ہے کہ ہر زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے کہ "يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ. وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ. وَتَاوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ" [(۱)] کہ جو اس دین کو اس کی اپنی شکل پر باقی رکھیں گے اور وہ غلو پسندوں کی تحریف سے اور غلط نسبت کرنے والوں کی اپنی نسبت کرنے سے اور جاہلوں کی تاویل سے اس کو بچائیں گے۔ [(۲)]

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ امت تاریخ عالم میں جیسی "مردم خیز" ثابت

(۱) مشکوٰۃ۔ کتاب العلم فصل ثانی۔ بروایت بیہقی)۔

(۲) (اس پر اللہ کبھی موقع دے تو ہماری کتاب "تاریخ دعوت وعزیمت" کی پہلی جلد کا مقدمہ پڑھ لیں اس میں تقابلی مطالعہ ہے، اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ برابر اس کا سلسلہ جاری رہا) اس لیے کہ وہ درخت جس نے پھلنا چھوڑ دیا، یا بہت دیر میں پھلتا ہے، برسوں گذر جاتے ہیں، تو اس کی طرف سے اعتبار جاتا رہتا ہے۔

ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے، بلکہ انتظامِ خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت وقوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور زہر کو جس ''تریاق'' کی حاجت تھی، وہ امت کو عطا ہوا...... ''جہاد اور تجدید کی تاریخ میں کوئی خلا اور وقفہ نظر نہیں آتا، اصلاح کی مشعلیں اور چراغ مسلسل طریقہ پر ایک دوسرے سے روشن ہوتے رہے اور بڑی تیز وتند ہواؤں میں بھی عالم اسلامی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اندھیرا نہیں پھیلنے پایا''۔

''اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے، جو ان مذاہب میں نئی روح اور اس کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کر دیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں، جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریفات وبدعات کے نرغہ سے نکالے'' خود ان مذاہب کے مؤرخین اعتراف کرتے ہیں، کہ صدیاں گذر گئیں ہیں اور کوئی تجدید کرنے والا نہیں پیدا ہوا۔

آخری بات

تو ہم یہ کہہ رہے تھے (اس کی طرف بہت کم لوگوں کا ذہن جائے گا، ہم ایک نفسیاتی بات بتا رہے ہیں) کہ جب تجدید واصلاح کا سلسلہ قیامت تک جاری رکھنا ہے اللہ کو، ہدایت اور صحیح راستے کی طرف بلانے والے ہمیشہ پیدا ہوں گے۔ تو ان کو اس سے سابقہ پڑے گا، کہ ساری محنت کریں گے اور اثر نہیں ہوگا، ساری خطابت کریں گے اور اثر نہیں کرے گا اور سارا اخلاص اور روحانیت صرف کریں گے، چاہے سیدنا عبدالقادر جیلانی ہوں، چاہے ابن جوزی ہوں، بحیثیت مقرر، ان کے یہاں بھی، یہ کلیہ کسی کے یہاں بھی نہیں ہے، کہ جس کو مخاطب کریں، جس کو صحیح راستہ بتائیں، اس کو ہدایت ضرور ہو، تو وہاں دل شکستگی کا اندیشہ تھا، لیکن جب تک یہ آیت موجود ہے، پڑھی جا رہی ہے، کسی کو دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ اپنے سب سے محبوب پیغمبر سے کہہ رہا ہے کہ ''اِنَّکَ لاَ تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ'' تو کوئی تبلیغی جماعت ہو، کوئی

اصلاحی تحریک ہو، کوئی اپنے وقت کا بڑے سے بڑا واعظ و خطیب ہو، کوئی بڑے سے بڑا مصلح ہو، اس کے لیے اس میں تسکین کا سامان ہے، چاہے یعنی دس فیصدی مانیں، چاہے پانچ فیصدی مانیں، جب بھی اس کا دل نہیں ٹوٹنا چاہیے، جب اللہ نے خاتم الانبیاء، سید المرسلین محبوب رب العالمین، اپنے سب سے محبوب پیغمبر سے یہ کہہ دیا کہ ''اِنَّکَ لاَ تَھْدِیْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَشَاءُ'' تو بالکل کسی کو بھی اس میں ذرا بھی ناامیدی، دل شکستگی اور یہ کہ بھائی یہ کام چھوڑ دینا چاہیے، جب ہدایت نہیں ہو رہی ہے، (اس میں چار، چھ تجربے بھی ایسے ہوئے) تو اس کا اثر پڑ سکتا تھا، اب کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کوئی بڑے سے بڑا اللہ کا مقرب بندہ ہو، جیسے سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا، ان کا حال یہ تھا کہ ان کا وعظ جب ہوتا تھا تو جنازے نکلتے تھے، یعنی اسی وعظ کے درمیان لوگ دم توڑ دیتے تھے، اپنے گناہوں کو یاد کرکے، اپنے تقصیر وغیرہ کو اس کا اثر پڑتا تھا، (اور آپ پڑھیے ان کے مواعظ جمع کیے ہیں لوگوں نے) معلوم ہوتا ہے کہ بجلی چمک رہی ہے اور بادل گرج رہے ہیں، اب بادل گرا، اب بجلی گری، تو اتنی تاثیر، لیکن پھر بھی ایسی مثالیں، یہ ڈھونڈنے کی چیز ہے نہ جمع کرنے کی، لیکن یقیناً یہ پیش آئی ہوں گی، کہ سینکڑوں آدمی، اسلیے کہ بغداد اتنا بڑا شہر تھا، اس میں سب کے سب کو تو ہدایت نہیں ہوگئی، تو ایسے موقع پر اس واعظ کا، مصلح کا، خطیب کا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے خاص مقبول بندے کا بڑا امتحان ہوتا ہے، کہ اتنی ہم نے کوشش کی، اتنی ہم نے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کرکے بالکل بتادیا اور پھر ان کو آنکھوں کے سامنے لے آئے اور پھر بھی لوگ نہیں مانتے، وہاں تو یہ آیت سامنے آجاتی ہے، جیسے گویا غیبی منادی ان کے کان میں کہتا ہے ﴿اِنَّکَ لاَ تَھْدِیْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَشَاءُ﴾ دیکھو یہ کس سے کہا جارہا ہے، یہ سید المرسلین محبوب رب العالمین سے کہا جارہا ہے، تمہیں اس میں رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے، اس کے علاوہ اور کوئی تسکین کی کوئی سی شکل اختیار کی جاتی تو وہ کافی نہیں تھی۔

﴿وَھُوَ أَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ﴾ اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو، یعنی وہ جانتا ہے کہ کس کو ہدایت ہو، کون ہدایت کا مستحق ہے، اس کا بھی ضابطہ اللہ کے یہاں ہے،

اس ضابطہ کا علم کسی کو نہیں ہے، کہ اس کو کیوں ہدایت ہوئی، اس کو کیوں نہیں ہدایت ہوئی، کوئی اس پر قیاس نہیں کر سکتا، یہ بھی اللہ نے فرما دیا کہ وہی بہتر جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو، کس بنا پر اللہ اس کو ہدایت دیتا ہے، اس کو ہدایت نہیں دیتا، یہ اس کو کوئی نہیں بتا سکتا، کبھی تکبر کبھی کوئی پچھلا کام، کوئی ظلم، کبھی کسی کی بددعاء، کبھی یہ ہدایت پا کر ہدایت کا کام نہیں کرے گا بلکہ اضلال کا کام کرے گا، یعنی ہدایت پا کر جب یہ لوگوں کے لیے ایک امتحان بن جائے گا، جب اس کو ہدایت ہوگئی، لوگوں نے ان کو اپنے گروہ میں سمجھ لیا، پھر یہ ضلالت شروع کر دے گا، اس لیے اس کو ہدایت نہ دینا ہی مناسب ہے۔

غرض یہ کہ یہ اسرار الٰہی میں سے ہے![1]

(۱) درس قرآن، سورۂ قصص: ۵۶ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ، مشترک اخذ و تلخیص: ☆ نبی خاتم ودین کامل: ۱۰-۱۵ ☆ تاریخ دعوت وعزیمت (حصہ اول): ۲۰-۲۲

اکلِ طیب اور عملِ صالح کا لحاظ رکھنے کی تاکید

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَ اعْمَلُوا صَالِحاً إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ﴾ (المؤمنون: ۵۱)

''اے اللہ کے پیغمبرو! پاک صاف چیزیں، حلال طیب چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو، میں جانتا ہوں تم کیا کرتے ہو''۔

دو ستون، معاش اور معاد

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً'' دو چیزوں کا یہاں ذکر کیا، ''پاک صاف چیزیں کھاؤ'' تمہارے رزق پر کسی کی کوئی پابندی عائد نہیں ہوسکتی، ہم رزاق حقیقی ہیں، تو جہاںتک تعلق ہے معاش کا، تو پاک وصاف چیزیں کھاؤ اور جہاں تک تعلق ہے معاد کا اور یہی دو ستون ہیں، معاش، معاد اور دونوں کا حسن، دونوں کی مقبولیت مطلوب ہے، حسن معاش، حسن معاد، معاش کی سہولت اور معاد کی کامیابی، یہ دو چیزیں ہیں، انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں بھی یہی ہیں اور انسانوں کے تعلقات میں بھی۔

فرمایا کہ کیا تمہارا بگاڑیں گے اے پیغمبرو! پاک چیزیں کھاؤ، کوئی تمہیں روک نہیں سکتا، ان کی کوئی راشنی نہیں ہے، ''وَاعْمَلُوا صَالِحاً'' ''اور نیک کام کرو'' بس یہ تمہارا کچھ

بگاڑ نہیں سکتے، اگر یہ دونوں کام تم کر سکتے ہو تو ایک سے زندگی قائم ہے اور ایک سے اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ جو تمہارا معاملہ ہے، عاقبت جسے کہتے ہیں، ایک کے ساتھ تو جو موجودہ حالت ہے، یعنی حاضر، وہ اس سے متاثر نہیں ہے، ایک مستقبل، حاضر و مستقبل، دو ہی چیزیں ہیں اصل، ماضی تو اتنی عام چیز نہیں ہے گزر چکا، لیکن اصل جو فیصلہ کن چیزیں ہیں جس کو لوگ مقیاس بناتے ہیں اور اس کے مطابق وہ اپنے طرزِ عمل کو بدلتے ہیں، کبھی بگاڑ لیتے ہیں، کبھی بنا لیتے ہیں، وہ دو چیزیں ہیں، حاضر اور مستقبل، مثلاً کسی کا بچپن کس طرح گزرا، کسی کی جوانی، کسی کی بے روزگاری، پھر اب دیکھنا یہ ہے کہ اب کس طرح ہوگا؟ اور اس کے مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ مثلاً آدمی آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو فرمایا کہ معاش اور معاد، دونوں چیزیں ہمارے قبضے میں ہیں، اس کا ہم نے تمہارے لیے انتظام کر رکھا ہے اور یہ صرف رسول وانبیاء علیہم السلام ہی نہیں، بلکہ اس کے نائبین۔ داعی۔ دعاۃ جو ہیں، ان کے دین کے حامل، علمبرداران کے دین کے مبلغ، ان کے دین کے شارح ان کے دین کے ترجمان، ان سب کا بھی یہی "كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَ اعْمَلُوا صَالِحاً"

یہ گویا اللہ تعالیٰ نے پورا زندگی کا نقشہ بتا دیا ہے، کھاؤ تو ذرا اس میں احتیاط رکھو، حرام کمائی کی چیز نہ ہو، ناجائز چیز نہ ہو، کوئی اکل میتہ یا کوئی ایسی چیز نہ ہو، شراب معاذ اللہ شراب، یا اس طرح کی کوئی ایسی چیز نہ ہو، تو یہ معاش تو کھانے میں "طیبات" کا لحاظ رکھو، اور عمل میں "صالحہ" کا لحاظ رکھو، بس ہمارا تمہارا معاملہ صاف ہے، پھر یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، یہ انبیاء علیہم السلام کو بھی خطاب ہے، قیامت تک ان کے داعیوں کو، جانشینوں کو، ان کے ترجمان جو ان کو اللہ تعالیٰ ترجمانی کا شرف عطا فرماتا ہے اور نیابتِ نبوت کا منصب عطا فرماتا ہے، اپنے زمانے کے مجدد، اپنے اپنے زمانے کے مصلح، اپنے اپنے زمانے کی اصلاحی تحریکوں کے علمبردار اور امت کے تعلق مع اللہ، تعلق مع الرسول، تعلق مع الدین کے لیے کوشش کرنے والے سب کے لیے یہی ہے کہ "يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً" یعنی اس میں زندگی کا پورا نقشہ آ گیا ہے۔

"إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ" "میں تمہارے اعمال سے واقف ہوں" اور اس کے

بعد آدمی کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ اتنی بات تو کافی نہیں کہ ہم "طَیِّبَــات" کھا رہے ہیں اور نیک عمل کر رہے ہیں، معلوم نہیں اس کے بعد ہمارا کیا حشر ہوگا، ہمارے اندر کوئی کمی رہ جاتی ہوگی، کوئی چیز ناپسندیدہ ہوگی، اس کی طرف سے اطمنان دلا دیا گیا کہ "اِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيْم" جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے، معاش و معاد، طیبات کا استعمال زندگی کے برقرار رکھنے کے لیے، بقاء حیات کے لیے اور عمل صالح پر عمل تعلق مع اللہ کو قائم رکھنے کے لیے امتوں کا رشتہ اپنے معبود کے ساتھ قائم رکھنے کے لیے اور باقی جب باطن کا خیال کبھی گذرتا ہے، تو اس کی طرف سے اطمنان رکھو، "اِنِّی بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ" تو جو کچھ بھی کر رہے ہو یا کرو گے اس سے میں واقف ہوں، تو اب کیا رہ گیا۔ (۱)

(۱) درسِ قرآن، سورۂ مومنون: ۱۵ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ منصب نبوت: ۱۱۸-۱۱۹، سے ماخوذ ہے۔

واقعۂ افک و بہتان اور اس پر وعید

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُ وا بِالْاِفْکِ عُصْبَةٌ مِنْکُمْ. لَاتَحْسَبُوْهُ شَرًّالَکُمْ. بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَکُمْ. لِکُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ مَااکْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ. وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَه‘ مِنْهُمْ لَه‘ عَذَابٌ عَظِیْمٌ. لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْ مِنُوْنَ وَالْمُؤْ مِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْراً. وَقَالُوْا هٰذَا اِفْکٌ مُبِیْنٌ﴾

(سورہ نور: ۱۱–۱۲)

’’جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے تم ہی میں سے ایک جماعت ہے اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھنا بلکہ وہ تمہارے لیے اچھا ہے ان میں سے جس شخص نے گناہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لیے اتنا وبال ہے اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کو بڑا عذاب ہوگا، جب تم نے وہ بات سنی تو مومن مردوں اور عورتوں نے کیوں اپنے دلوں میں نیک گمان نہ کیا اور کیوں نہ کہا کہ یہ صریح بہتان ہے‘‘۔

آخری اور عالمی ہدایت نامہ

ہمارا آپ کا سب کا ایمان ہے کہ قرآن مجید آخری کتاب ہے، آخری صحیفہ ہے، جو پیغمبروں پر نازل ہوا، آخری کتاب بھی ہے اور عالمی کتاب بھی ہے یعنی اب قیامت تک

کوئی کتاب نازل نہیں ہوگی اور ہر زمانہ کے لیے ہر ماحول و معاشرے کے لیے، پر تہذیبی دور کے لیے، بدلے ہوئے حالات کے لیے یہی کتاب ہدایت نامہ ہے، پوری دنیا کے لیے ہدایت نامہ ہے اعتقادی بھی ایمانی بھی اور عملی بھی، اخلاقی بھی، معاشرتی بھی، اس میں ایسی چیزیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اللہ کے آخری نبی تھے، آپ کو محفوظ رکھ سکتا تھا اور اللہ کے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مقام تھا اس کے لحاظ سے یہ بات بالکل سمجھ میں آجاتی ہے کہ آپ کو ان حالات سے واسطہ ہی نہ پڑتا، مثلاً جنگیں، غزوات ہیں، لڑائی جو ہے یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے اور اس میں بڑے سے بڑا مذہبی روحانی کوئی بڑی بزرگ شخصیت ہو تو اولیاء اللہ ہوں یا چوٹی کے علماء ہوں یا حکام ہوں، اہل اقتدار ہوں ان سب کو ایک ہی طرح کے حالات پیش آتے ہیں، تو ایسا ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالی آپ کو اس سے بچا لیتا آپ کی پوری مبارک زندگی نبوت کے بعد ۲۳ رسال کی وہ بغیر کسی لڑائی کے گذر جاتے تھے، کئی کئی چاند ہم ہم دیکھتے تھے ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا ان سب چیزوں سے اللہ تعالی آپ کو بچا سکتا تھا، ویسے ہی ایک چیز خانگی حادثہ ایک ایسی صورتحال کا معاملہ کہ جو آپ کے مقام سے بہت فروتر تھی اور کم درجے کی تھی، اللہ تبارک وتعالی کے ساتھ آپ کو جو تعلق تھا آپ کی جو مشغولیت تھی اور آپ کا جو روحانی مقام تھا اور آپ کا عبادات میں، تہجد میں، استغفار اور دعا میں، جو انہماک تھا، یکسوئی تھی اس میں فرق ڈال سکتی تھی وہ چیزیں۔

لیکن چونکہ اللہ تبارک وتعالی کو اس کتاب سے کام لینا تھا قیامت تک کے لیے، اس لیے بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے اور ان کا قرآن مجید میں تذکرہ بھی ہے کہ جن سے تسلی ہو سکتی ہے ان لوگوں کو جن کو یہ حالات پیش آئے ہیں، اولیاء کرام میں بھی ہو سکتے ہیں اور بڑے بڑے محدثین وفقہاء میں بھی ہو سکتے ہیں اور بڑے بڑے مجاہدین اور شہداء میں بھی ہو سکتے ہیں، صاحب کرامات بزرگوں میں بھی ہو سکتے ہیں، لیکن جب وہ یہ دیکھیں گے کہ محبوب رب العالمین جو اللہ کا سب سے محبوب بندہ تھا اس کو بھی اس کی حیات طیبہ میں بھی اس کی زندگی میں ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کا آپ کو کسی صحابی کے متعلق سننا بھی گوارہ نہ ہوتا تو اس کو بڑی تسکین ہوگی کہ ہم کیا چیز ہیں تو وہ آپ کو رفع درجات کے لیے ترقی درجات

کے لیے اس دور سے گذرنا تھا، برداشت کرنا اور سن لینا اور پھر اس کے اوپر مغلوب الغضب نہ ہونا معاذ اللہ یا یہ کہ کوئی ایسی کاروائی نہ کرنا کہ جس سے ذاتی انتقام کا جذبہ ظاہر ہوتا ہو پھر ہم کیا چیز ہیں انہیں میں سے ایک واقعہ یہ ہے۔

واقعۂ افک

واقعہ سن لیجئے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب آپؐ سفر کا ارادہ فرماتے تو ازواج مطہرات کے لیے قرعہ ڈالتے جس کا نام نکلتا ان کو اپنے ہمراہ لے لیتے غزوہ بنی المصطلق میں حضرت عائشہؓ کے نام قرعہ نکلا، غزوات میں ازواج مطہرات بھی جاتی تھیں اور ضروری نہیں تھا لیکن اکثر غزوات میں ازواج مطہرات بھی ساتھ ہوتی تھیں تو عربوں کا معاشرہ ایسا تھا کہ عورتوں میں بھی ہمت، بہادری تھی اور بہت چیزوں میں وہ مدد کر سکتی تھی، مثلاً زخمیوں کی مرہم پٹی میں اور آج بھی نرسوں سے کام لیا جاتا ہے، ہاسٹس وغیرہ جو ہوتیں ہیں، نرسوں سے کام لیا جاتا ہے بلکہ ان سے جو ہمدردی جو طبقہ اناث کے ساتھ مخصوص ہے ان کو مائیں بننا ہے اور ان کے گھر کے بچوں کی پرورش کرنا ہے تو ان می ں جو نرمی ہوتی ہے ان کے ہاتھوں میں جو ایک احتیاط ہوتی ہے اور تکلیف سے جو ان کو خود تکلیف ہوتی ہے اس وجہ سے وہ زیادہ کام آتی ہیں، چنانچہ جنگ احد میں جو آپ کو زخم آئے تھے اس میں حضرت فاطمہ نے مرہم پٹی کی تھی اور وہ زخم کو ٹھیک کیا تھا تو ازواج مطہرات اس لیے بھی جاتی تھیں اور ان کی شجاعت بھی تھی بہادری بھی تھی'' چنانچہ آپ ان کو اپنے ہمراہ لے گئے، واپسی پر (اب یہ سب چیزیں جو ہیں اتفاقی نہیں، اللہ تعالی کے یہاں کوئی چیز اتفاقی نہیں ہوتی تو ہم آپ کہہ دیتے ہیں اتفاقی ورنہ ہمارے یہاں بھی حقیقتاً اتفاقی کوئی چیز نہیں ہے سب مقدرات ہوتے ہیں، پہلے سے طے شدہ چیزیں ہوتی ہیں، لیکن اس کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ نیا واقعہ پیش آیا) جب مدینہ قریب ہوا تو آپؐ نے قیام فرمایا اور رات کو کچھ حصہ وہیں گذارا اس کے بعد آپ نے کوچ کا اعلان کیا حضرت عائشہ صدیقہؓ قضاء حاجت کے لیے گئیں تو ایک ہار جو ان کے گلے میں پڑا ہوا تھا کسی جگہ گر گیا اور ان کو پتہ بھی نہ چل

سکا جب وہ اپنے محمل میں واپس آئیں تو ان کو معلوم ہوا کہ ان کا ہار غائب ہے وہ اس کی تلاش کے لیے پھر وہاں گئیں اسی درمیان میں کوچ کا اعلان ہو گیا، جن حضرات کے ذمہ ان کے سواری تھی وہ معمول کے مطابق آئے اور یہ سمجھ کر کہ حضرت عائشہؓ اندر ہوں گی محمل تھام لیا اور روانہ ہو گئے وہ بہت کمسن اور ہلکی پھلکی تھیں اس لیے انہیں اندازہ نہ ہو سکا اور اس کا شبہ بھی نہیں ہوا کہ وہ اس کے اندر تشریف نہیں رکھتی ہیں جیسا کہ سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ وہ سائے بان جو تھا اونٹ چلانے والا وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس میں سواری نہیں ہے تو اتنا کم فرق ہوتا تھا یعنی سواری کے ساتھ اور بغیر سواری کے وہ سمجھ نہیں سکا (ذرا جلدی بھی ہوتی ہے اور سب موٹر چلانے والوں کو ہر وقت دیکھنا کہ کون پیچھے ہے کتنا ے آرام کی جگہ بیٹھا ہے یہ بہت خاص لوگ کرتے ہیں) تو اس نے چلا دیا اونٹ کو اب کوئی صورت نہیں تھی اتنا لمبا فاصلہ پیدل طے نہیں کیا جا سکتا تھا اور وہ زیادہ نامناسب اور خطرناک تھا عورت ذات وہ اکیلی سفر کرے انہوں نے اپنی چادر اوڑھی اور وہیں لیٹ گئیں۔

اسی درمیان صفوان بن معطل السلمی جو اپنی ایک ضرورت سے قافلہ سے بچھڑ گئے تھے ادھر آ نکلے ان کو دیکھا تو اِنَّا لِلّٰہ پڑھا اور کہنے لگے کہ یہ تو رسول اللہ ﷺ کی حرم محترم ہیں اس کے بعد انہوں نے اپنا اونٹ ان کے قریب کر دیا اور خود پیچھے ہٹ گئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس میں سوار ہو گئیں تو انہوں نے اونٹ کی نکیل تھامی اور تیز رفتاری کے ساتھ قافلہ کے تعاقب میں روانہ ہوئے اور بہت احتیاط کے ساتھ احترام کے ساتھ، احتیاط نہیں بلکہ احترام کے ساتھ اور مدینہ طیبہ پہنچا دیا کا شانِ نبوت میں، لیکن وہاں ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی آپ واقف ہوں گے بہت مشہور ہے اس جماعت کا لقب ہے منافق، عبداللہ بن ابی ان کا سردار تھا تو اس کو موقع مل گیا وہ تاک میں رہتا تھا جس سے کہ احترام نبوت میں اثر پڑے اور اس پر اثر پڑے سے پورے دین پر اثر پڑتا ہے تو اس نے نامناسب کہنی شروع کی اور ایک دو صحابی (بعض طبیعتیں ہوتی ہیں یہ نہیں کہ ایمانی کمزوری ہوتی ہے بلکہ مزاج ہوتے ہیں بعض لوگوں کے مزاج ایسے ہوتے ہیں کہ سنی ہوئی بات کہنے لگتے ہیں ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نکلنے لگتی ہے تو مجلس میں بیٹھے انہوں نے بھی اس کا ذکر کر دیا تو وہ کوئی بعض

مرتبہ بدنیتی یا نفس کی شرارت نہیں ہوتی بلکہ مزاج ہوتا ہے) تو وہ صحابی اس میں اور شریک ہو گئے کہا کہ کیا بات ہوگئی کہ وہ کیوں پیچھے رہ گئیں تھیں اور پھر وہاں سے اتنا لمبا راستہ وہ لے کر چلے یہ کیسے ہوا؟

گڑھا ہوا افسانہ

غرض کہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس کی طرف لوگوں کو التفات بھی ہوتا لیکن عبداللہ بن ابی نے اس کو بالکل اپنا لیا یعنی استحصال کیا ہے اس کا، سیاسی استحصال یعنی ایسے موقعہ کہاں آتے ہیں اگر حضور پاک ﷺ کے بارے میں کاشانۂ نبوت کے بارے میں ایسا خیال مسلمانوں کے دل میں پیدا ہو گیا تو ہر بات کہی جا سکتی اور جب احترام کم ہو گیا تو پھر قانون شریعت پر عمل کرنا، پابندی کرنا اور پھر دیندار رہنا سب مشکوک ہو جاتا ہے۔

اور مدینہ واپس آ کر اس کا خوب چرچا کیا، منافقین نے جو اس کے منتظر تھے اس موقع کو غنیمت جانا اس کی اچھی طرح تشہیر کی ان کے نزدیک یہ ایک ایسا حربہ تھا جس سے مسلمان آسانی کے ساتھ فتنہ میں پڑ سکتے تھے اور مقام رسالت اور اہل بیت کے ساتھ ان کی تعظیم اور محبت کا رشتہ کمزور کیا جا سکتا تھا اس سے مسلمانوں کا باہمی اعتماد اور ایک دوسرے پر بھروسہ بھی مجروح ہوتا تھا اس سازش کے کچھ ایسے سادہ دل مسلمان بھی شکار ہو گئے جن کو زیادہ باتیں کرنے کا شوق تھا اور جو بغیر تحقیق کے بات نقل کرنے کے عادی تھے اسی بات کی طرف قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے "اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّناً وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ" (سورہ النور۔ ۱۵) (جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے ذکر کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہتے تھے جس کا تم کو کچھ علم نہ تھا اور تم اس کو ایک ہلکی بات سمجھتے تھے اور خدا کے نزدیک وہ بڑی بھاری بات تھی۔

سات آسمانوں کے اوپر سے برأت کا اعلان

جب حضرت عائشہؓ کو مدینہ میں اچانک اس کی خبر ہوئی تو وہ سناٹے میں آگئیں

اور رنج و غم سے ان کا یہ حال ہو گیا کہ آنسو تھمتے نہ تھے، راتوں کی نیند اڑ گئی، رسول اللہ ﷺ کے لیے یہ معاملہ بہت سخت اور سنگین تھا آپ کو جب علم ہوا کہ بات کہاں سے چلی تھی تو اس وقت آپ تشریف لائے اور عبداللہ بن ابی کے سلسلہ میں کچھ کہنے کی اجازت لی، آپ ممبر پر تشریف رکھتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا اے مسلمانو! مجھے کون اس شخص کے معاملے میں کچھ کہنے کی اجازت دیتا ہے جس کی میرے گھر والوں کے بارے میں ایذا رسانی کا مجھے پتہ چلا ہے خدا کی قسم مجھے اپنے اہل خانہ کے بارے میں جو کچھ علم ہے وہ اطمینان بخش ہے۔ لوگوں نے اس معاملہ میں جب صاحب کا ذکر کیا ہے ان کے بارے میں بھی مجھے اچھی ہی بات معلوم ہے وہ جب کبھی میرے گھر آتے تو میرے ہمراہ آتے تھے ''اوس'' کے کچھ لوگ یہ سن کر غیظ و غضب سے بھر گئے اور کہنے لگے کہ جس نے اتنی بڑی بات زبان سے نکالی ہے ہم اس کی گردن اڑا دینے کے لیے تیار ہیں وہ اوس کا آدمی ہو یا خزرج کا، عبداللہ بن ابی کا خزرج سے تعلق تھا اس کی یہ گفتگو سن کر قبائلی حمیت پیدا ہونے لگی اور دونوں قبیلے جوش میں آ گئے قریب تھا کہ شیطان کا جادو ان پر چل جائے اور وہ بام دست وگریباں ہو جائیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے فہم و تدبر اور حلم و بردباری کی برکت سے یہ بات وہیں ختم ہو گئی ادھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنی بے گناہی کا پورا یقین تھا اس لیے ان کے رویہ میں اعتماد خودداری اور عزت نفس کی پوری جھلک نظر آ رہی تھی ان کا حال اس بے گناہ اور معصوم صفت ہستی کا تھا جو ہر شک و شبہ اور الزام سے بالاتر ہوتی ہے ان کو پورا یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بالآخر صاف بری کر دے گا اور دامانِ رسالت پر بدگمانی اور تہمت کا یہ داغ ہرگز باقی نہ رہے گا لیکن ان کو یہ خیال نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے خاص طور پر وحی نازل فرمائے گا اور یہ آیتیں قرآن مجید کا جز بن کر قیامت تک پڑھی جاتی رہیں گی۔

ان کو زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا کہ ان کے بارے میں قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیتیں نازل ہوئیں اور سات آسمانوں کے اوپر سے ان کی برأت کا اعلان ہو گیا۔

اس طرح اس زبردست فتنہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا اور یہ بات اس طرح ختم ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی، مسلمان معمول کے مطابق اسی جوش اور ولولہ کار

کے ساتھ اپنے ان عظیم کاموں کی تکمیل میں مشغول ہو گئے جن پر نہ صرف ان کی بلکہ پوری انسانیت کی فلاح وکامرانی کا انحصار تھا''۔ (۱)

تسکین ونصیحت کا دائمی سر چشمہ

اللہ تبارک وتعالی نے اس کو اتنی اہمیت دی اور یہ واقعہ بھی جیسے ہم نے کہا کہ اتفاقی نہیں بلکہ اللہ تعالی کو قیامت تک کے لیے ایک نمونہ پیش کرنا تھا اگر اللہ کے کسی بندے کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آئے تو اس کو تسکین ہو اس سے کہ ہم کیا چیز ہیں اللہ کے رسول کے ساتھ یہ بات پیش آچکی ہے کہ کوئی بات بھی کہی جاسکتی ہے یعنی وہ بات کتنی ناممکن ہو کہی جاسکتی ہے سنی جاسکتی ہے جب کہی جائے گی سنی جائے گی دوہرائی جائے گی تو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے یہ دین کے داعیوں کو دین کے جو نمونے ہیں اور مقتدا ہیں ان کو یہ ضروری نہیں کہ بعینہ اس طرح کا لیکن اس سے ملتے جلتے واقعات اتہامات اور بدگمانیاں پیش آسکتی ہیں اللہ نے ان سب کا استیصال کر دیا اور یہ واقعہ ہوسکتا تھا کہ قرآن مجید میں ذکر ہی نہ ہوتا، ہو گیا واقعہ اور بعد میں مسلمان بالکل مطمئن ہو گئے اور اس کا پھر کوئی ذکر کرنے والا ہی نہیں رہا اور وہ لوگ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے لیکن اللہ تعالی نے اس کو قرآن مجید میں ذکر کر کے اس کو عام بنا دیا اور دائمی بنا دیا اور اس کو ایک گویا سر چشمہ بنا دیا، نصیحت حاصل کرنے کا صبر کا تسکین کا۔

تو اللہ تعالی فرماتا ہے کہ بیشک وہ لوگ جو بہتان لائے جو ایک گڑھا ہوا افسانہ اپنے ساتھ لائے ''عُصْبَةٌ مِنكُمْ'' وہ تمہارے اندر ایک ٹولی ہے یہ ''عُصْبَةٌ'' کا جو لفظ ہے بعض لفظ جو ہے وہ مذموم ہوتے ہیں یعنی مثلاً اردو میں جماعت، جماعت کے لفظ میں ایسی خرابی نہیں لیکن ٹولی جب آپ کہیں تو اس سے ذہن جاتا ہے کہ کوئی مجرمین، جرائم پیشہ لوگ اور ذرا گرے ہوئے لوگ ہیں ''عُصْبَةٌ'' بھی انہیں لفظوں میں سے ہے وہ ایک ٹولی وہ تم میں سے ایک ٹولی تھی۔

"لَاتَحْسَبُوْهُ شَرًّالَکُمْ" اس کو تم برانہ سمجھو اپنے لیے "بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ" بلکہ تمہارے لیے خیر ہیں وہی جو ہم نے اس کے فوائد بتائے کہ قیامت تک کے لیے اطمینان کی چیز ہوگئی کہ ہم کیا چیز ہیں ورنہ بت لوگ جان دے دیتے ہیں، بہت لوگ معاذ اللہ خودکشی کر لیتے ہیں ارے یہ بات ہمارے متعلق کہی گئی، مرجانا اچھا ہے لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ اللہ کے محبوب رسول سید المرسلین، خاتم النبیین ان کے متعلق یہ بات کہی گئی اور آپ نے سنی اور برداشت کی اور اس کے بعد اس کی تردید ہوتی اور سب کے دل صاف ہو گئے تو ایسے یہاں بھی ہوگا "لِکُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ مَااکْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ" ان میں سے ہر آدمی کے لیے وہ ہے جو اس نے گناہ کمایا ہے اس پر اس کا وبال پڑے گا "وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ" اور جس نے کہ اس میں سربراہی کا کام کیا جس نے اس کی ذمہ داری قبول کی "تَوَلّٰی کِبْرَہٗ" اور "کبر" کا لفظ بھی مذموم اس میں آتا ہے "معظمة، اهمه، اعظمه" اور "راسه" یہ سب بہت چیزیں کہی جاسکتی تھیں لیکن "کبر" جس نے اس کا بیڑا اٹھایا تم میں سے اس کے لیے "عذاب الیم" ہے۔

چنانچہ جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو نفاق کی حالت میں اور وہ محروم رہا۔

دائمی اور اخلاقی تعلیم

"لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ" اب یہاں پر ایک بہت بڑی اخلاقی تعلیم دی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو بہت عمومی وسیع اور دائمی اور بلکہ عالمی ہے وہ یہ کہ واقعہ کی شکل تو آپ جانتے ہیں کہ ایسی تھی کہ تکلیف دہ تھی اس سے اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑا اخلاقی اصول اور ایک اخلاقی تعلیم دی ہے، تمام مسلمانوں کو اور قرآن مجید پڑھنے والوں کو کہ "لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَیْرًا" کیوں نہیں ہوا ایسا کہ جب تم نے اس کو سنا تھا تو اہل ایمان مرد اور اہل ایمان عورتیں اپنے اوپر قیاس کرتے اور اپنے نفسوں کے ساتھ حسن ظن سے کام لیتے ہم تو نہیں کر سکتے تھے ہمارے ساتھی پیش آتا تو ہم تو ہرگز نہ کرتے بھئی یہ کیسے ہوسکتا ہے، ام المومنین اور اہل

بیت رسول اور صفوان بن معطل بھی بڑے صحابی ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے تو تمہیں اپنے پورے "بِأَنفُسِهِم" اپنی پوری جماعت کے ساتھ حسن ظن سے کام لینا چاہیے تھا ہمیں اس کی تعلیم دی گئی کہ جب کوئی ایسی بات سنیں یہ آپ ریڈیو سے سنیں یا اخبار میں دیکھیں یا چرچا سنیں سب میں یہی ہونا چاہیے۔

یہ مسلمانوں کی ایک کمزوری ہے کہ کسی کے متعلق کوئی بات سن لیں تو بلا تحقیق اس کو نقل کرنا شروع کر دیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ "كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِباً أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَاسَمِعَ" انسان کے جھوٹے ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ جو سنے اس کو کہنا شروع کر دے۔

تو اصل یہ ہے کہ "لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْراً" یہ اسلامی معاشرہ جو دنیا کے لیے نمونہ بنے گا اخلاقی طور پر نمونہ بننا چاہیے اور اس کو داعی ہونا چاہیے، اس کو نجات دہندہ ہونا چاہیے، اس کو معلم اخلاق ہونا چاہیے اس میں یہ صفات ہونی چاہیے کہ یہ جو ایسی گئی گذری جماعتوں میں، یا تنزل اور زوال کی منزلوں سے گذرنے والے ادیان اور ان کے ماننے والوں میں جو کمزوریاں پیدا ہو گئیں اور سیاسی جماعتوں میں ان مزاج اور عملی طریقہ کار سے بچنا چاہیے اس کو آپ ذہن میں رکھئے اس کو آپ اپنے وعظوں میں قرآن مجید کے درسوں میں جمعہ کی تقریروں میں اور جہاں موقع ملے کہئے کہ اعتبار کرنا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے "لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنْفُسِهِمْ خَيْراً"۔

دیکھئے کیا مرتبہ دیا ہے قرآن مجید نے مسلمانوں کو کہ تم معیار ہو، تمہیں اپنوں پر قیاس کرنا چاہیے ہم نہیں کر سکتے، صفوان نے کیسے کیا ہوگا؟ ہم اس کو سوچ نہیں سکتے صفوان کیسے ان کے ذہن میں یہ بات آئی ہوگی؟ تو اس کو معیار بنالیں، جلدی نہ کریں اعتراض کرنے میں الزام دینے میں اور الزام قبول کرنے میں اور الزام کا چرچا کرنے میں اس کی وجہ سے تمام ملی کام اس وقت بڑے آزمائش میں ہیں کہ فوراً الزام لگ جاتا ہے کہ وہ روپیہ کہاں گیا؟ وہ روپیہ کہاں گیا؟ حالانکہ ہمارے علماء نے اور قائدین نے اس امانت کا دیانیت کا اور

احتیاط کا ثبوت دیا ہے، جو سیاسی لوگوں کے ذہن سے بالاتر ہے سمجھ نہیں سکتے کہ ایسا ہو سکتا ہے اس کے تذکرہ کا موقع بھی نہیں ہے، مناسب بھی نہیں ہے۔

دیکھئے! ہمیں تعلیم دی جارہی ہے اس ٹکڑے کو ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالی قرآن میں شامل نہ کرتا اور خیر یہ تو ممکن نہیں کہ وحی نازل ہونے کے بعد حروف شامل نہ کرتے لیکن یہ کہ اللہ تعالی ذکر ہی نہ کرتا تو آج زیادہ تر لوگوں کو معلوم ہی نہ ہوتا یہ قصہ، کتنے آدمی ہیں سیرت میں پڑھتے ہیں یہ قصہ سیرت میں اس واقعے پر بھی نظر پڑتی ہے اور سیرت والے لکھتے بھی ہیں تو اس کی جو کچھ شہرت ہے وہ بھی اسی ٹکڑے کی وجہ سے قرآن مجید کی وجہ سے ہے۔

یہ ہمیں قیامت تک کے لیے تعلیم دی گئی ہے اور ایسے منازل اور درجے کے فرق کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے رہیں گے ملی کاموں میں کہ عصمت کا مسئلہ نہ سہی لیکن تقوے کا مسئلہ امانت کا مسئلہ، احتیاط کا مسئلہ، جانبداری اور خویش پروری کا مسئلہ اور اپنے عزیزوں کو ترجیح دینے کا مسئلہ یہ مسئلہ پیش آئیں گے ملی کاموں میں، ملت وسیع ہے ایسے کام کا میدان بھی وسیع ہے۔ (۱)

(۱) مشترک اخذ و تلخیص: ☆ درس قرآن، سورۂ نور: ۱۱-۱۲ (غیر مطبوعہ) ☆ نبی رحمت: ۳۵۲-۳۵۶

شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَوْ لاَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكىٰ مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَداً. وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ. وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (النور: ۲۱)

''اے ایمان والو شیطان کے قدموں پر نہ چلو اور جو شخص شیطان کے قدموں پر چلے گا تو شیطان تو بے حیائی (کی باتیں) اور برے کام ہی بتائے گا اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی رحمت تو تم میں ایک شخص بھی پاک نہ ہو سکتا، مگر اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے اور اللہ سننے والا (اور) جاننے والا ہے''۔

ایمان کی بنیاد پر خطاب

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا'' (اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو) جب اللہ تبارک و تعالیٰ کو ایسی بات کہنی ہوتی ہے، جس کے لیے قوت ایمانی کی ضرورت ہے اور جو ایمان کی بنیاد ہی پر کہی جا سکتی ہے، ایمان کی بنیاد ہی پر مانی جا سکتی ہے، اس پر عمل کیا جا سکتا ہے، تو خطاب ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا﴾ سے کیا جاتا ہے، یہ ایسے رسمی الفاظ نہیں، قرآن مجید میں کوئی چیز رسمی اور خانہ پُری کے لیے نہیں ہوتی، آپ کو مثلاً کوئی اہم بات

کہنی ہو، اگر وہ مثلاً بات ہے نیکی اور تقوے کی، تو آپ کہیں گے: اے مسلمانو! اے دیندارو! اے وہ لوگو! جنہوں نے اسلام کا کلمہ پڑھا ہے، جو اللہ کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اگر آپ کو کوئی بات بہادری کی کہنی ہوگی، آپ کو جہاد اور خدا کے راستے میں قربانی کرنے اور تکلیف اٹھانے کی دعوت دینی ہوتو آپ کہیں کہ، اے مجاہدوں کی اولاد .... اے آخرت کو اصل سمجھنے والو......اور دنیا کو آخرت کے مقابلے میں ہیچ سمجھنے والو۔

تو اب یہاں جو بات آگے کہی جارہی ہے، وہ بھی اسی طرح کی ہے، تو فرماتا ہے کہ ''اے وہ لوگو..! جو ایمان لائے ہو'' ایمان لا چکے ہو اور اب اس کی ذمہ داریاں تم پہلے قبول کر چکے ہو، اس کی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں تم پر!

شیطان کے نقوش قدم

''لاَ تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ'' ''شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو'' شیطان کے قدم بقدم نہ چلو، شریعت کے خلاف جو چیزیں ہیں، نفس انسانی، نفسانیت جن کا سر چشمہ ہے، یا خواہش نفس، یا لذت نفس، یا حب جاہ، یا مال کی محبت، یہ ساری چیزیں جو ہیں، یہ سب ''خطوات الشیطان'' میں شامل ہیں۔

اے ایمان والو! جب تم ایمان لا چکے ہو، اللہ تبارک تعالیٰ کو رب حقیقی سمجھتے ہو، الٰہ حقیقی سمجھتے ہو، معبود حقیقی سمجھتے ہو، حاکم مطلق سمجھتے ہو، محبوب حقیقی بھی سمجھتے ہو، تو تمہیں شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہیں کرنی چاہیے۔ اب یہ ''خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ'' شیطان کے نقش قدم دیکھئے یہاں واحد نہیں استعمال کیا گیا بلکہ ''خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ'' جمع کا صیغہ لایا گیا، یہ اتنا جامع اور اس کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ پوری جاہلی زندگی پر حاوی ہے، یعنی اس کے اندر عقائد بھی ہیں، اس کے اندر رسوم بھی ہیں، اس کے اندر عبادات بھی ہیں، خواہشات بھی ہیں، نقالیاں بھی ہیں، جاہلیت کی پوری زندگی اس کے اندر آجاتی ہیں، ''لاَ تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ'' تم شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔

معلوم ہوا کہ اس کے بہت سے نقش قدم ہیں، اس میں وسعت آگئی، خواہ اعتقادی

چیزیں ہوں، خواہ عملی چیزیں ہوں، خواہ اخلاقی چیزیں ہوں، خواہ تہذیبی چیزیں ہوں، خواہ سیاسی چیزیں ہوں سب اس میں شامل ہیں۔

"وَمَنْ یَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ" اور اگر کوئی شیطان کے نقش قدم پر چلنے کا فیصلہ ہی کر لے اور وہ چلنا شروع کر دے، تو پھر اس کو معلوم ہونا چاہیے "فَإِنَّهُ یَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ" کہ شیطان تو فحشاء اور منکر کی تلقین کرتا ہے، یعنی بے حیائی کے کام کا حکم دیگا، اور نامعقول اور غیر منصفانہ بات کا حکم دے گا۔

اللہ اگر توفیق نہ دے

"وَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَرَحْمَتُهُ" اگر اللہ کا فضل تم پر نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی "مَا زَكىٰ مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا" تو تم میں سے کوئی شخص بھی پاکیزہ زندگی نہ گذار سکتا اور پاک صاف نہ ہو سکتا۔ یہ ایک بہت بڑی یہ تاریخی حقیقت بھی ہے، سیر و سوانح کی اور خاندانوں کی، نسلوں کی، عہدوں کی، کہ سارے اسباب موجود ہونے کے باوجود، سارے دواعی اور جو روایات ہوتی ہیں، جن کی آدمی پیروی کرتا ہے، بھائی ہمارے یہاں خاندان کی روایات یہ ہیں، ان سب کے ہونے کے باوجود، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل شامل حال نہیں ہوتا اور اللہ کی تائید نہیں ہوتی، تو ولی کے گھر میں ایک (بہت بڑے صالح نہیں بلکہ مصلح کے گھر میں) ایک غیر صالح پیدا ہو جاتا ہے، خاندانوں کی تاریخ آپ پڑھیں، نسلوں کی تاریخ آپ پڑھیں، مسلمانوں کی عہدوں کی تاریخ آپ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ کے ارادے پر موقوف ہے، محض رحمت الٰہی پر موقوف ہے، یہ نہیں کہ ولی کا بیٹا ولی ہو اور نیک صالح کا بیٹا صالح ہو۔

یہ ایسی تاریخی حقیقتیں ہیں، جو تواتر کی حد تک پہنچ گئی ہیں، جن کی تاریخ پر نظر ہے، ایک خاندان چل رہا ہے، مسلسل اولیاء پیدا ہو رہے ہیں، ایکدم سے ایک آدمی ایسا پیدا ہو جاتا ہے اس خاندان میں جو ننگ وعار کا باعث بن جاتا ہے، ان کے لیے اور لوگوں کے دلوں میں شک اور سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ ایسے گھرانے میں جہاں اللہ کے نام کے سوا کوئی اور

نام نہیں لیا جاتا اور جہاں کسی معصیت کا خیال بھی نہیں پیدا ہوسکتا، وہاں ایسا آدمی پیدا ہوگیا، بہت سے خاندانوں میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے ہیں، جنہوں نے اسلامی حکومت کے ساتھ بے وفائی کی، جو دوسروں سے مل گئے، یا مال کے لالچ میں انہوں نے کوئی ناشائستہ حرکت کی، تو اللہ نے بالکل کلیے کے طور پر بتادیا ہے اور بلکہ ڈرادیا ہے کہ "وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ" کہ اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہو، "مَا زَكىٰ مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا" تم میں سے کوئی بھی صالح نیک اور خدا ترس نہیں ہوسکتا؟ تو کوئی آدمی اپنے اعمال پر اول تو اپنے نسب اور اپنی نسبت پر اور اپنے اسلاف کے کارناموں پر اور اپنے ماحول پر جہاں پر وہ تعلیم پارہا ہے، جہاں پر وہ رہ رہا ہے، کسی پر وہ اعتماد نہ کرے، خالص اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرے اور اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھے، کہ وہی مدد کرنے والا اور رہنمائی کرنے والا ہے، کوئی آدمی نہ اپنے میراث، ترکہ سے جو نسلی اثرات ہیں، اس سے اور نہ اپنی تعلیم سے، نہ اپنی ذہانت سے اور نہ ماحول، کسی چیز سے بھی آدمی نیک نہیں ہوسکتا، جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارادہ نہ ہو اور وہ اس کو توفیق نہ دے۔

"وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ" لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے، اس کو شائستہ بناتا ہے، اس کو خدا ترس بناتا ہے۔ "وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ" اگر کوئی مثلاً یہ کہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے، یہ خاندان تو یوں چلا آرہا تھا، یہ روایات یوں تھیں، یہ تو کوششیں یوں ہوئیں تھیں، یہ تو ایسے ذہین تھے، یہ تو ایسے عالم تھے، تو اللہ ان سب کے جواب میں کہتا ہے، "وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ" اللہ تعالیٰ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی ہے، تو جو چیزیں سننے سے تعلق رکھتی ہیں وہ اللہ کو معلوم ہے، کوئی اور سنے نہ سنے، وہ سن لیتا ہے اور مثلاً غرور کا دعویٰ کردیا، کسی نے سنا نہیں، لیکن آدمی نے کہہ دیا کہیں چپکے بیٹھ کر کے، ہم تو کس کی اولاد میں ہیں، ہمارے باپ دادا ایسے ہیں، ہم سے کہیں گناہ ہوسکتا ہے، کسی نے نہیں سنا، اللہ نے سن لیا کہ وہ "سمیع" ہے اور یہ کہ وہ "علیم" بھی ہے کہ آدمی باہر کیا کرتا ہے اور اندر کیا کرتا ہے، یہ بھی جانتا ہے، اس لیے "وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ" یہ دو اللہ کی صفات ہیں، یہ اس موقع پر بڑی برمحل اور ڈرانے والی ہیں کہ آدمی یہ سمجھے کہ اپنی ذہانت سے اور اپنے وسائل

سے اور اپنے علم سے اور اپنی روایات سے اس سے کچھ کام نہیں چلتا، اس میں اللہ ہی سے توفیق مانگنی چاہیے، ''وَمَا تَوْفِيْقِي اِلَّا بِاللّٰهِ. عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْب''

جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا (حالانکہ تفسیر دونوں ہیں کہ امرأۃ العزیز نے کہا حافظ ابن تیمیہ نے بھی لکھا ہے لیکن الفاظ بتاتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ ہیں) اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب بادشاہ نے خواب دیکھا تو معبرین نے یہ کہہ کر پلہ جھاڑ لیا ''وَمَا نَحْنُ بِتَاوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعَالِمِيْنَ'' اسی درمیان وہاں وہ آدمی بھی موجود تھا جو جیل سے چھوٹ کر آ گیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی تعبیر سن چکا تھا (دو آدمیوں نے خواب دیکھا تھا، تو اس سے حضرت یوسف نے کہا تھا کہ اگر موقع ہو تو ہمارا حوالہ دینا تو) اس نے کہا کہ ہم بتا سکتے ہیں، اس کی تاویل لینے آپ ہمیں جیل خانہ بھیج دیجیے، وہاں ایک اللہ کا بندہ ہے، جو وہ تعبیر دے سکتا ہے، اس نے تعبیر دی اور وہ تعبیر صحیح نکلی، تو بادشاہ نے بھیج دیا، حضرت یوسف نے کہا کہ پہلے مقدمے کی تحقیق ہونی چاہیے، یہ ثابت ہو جائے کہ میں بالکل بری الذمہ تھا، اس لیے کہ ایسا ہوتا ہے کہ باہر نکلنے کے بعد پھر چرچا ہوتا کہ دیکھو بادشاہ نے رعایت کی ورنہ یہ ابھی جیل میں ہوتے، تو سب عورتوں نے بالاتفاق کہا کہ ''مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْءٍ'' (یوسف:۵۱) کوئی کمزوری ہم نے ان میں نہیں دیکھی، کوئی ہمیں خرابی نظر نہیں آئی، یہ سب ہماری غلطی ہے، تو حضرت یوسفؑ نے جب یہ تحقیق کروا لیا اور کہلوا لیا، اب ان کی نبوت کا تقاضا تھا، نبوت کا مقام تھا کہ انہوں نے اس سے تو ان کی تعریف نکلی تھی، اس کے باوجود وہ بالکل بری الذمہ نکل گئے، بے گناہ ثابت ہوئے، کہ بات تو ثابت ہو گئی، لیکن میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا۔ ''اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ'' (یوسف:۵۳) تو سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی نسبت سے کہا کہ جو کچھ فضل ہوا مجھ پر میں بچا رہا اس کے بعد میری برأت بھی ظاہر ہو گئی، یہ سب خدا کا فضل ہے، تو ''اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ'' ہے، اس میں دونوں باتیں ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے، کہیں سماعت کافی ہوتی ہے، کہیں سماعت کافی نہیں ہوتی ہے، علم بھی ضروری ہوتا ہے اور

کبھی دونوں کی ضرورت ہوتی ہے، کوئی شخص دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں ایسا ہوں ویسا ہوں، مجھ سے گناہ نہیں ہوسکتا، میرے دل میں تو اس کا وسوسہ بھی نہیں آسکتا، تو خواب میں بھی یہ بات نظر نہیں آسکتی، یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، یوسف بالکل بری الذمہ ہونے کے باوجود بھی کہتے ہیں، ''وَمَا أبَرِّئُی نَفْسِی اِنَّ النَّفْسَ لأمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّی'' لفظ بتا تے ہیں، پیغمبر کی زبان سے نکلا۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۂ نور: ۲۱ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ قرآن کا مطالبہ: ۳۰-۳۱

فریضۂ اقامتِ دین

﴿الَّذِيْنَ اِنْ مَكَّنَّا هُمْ فِي الأَرْضِ أَقَامُوْا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الأُمُوْرِ﴾ (الحج: ۴۱)

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور بے کاموں سے منع کریں اور اللہ ہی کے ہاتھ میں انجام کار ہے''۔

اسلام کو غلبہ و اقتدار کی ضرورت ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''الَّذِيْنَ اِنْ مَكَّنَّا هُمْ فِي الأَرْضِ'' ''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں قابو دیں گے''۔ ان کے قدم کہیں جمائیں گے، تو یہ نہیں ہوگا کہ یہ عیش و عشرت کریں گے، یہ تعمیرات میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے، یہ بڑے سے بڑے سرمائے جمع کریں گے، ان کا تمدن ایک حسین گلدستہ بن جائے گا، ان کے شہروں میں حُسن برستا نظر آئے گا، ہر شخص کے سر پر ہما کا پرندہ بیٹھا نظر آئے گا، یہ اعلیٰ سے اعلیٰ سواریوں پر بیٹھے نظر آئیں گے، ان کے دسترخوانوں پر الوانِ نعمت چنے ہوئے ہوں گے نہیں بلکہ فتوحات کی تاریخ، کشور کشائی کی تاریخ، جنگ آزمائی کی تاریخ اور انسانی حوصلہ اور عزم کے اظہار کی تاریخ کے تجربوں کے برخلاف ان کا حال یہ ہوگا یہ ''اَقَامُوْا

الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکوٰۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" " تو نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں"۔

"اَلَّذِيْنَ اِنْ مَكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ" اگر ہم ان کو زمین میں "تمکین واقتدار" عطا کریں گے، تو نماز کو برپا کریں گے، میں اس کا ترجمہ یہ نہیں کرتا کہ نماز پڑھیں گے، لفظ "صَلُّوْا" نہیں ہے، بلکہ "اَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ" ہے یعنی نماز کو زندگی کا جزء اور اس کا لازمہ بنادیں گے، اس کا انتظام واہتمام کریں گے، اس کے لیے جس فضا کے تیار کرنے کی ضرورت ہے، جتنے علم کی ضرورت ہے، جن جگہوں کی ضرورت ہے، (جن کو مساجد کہتے ہیں) ان سب کا اہتمام کریں گے،"اقاموا الصلوٰۃ"۔ "اقاموا" کے لفظ میں یہ سب چیزیں آجاتی ہیں۔ "وَآتَوُا الزَّکوٰۃَ" زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے، زکوٰۃ کو عام کریں گے۔ معروف ومنکر کے لیے امر ونہی"وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" اور نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے"۔

آپ خیال کیجئے کہ معروف ومنکر کے لیے قرآن مجید میں اور حدیث میں امر ونہی (حکم وممانعت) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو نصیحت ودعوت، ترغیب ومہمائش کے الفاظ سے مختلف ہیں، استدعا اور درخواست کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں، عربی زبان ایسی تنگ دامن نہیں ہے کہ اس کے اندر صرف امر ونہی کے الفاظ ہوں اور دوسرے الفاظ نہ ہوں، جن میں تواضع ہے، خوشامد ہے، جن میں استدعا ہے، جن میں مطالبہ ہے، بلکہ اس کے لیے جہاں کہیں بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، امر ونہی کے ہیں"يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (آل عمران:۱۰۴) "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (آل عمران:۱۱۴)

اور امر ونہی طاقت چاہتے ہیں، امر ونہی وہ مقام چاہتے ہیں، جہاں سے ہم اعتماد کے ساتھ اور جرأت کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے، امر میں اور نہی میں ایک استعلاء ہے، امر ونہی درخواست کے معنی میں نہیں، امر ونہی حکم دینا اور روکنا، اس کا منصب ادا کرنے کے لیے اس کو کسی قدر طاقت وبالاتری حاصل ہو اور عزت واحترام کے نگاہ سے

دیکھا جاتا ہو اور اس کی بات نہ ماننے کی صورت میں عقوبت و نقصان کا خوف ہو اور اس کے لیے آدمی کے اندر قوت چاہیے، ایسا مقام اور ایسی بلندی چاہیے، ایسا اعتماد چاہیے اور اس کی ایسی وقعت ہو دلوں میں کہ وہ امر کر سکے اور نہی کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو قوت کی ضرورت ہے، اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے کہ ہمیشہ وہ یہی نہ کہے کہ ''اگر ایسا کر لیا جاتا تو اچھا تھا''۔ ''ہماری درخواست ہے اور ہم آپ کو ترغیب دیتے ہیں'' ''ہم تبلیغ کرتے ہیں'' اپنی جگہ پر یہ سلسلہ جاری رہے گا، لیکن قرآن جو معیار و میزان ہے، اس میں الفاظ امر و نہی کے ہیں، جن میں مسلمانوں کو وہ طاقت حاصل کرنی چاہیے کہ جس مقام پر فائز ہو کر وہ حکم دے سکیں اور روک سکیں، اس لیے کہ فطرتِ انسانی تعریف تو کر دیتی ہے اور وہ خوش بھی ہو جاتی ہے، لیکن انسانی نسل کی پوری اصلاح، مکمل اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی، جس کے نتیجے میں ''اَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ وَ آتَوُا الزَّکٰوۃَ'' اور ''اَمَرُوْ بِالْمَعْرُوْفِ'' اور ''نَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ'' کے الفاظ آئے ہیں''۔

ایمان تو بے کاوش تسخیر نہیں ہے

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ نماز کا چرچا ہو، نماز کا رواج ہو، مسجدیں آباد ہوں، گھر گھر نماز پڑھی جائے اور زکوٰۃ کا اہتمام کیا جائے اور زکوٰۃ دی جائے اور نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے، بغیر حکومت و طاقت کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں ہو سکتا اور تو یہ مسلمانوں کے ذمہ ہے، ہر زمانے میں کہ وہ مسلمانوں کی طاقت مہیا کرنے اور اس طاقت کو منظّم کرنے اور طاقت کو باقی رکھنے کی کوشش کریں، اس سے بالکل دستبردار ہو جانا، بلکہ بیزار ہو جانا اور اس کا انکار کرنا اور تحقیر کرنا اور نفی کرنا، نہیں نہیں حکومت وکومت، ہم کو کچھ نہیں چاہیے، ہمیں تو صرف بس عبدیت چاہیے، اس میں ہمارے داعی قسم کے لوگ ذرا غلو کرنے لگتے ہیں، یعنی وہ صرف اس پر زور دینے کے بجائے اثبات کے ساتھ نفی بھی لے آتے ہیں، یا نفی نہیں لاتے تو کم سے کم وہ استخفاف لے آتے ہیں، جس سے اہمیت کم ہو، کہ نہیں حکومت وغیرہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس کے لیے

حضورا کرم ﷺ کی بعثت ہوئی تھی، نہ پیغمبر آتے تھے، اصل تو عبودیت ہے، خدا سے دعا کی جائے، مانگا جائے، نیکی اختیار کی جائے، اعمال صالحہ کئے جائیں، آخرت کی تیاری کی جائے بس یہی لیکن ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنی طاقت ضرور مسلمانوں کو پیدا کرنی چاہیے کہ وہ "أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ" کرسکیں اور اقامت صلوٰۃ اور ایتاء زکوٰۃ کا کام ہو سکے۔ یہ الفاظ بڑے جامع، وسیع معنیٰ خیز اور فکر انگیز ہیں اور تاریخ ان کی حرف بحرف تصدیق کرتی ہے۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۂ حج: ۴۱ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مشترک اخذ وتلخیص: ☆ تحفۂ پاکستان: ۴۶-۴۷
☆ دعوت فکر وعمل: ۶۲-۶۳

براہیمی نظر پیدا ذرا مشکل سے ہوتی ہے

﴿یَوْمَ لاَ یَنْفَعُ مَالٌ وَ لاَ بَنُوْنَ اِلاَّ مَنْ أتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ﴾
(الشعراء: ۸۹- ۹۰)
''جس دن مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا (وہ بچ جائے گا)''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''یَوْمَ لاَ یَنْفَعُ مَالٌ وَ لاَ بَنُوْنَ اِلاَّ مَنْ أتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ'' جس دن مال کام آئے گا اور نہ اولاد کام آئے گی سوائے اس کے جو اللہ کے پاس ''قلب سلیم'' لے کر آئے گا۔

قول وعمل کا سب سے بڑا محرک

''ہم داعی ومبلغ ہوں، یا دین کے ترجمان یا شارح، ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ دین اور دعوت ہم نے انبیاء علیہم السلام سے اخذ کی ہے، اگر انبیاء علیہم السلام یہ دعوت لے کر نہ آتے تو ہم کو اس کی ہوا بھی نہ لگتی........اس لیے ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ نبوت کا مزاج کیا ہے؟ نبوت کے لیے محرک کیا چیز ہوتی ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ نبی کی دعوت، جدوجہد اور قول وعمل کا سب سے بڑا محرک رضائے الٰہی کا جذبہ ہوتا ہے، کوئی اور چیز ان کے سامنے نہیں ہوتی، کہ اس کے نتیجہ میں یہ ملے یا وہ

ملے، یہ جذبہ ایک ایسی شمشیر برہنہ ہے، جو ہر چیز کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے، سوائے رضائے الٰہی کے، ان کا کچھ مطلوب نہیں ہوتا، میرا مالک مجھ سے راضی ہو جائے، بس مجھے سب کچھ مل گیا، طائف کی دعا کی روح پر آپ غور کریں اور طائف کے منظر کو آپ سامنے رکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بڑی امیدوں اور بڑی توقعات کے ساتھ طائف تشریف لے جاتے ہیں، طائف کا سفر آسان نہیں تھا، سخت دشوار گذار راستہ، پہاڑ کی چڑھائی اور خچر کی سواری، ایک اکیلا رفیق (زید ابن حارثہ) آپ وہاں پہنچے تو کیا ہوا؟ وہاں کے سرداروں نے کچھ اوباشوں کو اشارہ کر دیا اور انہوں نے پتھر پھینکنے شروع کئے اور اتنی سنگ باری کی کہ نعلین مبارک سے قدم مبارک نہیں نکلتے تھے، قدم مبارک لہولہان ہو گئے تھے، اس وقت پاؤں پر اتنا زخم نہیں آیا تھا، جتنا دل پر آیا تھا، کیا امید لے کر آئے تھے اور کیا ہوا، یہاں تو کوئی بات سننے کا بھی روادار نہیں اسی حالت میں آپ نے یہ دعا فرمائی، اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ رضائے الٰہی کی قیمت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ أَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِيْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِيْ، وَهَوَانِيْ عَلَى النَّاسِ، رَبَّ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ اِلٰى مَنْ تَكِلُنِيْ اِلٰى بَعِيْدٍ يَتَجَهَّمُنِيْ أَوْ اِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكْتَهٗ أَمْرِيْ" [1] (میں اس کا ترجمہ کر دیتا ہوں) فرماتے ہیں کہ "اے میرے پروردگار میں تجھ سے فریادی ہوں، اپنی کمزوری کا اور اپنی بے چارگی اور بے سروسامانی کا، لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعتی، بے بسی و بے کسی کی آپ سے شکایت کرتا ہوں، اے کمزوروں کے پروردگار تو مجھے کس کے حوالہ کرتا ہے؟ ایک ایسے بیگانہ کے جو مجھ سے ترش روئی کے ساتھ پیش آتا ہے، یا کسی دشمن کے حوالہ کرتا ہے؟ کہ جس کے ہاتھ میں تو نے میری زمام اختیار دے دی ہے۔

اب دیکھئے یہاں نبی کا مزاج اپنی پوری شان تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے اوپر کے الفاظ کے بعد جو نقل ہوئے معاً فرماتے ہیں۔

"اِنْ لَمْ يَكُنْ بِكَ عَلَيَّ غَضَبٌ فَلاَ أُبَالِيْ غَيْرَ أَنَّ عَافِيَتَكَ هِيَ أَوْسَعُ لِيْ" [2] اگر تو ناراض نہیں ہے، تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں ہے، البتہ اتنا ضرور ہے کہ

(۱-۲) کنز الاعمال

انسان ہوں تیری عافیت کا طالب ہوں، تو پہلی چیز جو نبی کے مزاج کی بنیاد ہوتی ہے، وہ رضائے الٰہی ہے، وہ پیغام پہنچاتے ہیں اور جب ان کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم نے پیغام پہنچا دیا اور ہمارا رب ہم سے راضی ہو گیا، تو پھر ان کو بالکل پرواہ نہیں ہوتی کہ نتیجہ کیا نکلا؟۔

اس کی ایک واضح مثال حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ "لَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَاماً" "پچاس برس کم ایک ہزار برس وہ دعوت دیتے رہے" اور انہوں نے کس طرح دعوت دی، دن رات ایک کر دئے، سورۂ نوح کی آیات پڑھئے "قَالَ رَبِّ اِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلاً وَنَهَاراً" "کہا اے میرے رب میں نے اپنی قوم کو رات اور دن بلایا" "ثُمَّ اِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَاراً" "پھر میں نے انہیں اعلانیہ بھی کہا، اور مخفی طور پر بھی کہا"۔

اس سب کے بعد کیا ہاتھ آیا کہ "وَمَا آمَنَ مَعَهُ اِلَّا قَلِيْلٌ" "ان کے ہاتھ پر چند آدمی ایمان لائے" جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، لیکن "وہ اس پر شاکی یا افسردہ خاطر نظر نہیں آتے اور اپنی محنت رائیگاں نہیں سمجھتے اور نہ اس سے خدا کے یہاں ان کے مقام، درجۂ قرب اور اولوالعزم پیغمبر ہونے میں کچھ فرق آتا ہے، خدا ان سے راضی تھا اور وہ اپنے خدا سے راضی تھے، خدا کا پیغام انہوں نے بندوں تک پہنچا دیا تھا اور راہِ خدا میں وہ کوشش کا حق ادا کر چکے تھے" ان کو اس پر کوئی ملال، کوئی شکوہ نہیں، جو میرا کام تھا، وہ میں نے کر دیا، میں نے اپنے رب کو راضی کر دیا، اب آگے اللہ کا کام ہے۔

مطلوب صرف رضائے الٰہی ہو

انبیاء علیہم السلام کے پیش نظر صرف رضائے الٰہی کا مسئلہ ہوتا ہے اور ہر چیز میں وہ سوچتے ہیں کہ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کے لیے سر بلندی اور عزت و غلبہ کا وعدہ فرمایا ہے، لیکن اس شرط پر کہ وہ ایمانی صفات سے متصف ہوں اور ان کا مقصد عمل صرف رضائے خداوندی ہو، نہ کہ عزت و اقتدار کا حصول اور اس کے لیے کوشش کیونکہ سر بلندی اور اقتدار اور حکومت یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں،

اپنے وقت پر اپنی شرطوں کے ساتھ ملتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی چیز مطلوب نہیں، چنانچہ آپ دیکھئے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ تو یہ ہے کہ "تِلْكَ الدَّارُ الآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَايُرِيْدُوْنَ عُلُوّاً فِيْ الاَرْضِ وَلاَ فَسَاداً. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ" (القصص:۸۳) "یہ دار آخرت ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کریں گے، جو زمین میں سربلندی نہیں چاہتے اور نہ فساد چاہتے ہیں اور اچھا انجام متقین کے لیے ہے" لیکن دوسری جگہ فرماتا ہے "وَلاَ تَهِنُوْا وَلاَ تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الأَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ" (آل عمران:۱۳۹) "ہمت نہ ہارو، غم نہ کرو، تمہیں اعلیٰ ہو، تمہیں کو علو حاصل ہوگا، اگر تم مومن ہو" اب دونوں میں تطبیق کس طرح دیں گے؟ صاف مطلب یہ ہوا کہ تم علو (سربلندی) چاہو، ہم علو دیں گے، چنانچہ آنحضرت ﷺ، صحابہ کرام کسی نے علو نہیں چاہا اور تواضع اور ایثار اور قربانی سے کام لیا، اللہ تعالیٰ نے جتنا منظور تھا، ان کو علو عطا فرمایا۔

تو پہلی چیز تو یہ ہے کہ مطلوب صرف رضائے الٰہی ہو اور رضائے الٰہی کے ساتھ اگر ساری دنیا کے فوائد اور ساری دنیا کے مفادات سے دست بردار ہونا پڑے تو وہ کامیابی ہے، اور رضائے الٰہی کے بغیر اگر ساری دنیا کی سلطنت ملتی ہو تو وہ ناکامی ہے، یہ نبوی مزاج ہے، جو بغیر کسی تکلف کے اور بغیر کسی پلاننگ کے پیغمبروں اور ان کے سچے متبعین میں پیدا ہو جاتا ہے۔

ہمارے لیے کافی ہے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہم السلام کے اس قول کا مطالعہ کریں، جس کو قرآن نے نقل کیا ہے، جس وقت آپ نے آخرت کا ذکر کیا ہے اور اس کی ہیبت وخوف کا تصور ذہن میں آیا ہے، قلبی جوش اور جذبات کا سیلاب رواں ہو گیا ہے، وہ فرماتے ہیں، "وَلاَ تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ يَوْمَ لاَ يَنْفَعُ مَالٌ وَلاَ بَنُوْنَ اِلاَّ مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ" اور مجھے رسوا نہ کیجیے جس دن لوگ اٹھا کھڑے کیے جائیں گے، جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے، ہاں جو شخص خدا کے پاس پاک دل لے کر آیا وہ بچ جائے گا)

قلب سلیم جتانے کی ضرورت

اب اس "قلب سلیم" میں عقیدۂ توحید بھی آ گیا کہ وہ شرک سے پاک ہوگا، زل و

بست سے پاک ہوگا، حسد اور بغض وکینہ سے پاک ہوگا اور تحقیر اور تکبر سے پاک ہوگا اس ''سلیم'' میں (اسکا ترجمہ مشکل ہے ایک لفظ میں) ''سلیم'' میں ساری چیزیں آ گئیں ''بقلب سلیم'' یعنی عربیت کے لحاظ سے کہہ رہے ہیں کہ (جولوگ عربی الفاظ کے درجے سمجھتے ہیں، ان کے درجۂ حرارت کو سمجھتے ہیں) کہ ''سلیم'' سے بہتر یہاں پر ایک مفرد لفظ لانا مشکل ہے، لیکن اللہ کے لیے آسان ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف انہی لفظوں میں کی گئی ہے، ''اِذْ جَاءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ'' (الصافات:۸۴) (جب وہ اپنے رب کے پاس (عیب سے) پاک دل لے کر آئے)

قلب کو قلب سلیم بنانے کی کوشش ہمیشہ رہنی چاہیے، ''اس لیے ہر اس چیز سے جو ''قلب سلیم'' کے منافی ہو اور جس کے صنم ومعبود بن جانے کا خطرہ ہو اور جو خدائے عزوجل کی محبت میں شریک وسہیم ہو، اس سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اور اس سے ہر قیمت پر بچنا لازمی ہے'' ....اس میں غیر اللہ کے مقابلے میں کوئی اور محرک، کوئی اور طاقت، کوئی اور خواہش نہ ہو اور برابر اپنے قلب کا احتساب جاری رہنا چاہیے کہ اس کے اندر سیاسی مقاصد، مادی مفادات، علو اور سربلندی کا شوق تو کام نہیں کر رہا ہے، اقبال نے صحیح کہا ہے

براہیمی نظر پیدا ذرا مشکل سے ہوتی ہے
ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنالیتی ہے تصویریں (۱)

---

(۱) درس قرآن، سورۂ شعراء:۸۹-۹۰ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ تحفۂ کشمیر:۴۱-۴۶، سے تلخیص کی گئی ہے ☆ منصب نبوت:۸۲ ☆ دستور حیات:۲۹-۳۲، سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

اپنے ایمان کا تحفظ ہے فریضہ اپنا

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرٌ. اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ. وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا. وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾ (الحج: ۳۹-۴۰)

''جن مسلمانوں سے (خواہ مخواہ) لڑائی کی جاتی ہے، ان کو اجازت ہے (کہ وہ بھی لڑیں) کیونکہ ان پر ظلم ہو رہا ہے اور خدا (ان کی مدد کرے گا وہ) یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے، یہ وہ لوگ ہیں کہ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے، (انہوں نے کچھ قصور نہیں کیا) ہاں یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدا ہے اور اگر خدا لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا، تو (راہبوں کے) صوامع اور (عیسائیوں کے) گرجے اور (یہودیوں کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں) کی مسجدیں، جن میں خدا کا بہت ساذکر کیا جاتا ہے، ویران ہو چکی ہوتیں اور جو شخص خدا کی مدد کرتا ہے، خدا اس کی مدد کرتا ہے، بے شک خدا توانا اور غالب ہے''۔

کفار کے ساتھ جہاد وقتال کا پہلا حکم

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوا'' جب مسلمان

ہجرت کر کے مکہ معظّمہ سے مدینہ طیبہ آئے، تھوڑی تعداد تھی اور جو وہاں کے رہنے والے اسلام لا چکے تھے، یا ان حضرات کے آنے کے بعد اسلام لائے، ان کو انصار کہا گیا، ان کی تعداد بھی تھوڑی تھی اور اس کے بعد اس میں بہت آہستگی سے اضافہ ہوتا رہا، اس وقت تک جو ظلم ہو رہے تھے مسلمانوں پر، اس کا اجتماعی طور پر مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، اس لیے کہ یہ حالات کے، مصلحت کے خلاف تھا اور یہ ایک طرح کی اجتماعی خودکشی ہوتی (ایک انفرادی خودکشی ہوتی ہے، ایک اجتماعی خودکشی ہوتی ہے کہ یہ چار پانچ سو آدمیوں کو، سات آٹھ سو آدمیوں کو حکم دے دیا جاتا کہ تم مقابلہ کرو) برابر وہ ظلم سہتے رہے ان واقعات کو سنتے رہے کہ مکہ معظّمہ میں ہمارے ایمان لانے والے جو وہاں سے ابھی منتقل نہیں ہو سکے، ان کے ساتھ کیا زیادتیاں ہو رہی ہیں۔

تو ایک مدت تک جنگ کی اجازت نہیں دی گئی اور ہم نے کہا کہ دو وجہ سے، ایک تو ظاہری بات ہے، کہ اتنے اسلحہ بھی نہیں تھے، اتنی تعداد نہیں تھی اور تناسب ہونا چاہیے، حریفوں میں ایک تناسب ہونا ضروری ہے، وہ آدھے صحیح لیکن آدھے تو ہوں، تو آدھے بھی نہیں تھے، تہائی بھی نہیں تھے اور دوسری یہ کہ جنگ، شہادت فی سبیل اللہ کا شوق کتنا ہے اور اس کو کتنی بڑی سعادت سمجھتے ہیں؟ اور اس کے لیے کس طرح جیسے شمع پر پروانے گرتے ہیں۔ (۱)

(۱) یہاں تک کہ ایک صاحبزادہ (جن کا نام رافع بن خدیج تھا اور جن کی عمر پندرہ سال تھی حضور ﷺ نے اجازت دی) وہ ذرا قد کے اچھے تھے، دوسرے صاحبزادے (سمرہ بن جندب) آئے، انہوں نے کہا، یارسول اللہ ہمیں بھی اجازت دیجیے آپ۔ یہ کہاں جا رہے ہیں؟ ٹورنامنٹ میں جا رہے ہیں...؟ (معاذ اللہ مسجد میں کہنا بے ادبی ہے) سنیما جا رہے ہیں،؟ تفریح میں جا رہے ہیں؟ پکنک میں جا رہے ہیں؟ سمجھ رہے ہیں اور عرب، ہم آپ نہیں سمجھتے اتنا، جتنا عرب کے لڑکے سمجھتے تھے، فرق ہوتا ہے روایات کا، ماحول کا، اتنے دنوں سے یہاں کوئی جنگ نہیں ہوئی، جنگ عظیم اول میں تو آپ لوگ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، اکثر آپ میں سے اور جنگ عظیم ثانی بھی کچھ آپ کو یاد نہیں ہوگی اور ہوئی تو اس کا مرکز ہندوستان سے باہر تھا، لیکن عرب، عربوں کے بچے بھی، ذرا جن میں شعور پیدا ہوا وہ بھی جنگ کے معنی سمجھتے تھے۔ جنگ کے معنی یہ نہیں ہوتے لڑائی ''حرب'' کے معنی ہیں، کم سے کم زخمی ہونا، اس کے آگے بہت زیادہ زخمی ہو جانا، چور چور ہو جانا، اس کے آگے شہادت پانا، مر جانا اور باپ کا غم اور ماں کا رونا اور یہ سب جو اس کے لوازم ہیں، وہ ان کے سامنے ایسے تھے جیسے ہمارے سامنے ہندوستان میں چیزیں پائی جاتی ہیں، آم کی فصل آگئی، ہم خوب سمجھتے ہیں کہ آم کی فصل کس طرح آتی ہے؟ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

فردوس تو میدانِ شہادت کے قرین ہے

لیکن اس کے بعد پھر جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے، جو خبیر و علیم ہے، وہ علیم و خبیر صرف ظاہری حالات کا، تعداد کا اور اسلحہ کا، جنگی طاقت کا نہیں، بلکہ قلوبی کیفیت کا بھی ہے، یعنی ان لوگوں میں جہاد کی صلاحیت پیدا ہوئی یا نہیں، جہاد کیلیے اللہ تعالیٰ کے نام پر، اللہ کے راستے میں جنگ کرنے کے لیے صرف مسلح ہونا، طاقت ور ہونا، منظّم ہونا کافی نہیں، بلکہ شوقِ شہادت کا ہونا بھی ضروری ہے، شوقِ شہادت یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں تکلیف اٹھائی جائے اور اس کو ثواب سمجھا جائے۔ یہ بات مسلمانوں میں ایسی پیدا ہوگئی تھی کہ اگر آپ جنگِ بدر کے حالات سیرت کی کسی کتابوں میں پڑھیں، پھر جنگ احد کے حالات پڑھیں، تو آپ کو معلوم ہوگا، یہ بھی تاریخ کا ایک عجیب واقعہ ہے فرمایا کہ تم چھوٹے ہو، انہوں نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ نے رافع کو اجازت دیدی اور مجھے واپس فرمادیا، حالانکہ اگر میری ان سے کشتی ہو تو میں ان کو کشتی میں پچھاڑ دیتا ہوں، آپ کشتی کرا کر دیکھئے دونوں میں، کشتی ہوئی، تو واقعی سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا اور اس طرح ان کو بھی غزوہ میں شرکت کی اجازت دے دی گئی۔

جنگ کی تاریخ میں ایسے واقعات ملنے مشکل ہوں گے اور بڑی خوشامدوں سے بعض لوگوں کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رعایت کی، اس لیے کہ آپ جانتے تھے، آپ کو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بھی اطلاع ہو کہ انشاء اللہ بچ کر آجائے گا، یہ بھی آپ کو اندازہ ہو، ہوسکتا ہے کہ خدا کے بتانے سے، کوئی علم غیب سے نہیں اور دوسرے یہ کہ اس کو اتنا شوق ہے کہ اس کو روکنا نہیں چاہیے اور اس کے ماں باپ کے لے بڑی سعادت کی بات ہے کہ اگر ایک شخص

(بقیہ گذشتہ صفحہ کا) معلوم ہوا کہ فساد ہوگیا، چھوڑیے آم کو، یہ بہت دور کی چیز ہے، فساد ہوگیا، ہندو مسلم فساد ہوگیا، تو ہم سمجھے، کچھ جانتے ہیں کہ ہندؤوں نے زیادتی کی ہوگی، چند درجن آدمی مارے گئے ہوں گے۔ لیکن عرب کا بچہ ہوش سنبھالتے ہی جنگ کی صرف لوازم جو اس کے ہیں نتائج، بلکہ جنگ کے اشعار بھی اس کو یاد ہو جاتے ہوں گے، کتنے "مَلْحَمَۃ" جسے کہتے ہیں، شاہنامے کی طرح، جنگ کی جو بھی نظم کہی جاتی ہے، اس کو عربی میں "مَلْحَمَۃ" کہتے ہیں، کتنے "ملحمے" ان کو یاد ہوں گے، جو ہمارے اچھے اچھے ادیبوں کو یاد نہیں۔

خاندان میں شہید ہو، پتہ نہیں کتنی پشتوں تک اس کا ثواب پہنچتا ہے۔

سید احمد شہیدؒ کا بچپن میں شوقِ شہادت اور والدہ کی اجازت کے بارے میں ''منظورہ'' میں (یہ واقعہ) لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ہندو مسلمانوں میں جنگ ہوگئی، سید صاحبؒ نے جانے کی آمادگی ظاہر کی، لیکن ایسی مائیں دنیا میں بہت کم ہوں گی، جو بیٹے کی جان کے امتحان میں پوری اتریں اور اس کو مرنے کے لیے اپنے ہاتھ سے رخصت کریں، سید صاحب کو اللہ نے والدہ بھی ایسی دی تھیں، جو حضرت اسماء کا نمونہ تھیں ا۔ وہ تو صلح ہوگئی نوبت نہیں آئی ورنہ ماں کی طرف سے اجازت تھی کہ جائے اور یہاں بھی مشقیں کرتے تھے، جہاد ہی کے نام سے، اسی تکیے پر، کہ لڑکوں کو دو گرہوں میں تقسیم کر دیتے، جیسے کہ ٹورنامنٹ ہوتا ہے، میچ ہوتا ہے، تقسیم کردیا کہ یہ حملہ کرے گا اور یہ ایک فریق اور یہ ایک فریق اور دونوں، ایک دوسرے سے جنگ کررہے ہوں، معمولی ہتھیار، تلوار تو نہیں استعمال کرسکتے تھے، لکڑی وکڑی کہ اگر جہاد کا موقع ہوا تو تھوڑی بہت اس سے واقفیت ہونی چاہیے، تو یہ ذہن میں رہے۔

جہاد وقتال کی روح

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا'' ''اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جارہی ہے کہ ان پر ظلم ہورہا ہے'' ایک بات تو یہ ہے کہ اس میں اذنِ الٰہی شامل ہونا چاہیے، یہ جنگ محض فتوحات کے لیے اور مالِ غنیمت کے لیے اور شہرت کے لیے اور عزت واختیار کے لیے اور انتقامی جذبہ سے نہیں ہونی چاہیے۔ اس کی روح یہ ہے کہ ''أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ'' دیکھیے قرآن مجید کا کوئی لفظ نہ زائد ہے، نہ کم ہے، یہ اعجاز ایسا ہے (کہ کوئی شخص اس پر کام کرے، اس پر کام نہیں ہوا) کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ اس کے تحت اور اس کے پیچھے معانی کا ایک لشکر ہے اور اتنے نکات ہیں کہ آدمی اس کا استقصاء کرہی نہیں سکتا ہے، تو اس کو شروع اس (اذن) سے کیا ہے، تاکہ یہ ہمیشہ ذہن میں رہے کہ قیامت تک مسلمانوں کی حالت، ان کی جنگی طاقت، ان کا جہاد کا جذبہ، ان کے فتح حاصل کرنے کے مواقع کم ہوں، زیادہ ہوں کچھ ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ سمجھیں کہ ہم اللہ کے حکم سے لڑرہے ہیں۔

اس لیے شروع ہی اس سے کیا اور یہ پہلی آیت ہے جو جہاد کے بارے میں قرآن مجید میں آئی ہے، "أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا" "اجازت دی گئی" معلوم ہوا کہ اجازت پر موقوف تھی یہ بات (اب آج کل کیا ہوتا ہے؟ معلوم نہیں کن کن مصالح سے، اور کن کن مطلبوں سے اور مادی فوائد کے لیے، شہرت کے لیے اور پارٹی وسیاست کے لیے لڑائیاں ہوتی ہیں)۔

اب دوسری بات سوچنے کی ہے کہ قتال کی، جنگ کی ابتداء وہاں کفار کی طرف سے ہوئی تھی، یہ مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوئی، یہ جو الزام لگاتے ہیں مستشرقین اور متشککین وغیرہ کہ مسلمانوں کو شوق تھا لڑنے کا اور انہوں نے دروازہ کھولا لڑائی کا، حالانکہ اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء وہاں سے ہوئی تھی اور ہو رہی تھی، جنگ ہو رہی تھی، اس لیے کہ "يُقَاتَلُوْنَ" یہ مضارع کا صیغہ ہے، یہ نہیں ہے کہ "أُذِنَ لِلَّذِيْنَ قُوْتِلُوْا" اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن سے جنگ کی گئی ہے، نہیں "أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ" اجازت دی جاتی ہے ان لوگوں کو جن سے برابر جنگ ہو رہی ہے، جن سے جنگیں کی جاتی ہیں "بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا" اس بنا پر کہ وہ مظلوم ہیں، معلوم ہوا کہ اس اجازت کی وجہ یہ تھی کہ یہ مظلوم تھے، جن کی طرف سے ابتداء نہیں تھی اور یہ بے قصور تھے اور انہوں نے کوئی فساد نہیں کیا تھا اور جنگ کے مستحق نہیں ہوئے تھے۔

"وَ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْر" اور اسی اجازت کے ساتھ یہ بھی کہا گیا، یہ بھی ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ "إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْر" سن لینا چاہیے.....لوگوں کو..کہ بیشک اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قدرت رکھتا ہے، تو اب جو مدد ہوگی، وہ اللہ کی قدرت سے ہوگی، ان کی بہادری سے، ان کے جنگ کی مشق سے اور ان کے اسلحہ سے نہیں ہوگی۔

جہاد وقتال کی ضرورت

آگے فرماتا ہے کہ "الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَق" "وہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ناحق"۔ جو مہاجرین نکلے تھے مکہ معظمہ سے، یہ کوئی مدینہ طیبہ کی سیر کے شوق میں نہیں نکلے تھے اور نہ وہاں معاشی مقاصد کے لیے، بلکہ بعض حیثیتوں سے

مکہ معظّمہ فائق تھا، بعض حیثیتوں سے مدینہ، یا مکہ معظّمہ ہی کے قافلے جاتے تھے، ''رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ'' کہا گیا ہے، ایک شام جاتا تھا، ایک یمن جاتا تھا تو ''الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بغير حق'' ''جو اپنے گھروں سے نکالے گئے بغیر کسی حق کے''

جرم ان کا کیا تھا ''اِلَّا أَنْ يَقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ'' بس صرف اس جرم میں ''وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے'' وہی ہماری پرورش کرتا ہے، اسی نے ہمیں پیدا کیا، وہی ہمیں پالتا ہے تو یہاں پر بتا دیا کہ جہاد کی اجازت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ مظلوم ہیں۔

جہاد کی حکمت ومصلحت

''وَلَوْلاَ دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ'' اور یہ سلسلہ جہاد کا یعنی جنگ کی اجازت دینے کا سلسلہ جو قدیم سے چلا آرہا ہے کہ داعیانِ حق کو اور اہل ایمان کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ مدافعت کریں، یا کبھی ضرورت ہو تو حملہ بھی کریں، یہ بھی یاد رکھو..! کہ (ہمارے استشراقی مزاج مسلمانوں نے جہاد کو بالکل مدافعت کی جنگ ثابت کیا ہے، یہ بات نہیں ہے) جہاد جہاں بھی ہوا ہے، وہ ضرورتاً، اضطراراً ہوا ہے، یہ بات نہیں ہے، اب روم پر جو حملہ ہوا، شام پر حملہ ہوا، ایران پر حملہ ہوا، عراق پر حملہ ہوا، یہ سب وہاں کے نظام کو بدلنے کے لیے اور وہاں دین کی دعوت کو آسان بنانے کے لیے اور اس کے لیے زمین تیار کرنے کے لیے اور ظالموں کے ظلم سے وہاں کی رعیت کو چھڑانے کے لیے، یہ جنگیں ہوئی تھیں، تو یہ مدافعت تھی اس میں اقدام بھی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوٰتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْراً'' اور اگر یہ سلسلہ نہ ہوتا تو عبادت گاہوں کی حفاظت بھی نہیں ہوسکتی تھی ''اور اگر اللہ تبارک وتعالیٰ لوگوں کو نہ روکتا بعض کو بعض کے ذریعہ سے تو نہ خانقاہیں رہتیں اور نہ سجدہ گاہیں رہتیں اور نہ مسجدیں رہتیں ''صَوَامِعُ، بِيَعٌ، صَلَوٰاتٌ، مَسَاجِدُ'' یہ مختلف فرقوں اور مذاہب کے اصطلاحی نام ہیں (ہم لوگ تو مساجد صرف کہتے ہیں اور مامور ہیں اس پر کہ صرف مسجد کہیں، کوئی لفظ اس کے علاوہ صحیح نہیں ہے، یہاںتک کہ عبادت گاہ بھی کہنا صحیح

نہیں ہے، یہ ہندو تخیل ہے) مگر کسی کے یہاں "صوامع" کا لفظ ہے، کسی کے یہاں "بیع" کا لفظ ہے، کسی کے یہاں "صَلَوَاتٌ" یہ بڑی تفسیروں میں دیکھنے کی چیز ہے (اور قرآن مجید کی لغت، مثلاً راغب کی "مُفْرَدَاتُ غَرِیْبِ الْقُرْآنِ" بہت ہی مستند اور فاضلانہ ہے) اگر اللہ تعالیٰ پہلے سے لوگوں کو اس طرح نہ روکتا ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے تو عبادت گاہیں، جو مختلف ناموں کی تھیں، مختلف مذاہب کی تھیں، کوئی باقی نہیں رہتی، جن میں کہ اللہ تعالیٰ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، بہر حال نام تو صرف اللہ کا لیا جاتا تھا۔

مدد کب اور کیسے آئے گی.....؟

"وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ" اور اللہ تعالیٰ ضرور مدد کرے گا اس کی، جو اس کی مدد کرتا ہے، دیکھئے اللہ کی مدد کا استحقاق پیدا کرنے کے لیے اللہ کی مدد کے لیے کھڑے ہونے کی ضرورت ہے۔

"اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ" اور وہ کیسے مدد کر سکتا ہے بڑے قوی مقابل کے مقابلے میں اس کے لیے فرماتا ہے اور وہ اس کی وجہ بیان کرتا ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ" "بیشک اللہ تعالیٰ قوی اور عزیز ہے" دیکھو اس میں دونوں یعنی اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام اور صفات ہیں، لیکن یہاں پر قریب ترین اور مناسب ترین اسماء کا انتخاب کیا گیا، ﴿قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ حکیم، علیم، خبیر، سب کچھ کہا جا سکتا ہے، رحیم، مگر یہاں پر ضرورت ہے "قوی" و "عزیز" کی، یہاں وہ طاقت مدد کر سکتی ہے جو قوت رکھتی ہو، وہ مدد کر سکتی ہے جو صاحب قوت ہو اور صاحب غلبہ ہو اور "قوی" کے ساتھ "عزیز" بھی لگا دیا، صرف "قوی" ہونا کافی نہیں ہوتا، کتنے قوی ہیں جو شکست کھاتے ہیں یا بیٹھ رہتے ہیں، یا پیچھے ہٹ جاتے ہیں، تو "قوی" کے ساتھ "عزیز" بھی ضروری ہے، عجیب اس میں تلازم ہے، وہ "قوی" ہی نہیں صرف بلکہ "عزیز" غالب ہونے والا ہے، ایسا "قوی" ہے کہ اس کو غلبہ ہی حاصل ہوتا ہے۔[1]

---

(۱) درس قرآن، سورۂ حج: ۳۹-۴۰ (غیر مطبوعہ)

حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں حاجت روا

﴿وَلِلّٰهِ الأَسْمَاءُ الْحُسْنىٰ فَادْعُوْهُ بِهَا﴾ (الاعراف: ۱۸۰)

''اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں، وہی نام لے کر اس کو پکارو''

اسمائے حسنیٰ

اللہ کے وہ اچھے اچھے نام (اسمائے حسنیٰ) جن میں سے بہت سے قرآن شریف میں آئے ہیں اور بہت سے اللہ کے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم کیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں فرمایا ہے، ''وَلِلّٰهِ الأَسْمَاءُ الْحُسْنىٰ فَادْعُوْهُ بِهَا'' ''اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں، وہی نام لے کر اس کو پکارو''

یہ نام گنتی میں ننانوے کی تعداد کو پہنچتے ہیں، قرآن مجید کے اٹھائیسویں پارہ میں ایک جگہ ان میں سے چودہ نام اس طرح لیے گئے ہیں کہ پڑھنے والے کو وجد سا آنے لگتا ہے اور وہ پڑھتے ہوئے جھوم اٹھتا ہے، یہاں وہ آیات نقل کی جاتی ہیں

''هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لاَ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ. عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ. هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لاَ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ. سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ. هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الاَسْمَاءُ

الْحُسْنیٰ. یُسَبِّحُ لَہٗ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَالاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ" (الحشر: ۲۲-۲۴)

"وہ اللہ ایسا (پاک ذات) ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پوشیدہ اور ظاہر (سب) کا جاننے والا وہی مہربان (اور) رحم والا ہے، وہ اللہ ایسا (پاک) ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں (تمام جہاں کا) بادشاہ ہے، پاک ذات ہے، (تمام) عیبوں سے بری ہے، امن دینے والا ہے، نگہبان ہے، زبردست ہے، بڑا دباؤ والا ہے، بڑی عظمت رکھتا ہے، یہ لوگ جیسے جیسے شرک کرتے ہیں، اللہ (کی ذات) اس سے پاک ہے، وہی اللہ (ہر چیز کا) خالق (ہر چیز کا) موجد (مخلوقات کی طرح طرح کی) صورتیں بنانے والا ہے، (اس کی اچھی اچھی صفتیں ہیں اور اسی سبب سے) اس کے اچھے اچھے نام ہیں، جو (مخلوقات) آسمان وزمین میں ہے، (سب ہی تو) اس کی تسبیح (وتقدیس) کرتے ہیں، وہ زبردست (اور) حکمت والا ہے۔"

یہ نام برائے نام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ "جو اس کارخانۂ عالم کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور چلانے والا بھی، جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی باگ ڈور ہے، جو پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا، جنت اس کا انعام ہے اور دوزخ اس کی سزا، جس کے لیے چاہتا ہے، رزق میں کشائش کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، آسمان وزمین کی تمام پوشیدہ اشیاء سے واقف ہے، آنکھوں کی چوریوں اور دلوں کے اسرار خوب جانتا ہے، جو سراپا جمال، سراپا جلال، سراپا کمال اور محبت ورحمت ہے"۔ (۱)

ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان خوبیوں، قدرتوں، کمالات اور اوصاف کا مالک ہے، اس کو اپنی مخلوق سے کیسا تعلق ہے، وہ ان پر کتنا مہربان ہے، ....وہ کتنا قابلِ محبت، مستحقِ اطاعت وعبادت اور تعظیم واحترام ہے، کیا چیز ہے جو اس کے پاس نہیں اور اس کے

(۱) عروج وزوال کا اثر: ۱۰۴

احاطۂ قدرت میں داخل نہیں؟ کائنات میں اس سے زیادہ محبت کرنے والا، اچھائی کی قدر کرنے والا، رحم کرنے والا، انصاف کرنے والا، چھوٹی بڑی چیز کا جاننے والا اور بڑی سے بڑی چیز اور مشکل سے مشکل کام کو نیست سے ہست میں لانے والا اور ناممکن کو ممکن بنا دینے والا، اس کے علاوہ کون ہے؟ پھر کیوں نہ اس سے محبت کی جائے، اس کے سہارے جیا جائے، زندگی بھر اس کا دم بھرا جائے اور اس کے منشا پر چلا جائے، اپنی جان، اپنے ماں باپ اور اولاد اور پیاری سے پیاری چیز سے زیادہ اس سے محبت کی جائے، پھر اس سب کے ہوتے ہوئے اس کے سوا کسی کی بندگی کرنے کسی سے دعا و التجا کرنے اور کسی کو کارساز و مشکل کُشا سمجھنے کا کیا جواز ہے؟

خدا کی صفات سے واقفیت ضروری ہے

رب اور بندہ کے تعلق کو سمجھنے کے لیے بھی خدا کی صفات (Attributes) سے واقفیت ضروری ہے، اس لیے کہ تعلقات ہمیشہ صفات کے تابع ہوتے ہیں، صفات ہی سے ان کی نمود ہے، اگر ہم کو کسی دو ہستیوں یا دو شخصیتوں کے صفات کا علم نہیں ہے اور ہم حسن سلوک اور احسان مندی کے اس رشتہ سے واقف نہیں، جو ان دونوں کے درمیان قائم ہے، تو ہم ان تعلقات کی صحیح نوعیت کبھی نہیں سمجھ سکتے، وہ تمام تعلقات جن کو ہم زندگی میں برتتے ہیں جن سے قانون کی تشکیل ہوتی ہے اور جو کسی تہذیب و معاشرہ کو وجود میں لاتے ہیں، وہ سب درحقیقت ان ہی صفات کے تابع ہیں، جن کی کارفرمائی انسانی معاشرہ پر ہم کو نظر آ رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تمام آسمانی صحیفے اور تمام مذہبوں اور شریعتوں نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ زور خدا کی صفات پر دیا ہے، اس کے بعد عبادات، طاعات اور فرائض و معاملات کی تفصیل بیان کی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے صفاتِ کریمہ، اسمائے حسنیٰ، اس کے افعال و تصرفات، اس کی قوت و قدرت، اس کی صنعت و خلاقی، اس کے لطف و رحمت، اس کی محبت و رافت،

اس کے جُو دوکرم، اس کے عفوودرگذر، اس کے عطاء ومنع، اس کے نفع وضرر، اس کے علم و معرفت اس کے قُرب ومعیت، اس کی اِحاطۂ قدرت اوراس کے قبول ونوازش کواس طرح بیان کیا ہے کہ جمال وجلال، کمال ونوال اور حسن واحسان کی آخری مثال بندہ کے سامنے آجاتی ہے۔ ''وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الاَعْلىٰ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'' (النحل:۶۰) اللہ کی شان (سب سے) اعلیٰ ہے اوروہ زبردست حکمت والا ہے، ''لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَئٌ . وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ'' (الشوریٰ:۱۱) ''کوئی چیز اس کے مثل نہیں، اوروہی ہر بات کا سننے والا ہے، (ہر چیز کا) دیکھنے والا ہے''۔

محبت وشوق کا سرچشمہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے صفات واَفعال اوراس کے انعامات کا اتنی کثرت سے ذکراور اِعادہ وتکراراوراس قدرشرح وبسط کے ساتھ بیان کا اصل راز یہی ہے، اس لیے کہ صفات ہی محبت وشوق کا سرچشمہ ہیں، یہی اثبات ہے (Assertion) (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کریمہ کا بیان اوراس کے دلائل وشواہد کا ذکر) جس سے انسان کے ذوق وشوق کوغذا ملتی ہے اور محبت جوش مارنے لگتی ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی یہ صفات عالیہ اور اسمائے حسنیٰ ہمارے سامنے نہ ہوں (جن سے قرآن وحدیث بھرے پڑے ہیں اور جن پر عشاق و محبین ہمیشہ سرد ھنتے رہے، عارفین ان کے ترانے گاتے رہے، ذاکرین ان کی تسبیح میں مشغول رہے اوران کا کلمہ پڑھتے رہے اوراہلِ معرفت وحقیقت زندگی بھراس سمندر کے تہہ نشین موتی چنتے رہے) تو ان کا دین ایک چوبی اورآہنی نظام کی طرح ہوجاتا، جس کی دلوں میں کوئی جگہ نہ ہوتی، یہ نہ اُن میں کوئی جذبہ اورگرم جوشی پیدا کرسکتا، نہ ان کے دلوں کو گرم اورنہ آنکھوں کونم کرنے کی صلاحیت رکھتا، نہ اس سے دعا میں انابت ورقت کی کیفیت ہوتی، نہ دل میں سرفروشی کا جوش۔

نہ سرمیں اس کا سودا، اس کے بغیر خدااور بندہ کا تعلق ایک مردہ اور محدود تعلق ہے، اس میں نہ کوئی زندگی ہے، نہ روح، نہ لچک نہ وسعت، زندگی ایک ایسی خشک سخت اور

بے جان چیز ہے۔(۱)

جو لذتِ آرزو، متاعِ شوق، جنون وشوریدگی کی دولت سے بالکل تہی دامن اور محروم ہے پس جب ہم یہ سنتے ہیں کہ یونانی خدا کو مانتے ہیں مگر اس سے ان کو کوئی قلبی لگاؤ، گہرا تعلق اور وابستگی نہ تھی، خشوع وخضوع کی کیفیت بالکل نہیں تھی۔ میں خشوع وخضوع کی کمی تھی اور ان کی عبادات اور مذہبی اعمال ایک قالب بے روح سے زیادہ نہ تھے اور یہ کہ وہ خدا کی بزرگوں سے زیادہ تعظیم نہیں کرتے تھے، تو ہم کو ذرا بھی تعجب نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ تاریخ میں آدمی سیکڑوں صناعوں اور موجدوں کا تذکرہ پڑھتا ہے، لیکن کبھی ان کی طرف سے اس کے دل میں خشوع وخضوع اور ان سے بندگی کا ربط نہیں پیدا ہوتا، بندگی کا تعلق تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب خدا کو اس کائنات میں ابدی طور پر اور اب بھی متصرف اور کارفرما اور اپنے کو اس کا محتاج سمجھتے۔ یونان اور بعض دوسرے ایشیائی ملکوں میں اسی پر بس نہیں کیا گیا کہ خدا کو اس کی صفات (تعریفوں اور خصوصیتوں) سے الگ کر کے ایک مجرد (تنہائی اور خیالی)(Abstract)۔

ہستی کی طرح مانا گیا، بلکہ اُس کی ہر صفت کے لیے (جو زندگی کی ایک ضرورت ہے اور انسان اس کا محتاج ہے) ایک الگ خیالی وجود اور پیکر (Imaginary but perfect being) تجویز کرلیا گیا، مثلاً رحم وشفقت کا فلاں دیوتا ہے، محبت کا فلاں، پانی برسانے والا اور کھیتی سرسبز کرنے والا فلاں، دشمن پر فتح دینے والا اور کامیاب کرنے والا فلاں، اولاد عطا کرنے والا اور قسمت بنانے اور بگاڑنے والا فلاں، یہاں تک کہ بعض بعض بیماریوں (چیچک وغیرہ) کو اور رب العالمین (سب جانوں کا پالنے والا اور اُن کو اُن کی ضروریات مہیا

(۱) اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اُن کا سارا زور اس پر تھا کہ خدا یہ نہیں ہے، خدا یہ نہیں ہے، مگر خدا کیا ہے؟ اس کے کیا صفات و کمالات ہیں؟ اس کا ان کے یہاں بہت کم ذکر آتا ہے، اُن کا سارا زور نفی (Negation)(نہیں) پر تھا، اثبات (Assertion) (ہے) پر نہیں، ماہرینِ نفسیات اور فلسفہ و اخلاق اور مذہب وروحانیت کے واقفین جانتے ہیں کہ ایک ہزار ''نہیں'' ایک ''ہاں'' کے برابر نہیں، عظمت واحترام، جذب وشوق، امید ورجا اور طلب وسوال کے لیے یہ معلوم ہونے کی ضرورت ہے، کہ خدا ایسا ہے، ایسا ہے، اس کی صفات وقدرت، محبت رحمت کے علم کی ضرورت ہے۔

کرنے والا) خدا ایک خیالی ہستی اور معطل وجود بن کر رہ گیا۔

اسلام نے اس کے برخلاف ساری تعریفوں اور خوبیوں کا مستحق، ہر طرح کی قدرت کا مالک، نفع وضرر، موت وحیات، رزق، صحت ومرض، فقر غناء اور فتح وشکست کا دینے والا اسی کو قرار دیا اور مختصر ترین، لیکن جامع ترین الفاظ میں قرآن میں کہہ دیا گیا "أَلا لَهُ الْخَلْقُ وَالأَمْرُ" (الاعراف:۵۴) "یاد رکھو اسی کا کام ہے پیدا کرنا، اسی کا کام ہے اس کارخانۂ عالم کا چلانا اور اس کا انتظام کرنا" اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اسمائے مبارکہ کے فیوض و برکات، انوار واسرار، اخلاق وآثار نصیب فرمائے۔ (آمین)[۱][۲]

---

(۱) اسمائے حسنیٰ:۳-۱۱

(۲) مزید تفصیل کے لیے مطبوعہ کتابچہ "اسمائے حسنیٰ" ملاحظہ ہو: اخذ وتلخیص: ☆ عروج وزوال کا اثر:۱۰۴ ☆ اسمائے حسنیٰ:۳-۱۱

واقعۂ اسراء و معراج

﴿مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغیٰ. لَقَدْ رَأی مِنْ آیَاتِ رَبِّہٖ الْکُبْریٰ﴾
(النجم:۱۷-۱۸)

''ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ (حد سے) آگے بڑھی، انہوں نے اپنے پروردگار کی قدرت کی کتنی ہی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی، راتوں رات آپ کو قدرتِ غیبی کے ساتھ مسجدِ حرام لے جایا گیا، وہاں سے مسجد اقصیٰ پہنچایا گیا، اس کے بعد ان مقاماتِ قُرب و اختصاص، ساتوں آسمانوں کی سیر، اللہ کی نشانیوں کے مشاہدے اور انبیاء کرام سے ملاقات کے وہ تمام واقعات پیش آئے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغیٰ، لَقَدْ رَأی مِنْ آیَاتِ رَبِّہٖ الْکُبْریٰ''۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی ایک ضیافت و عزت افزائی تھی، جو آپ کی دل داری و دل نوازی اور طائف کے ان زخموں کو مندمل کرنے اور اس توہین و ناقدری اور بے گانگی و بیوفائی کی تلافی کے لیے تھی، جس کے سخت امتحان سے آپ وہاں گزرے تھے۔

جب صبح ہوئی تو آپؐ نے لوگوں کو اس واقعہ کی خبر دی، قریش نے اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا، اس کو ایک محال اور ناممکن امر قرار دیا اور آپ جھٹلایا اور مذاق اڑایا، حضرت ابوبکرؓ نے یہ سن کر کہا کہ اگر آپؐ نے ایسی بات کہی ہے تو سچ کہی ہے، تم کو اس پر تعجب کیوں ہے؟

خدا کی قسم آپ مجھے یہ خبر دیتے ہیں کہ وحی آپؐ کے پاس دن رات کے کسی حصہ میں آسمان سے زمین تک آجاتی ہے، تو میں آپ کی تصدیق کرتا ہوں، جو اس سے بھی مشکل اور بعید ہے جس پر تم لوگ تعجب کر رہے ہو۔

معراج کے بلند و لطیف مطالب و معانی

واقعۂ معراج محض ایک جزئی و ضمنی واقعہ نہ تھا، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرایا اور آسمان و زمین کی بادشاہت بے پردہ و بے حجاب ہو کر آپؐ کے سامنے آگئی، نبوت کے اس غیبی و آسمانی سفر میں اس کے علاوہ بھی بہت بلند و لطیف مطالب و معانی پوشیدہ ہیں اور اس میں بہت دور رس اشارات کئے گئے ہیں، یہ دونوں سورتیں، سورۂ اسراء اور سورۂ نجم، جو واقعۂ معراج کے سلسلہ میں نازل ہوئیں، یہ اعلان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں قبلوں (مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ) کے نبی اور دونوں سمتوں مشرق و مغرب کے امام اور اپنے پیش رو تمام انبیاء کرام کے وارث اور بعد میں آنے والی پوری نسلِ انسانی کے رہبر و رہنما ہیں، آپ کی شخصیت اور آپؐ کے سفر معراج میں مکہ بیت المقدس سے اور مسجدِ حرام مسجدِ اقصیٰ سے ہم آغوش ہوگئی، آپؐ کی امامت میں تمام انبیاء نے نماز پڑھی اور یہ دراصل آپؐ کے پیغام و دعوت کی عمومیت و آفاقیت، آپؐ کی امامت کی ابدیت اور ہر طبقۂ انسانی کیلیے آپؐ کی تعلیمات کی ہمہ گیری و صلاحیت کی دلیل و علامت تھی۔

یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا صحیح تعارف اور اس کی صحیح نشاندہی، آپ کی امامت و قیادت کا بیان، آپ کی اس امت (جس میں آپؐ مبعوث ہوئے) کے اصل مقام و حیثیتِ عرفی کا تعین اور اس پیغام و دعوت اور مخصوص کردار کی پردہ کشائی کرتا ہے، جو اس امت کو اس وسیع و عریض دنیا اور عالمی برادری میں انجام دینا ہے۔

واقعۂ معراج دراصل ایک محدود، مقامی اور عارضی نوعیت اور نبوت کی ابدی اور عالم گیر شخصیت کے درمیان خطِ فاصل اور امتیازی لکیر کی حیثیت رکھتا ہے، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

کوئی قومی یا مقامی لیڈر، کوئی ملکی ووطنی رہنما، کسی خاص نسل کے نجات دہندہ اور کسی نئی شوکت وعظمت کے بانی ہوتے تو آپ کو اس معراجِ آسمانی کی ضرورت نہ تھی، اس کے لیے آپ کو نہ آسمان وزمین کی وسیع بادشاہت کے سیر ومشاہدہ کی حاجت تھی، نہ اس کی ضرورت تھی کہ آپ کے ذریعہ آسمان وزمین کا یہ نیا تعلق قائم ہو، اس وقت آپ کی یہ سرزمین، یہ ماحول اور یہ سوسائٹی آپ کیلیے کافی ہوتی، اس کو چھوڑ کر آپ کو کسی اور خطۂ زمین کی طرف توجہ کرنے کی بھی ضرورت نہ تھی، نہ کہ بلند آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی یا مسجدِ اقصیٰ تشریف لے جانے کی جو آپ کے شہر سے بہت دور اور عیسائی مذہب اور طاقتور رومن شہنشاہی کے زیرِ اقتدار تھا۔

واقعۂ معراج یہ اعلان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قومی اور سیاسی رہنماؤں کی صف سے کوئی تعلق نہیں رکھتے جن کی صلاحیتوں اور کوششوں کا دائرہ ان کے ملک یا ان کی قوم تک محدود رہتا ہے اور ان سے صرف انہیں نسلوں اور قوموں کو فائدہ پہنچتا ہے، جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے اور اسی ماحول تک ان کا اثر باقی رہتا ہے، جس میں وہ پیدا ہوتے ہیں، آپ جس گروہ اور جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، وہ خدا کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی صف ہے جو آسمان کا پیغام زمین والوں کو اور خالق کا پیغام مخلوق کو پہنچاتے ہیں اور ان سے پوری نوعِ انسانی (زمانہ وتاریخ، رنگ ونسل اور ملک وقوم سے قطع نظر) سرفراز وسربلندی ہوتی ہے، اور اس کی قسمت جاگتی ہے"۔ (۱)

(۱) نبی رحمت: ۱۸۹-۱۹۲

ختمِ نبوت

انعامِ خداوندی اور امتِ اسلامیہ کا امتیاز

﴿وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا﴾ (الاحزاب: ۴۰)

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اس کو ختم کردینے والے) ہیں اور خدا ہر چیز سے واقف ہے''۔

وہ صفات جو دائمی نبی اور آخری رسول کے ہوسکتے ہیں

''قرآن مجید نے سلسلۂ نبوت کے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ختم ہونے اور آپ کے بعد کسی نبی کی بعثت کی عملاً ضرورت نہ ہونے کے اظہار کے لیے گوناگوں اور نہایت بلیغ اسالیب بیان اختیار کئے ہیں، جو بیک وقت قلب و دماغ کو پورے طور پر اپیل کرنے والے ہیں، اس کے لیے کبھی تو قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص و اوصاف ایسے انداز میں بیان کئے ہیں، جن سے عقل سلیم رکھنے والا ہر انسان بآسانی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ آپ ایک زندۂ جاوید پیغمبر اور قیامت تک کے لیے قابل تقلید نمونہ اور مثالی

شخصیت ہیں، چنانچہ ارشاد ہوا "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ. وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْماً" "محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں، بلکہ خدا کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اس کو ختم کردینے والے) ہیں اور خدا ہر چیز سے واقف ہے"۔

اس آیت کا آخری جزء "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْماً" قرآن مجید کے اعجاز کا ایک نمونہ ہے یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ کسی شخص کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ ایک پیغمبر قیامت تک کے لیے کیسے کافی اور مختلف انسانی نسلوں کے لیے رہنما اور اسوۂ کامل ہوسکتا ہے اور اس کی شریعت وتعلیمات کس طرح تمام انسانی ضروریات، نئے نئے تقاضوں اور عہد بعہد کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہوسکتی ہے؟ تو اس کا جواب اس مختصر لفظوں میں دے دیا گیا کہ "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْماً!"

قرآن نے آپ کے آخری نبی ہونے کو ظاہر کرنے کے لیے اسی قوم کی زبان اور تعبیرات سے کام لیا ہے، جن کی زبان میں وہ اترا ہے اور جو اس کے اولین مخاطب اور اس کے سمجھنے اور پھر دنیا کو سمجھانے اور بتانے پر مامور تھے، یہ زبان ان کے درمیان رابطے، بول چال اور ادائے مطلب کی زبان تھی، لیکن اس زبان کی محیر العقول وسعت وصلاحیت کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس میں کمال وانتہا بتانے والا کوئی لفظ "خاتم" سے بہتر موجود نہیں اور اس مطلب کے لیے یہی لفظ گفتگوؤں اور شعر وادب میں ان کی نوک زبان رہتا تھا، اسی لیے ان کی زبان میں خاتم، ختام اور ختم کے وہی معنی پائے جاتے ہیں، جو قرآن مراد لیتا ہے، یعنی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول اور خاتم الانبیاء ہیں، جن کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں"۔ (۱)

عقیدۂ ختمِ نبوت کا فیض

"یہ عقیدہ کہ دین مکمل ہو چکا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری پیغمبر اور خاتم النبیین ہیں اور یہ کہ اسلام خدا کا آخری پیغام اور زندگی کا مکمل نظام ہے، ایک انعامِ

(۱) منصب نبوت: ۲۰۵-۲۰۶

خداوندی اور موہبتِ الٰہی تھا، جس کو خدا نے اس امت کے ساتھ مخصوص کیا، اسی لیے ایک یہودی عالم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس پر بڑے رشک اور حسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ قرآن میں ایک آیت ہے جس کو آپ لوگ پڑھتے رہتے ہیں، اگر وہ ہم یہودیوں کی کتاب میں نازل ہوتی اور ہم سے متعلق ہوتی تو ہم اس دن کو جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اپنا قومی تہوار اور یوم جشن بنا لیتے، اس کی مراد سورۂ مائدہ کی اسی آیت ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً﴾ (المائدہ:۳) سے تھی، جس میں ختم نبوت اور تکمیل نعمت کا اعلان کیا گیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس نعمت کی جلالت وعظمت سے اس اعلان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا، صرف اتنا فرمایا کہ ہمیں کسی نئے یوم مسرت اور تہوار کی ضرورت نہیں، یہ آیت خود ایسے موقع پر نازل ہوئی ہے، جو اسلام میں ایک عظیم الشان اجتماع اور عبادت کا دن ہے، اس موقع پر دو دو عیدین جمع تھیں، یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) اور روز جمعہ۔

اس عقیدہ نے اسلام کو انتشار پیدا کرنے والی اور ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والی ان تحریکات اور دعوتوں کا شکار ہونے سے بچایا جو تاریخ اسلام کی طویل مدت اور عالم اسلام کے وسیع ترین رقبہ میں وقتاً فوقتاً سر اٹھاتی رہیں، اسی عقیدہ کا فیض تھا کہ اسلام ان مدعیانِ نبوت اور محرفین اسلام کا بازیچۂ اطفال بننے سے محفوظ رہا، جو تاریخ کے مختلف وقفوں اور عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں میں پیدا ہوتے رہے، ''ختم نبوت'' کے اسی حصار کے اندر یہ ملت ان مدعیوں سے دستبرد اور یورش سے محفوظ رہی، جو اس کے ڈھانچے کو بدل کر ایک نیا ڈھانچہ بنانا چاہتے تھے اور وہ ان تمام سازشوں اور خطرناک حملوں کا مقابلہ کر سکی، جن سے کسی پیغمبر کی امت اس سے پہلے محفوظ نہیں رہی اور اتنے طویل عرصہ تک اس کی دینی اور اعتقادی وحدت اور یکسانی قائم رہی، اگر یہ عقیدہ اور یہ حصار نہ ہوتا تو یہ امتِ واحدہ ایسی مختلف اور متعدد امتوں میں تقسیم ہو جاتی، جن میں سے ہر امت کا روحانی مرکز الگ ہوتا، علمی وتہذیبی سر چشمہ الگ ہوتا، ہر ایک کی الگ تاریخ ہوتی، ہر ایک کے الگ اسلام اور مذہبی پیشوا اور مقتدا ہوتے، ہر ایک کا الگ ماضی ہوتا۔

ختم نبوت کا زندگی اور تمدن پر احسان

عقیدۂ ختم نبوت در حقیقت نوعِ انسانی کے لیے ایک شرف و امتیاز ہے، وہ اس بات کا اعلان ہے کہ نوع انسانی سن بلوغ کو پہنچ گئی ہے اور اس میں یہ لیاقت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کو قبول کرے، اب انسانی معاشرے کو کسی نئی وحی، کسی نئے آسمانی پیغام کی ضرورت نہیں، اس عقیدے سے انسان کے اندر خود اعتمادی کی روح پیدا ہوتی ہے، اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا ہے اور اب دنیا کو اس سے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں، اب دنیا کو نئی وحی کے لیے آسمان کی طرف دیکھنے کے بجائے خدا کی پیدا کی ہوئی طاقتوں سے فائدہ اٹھانے اور خدا کے نازل کئے ہوئے دین واخلاق کے بنیادی اصولوں پر زندگی کی تنظیم کے لیے زمین کی طرف اور اپنی طرف دیکھنے کی ضرورت ہے، عقیدۂ ختم نبوت انسان کو پیچھے کی طرف لے جانے کے بجائے آگے کی طرف لے جاتا ہے، وہ انسان کے سامنے اپنی طاقتوں کو صرف کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے، وہ انسان ہمیشہ تذبذب و بے اعتمادی کے عالم میں رہے گا، وہ ہمیشہ زمین کی طرف دیکھنے کے بجائے آسمان کی طرف دیکھے گا، وہ ہمیشہ اپنے مستقبل کی طرف سے غیر مطمئن اور متشکک رہے گا، اس کو ہر مرتبہ ہر نیا شخص یہ بتلائے گا کہ گلشنِ انسانیت اور روضۂ آدم ابھی تک نامکمل تھا، اب وہ برگ و بار سے مکمل ہوا ہے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ جب اس وقت تک یہ نامکمل رہا تو آئندہ کی کیا ضمانت ہے؟ اس طرح وہ بجائے اس کی آبیاری اور اس کے پھلوں اور پھولوں سے متمتع ہونے کے نئے باغبان کا منتظر رہے گا، جو اس کو برگ و بار سے مکمل کرے''۔ (۱)(۲)

---

(۱) قادیانیت: ۱۵۱-۱۵۳

(۲) اخذ و تلخیص: ☆ منصب نبوت: ۲۰۵-۲۰۶ ☆ قادیانیت: ۱۵۱-۱۵۳

باب چہارم

حقائق وعبر

اللہ کی کتاب قرآن مجید

وحی کا وہ تنہا مجموعہ ہے، جو اس وقت پوری اصلیت کے ساتھ انسانوں کے ہاتھ میں ہے اور جو ہدایت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے، جس کی طاقت اب بھی......... پوری دنیا کے دلوں کو گرما سکتی ہے، جس کے مضامین وعلوم کی وسعت اب بھی وقت کی ضروریات ومسائل پر حاوی ہے، جو انتہائی بلند اور خدائی علم کے شایانِ شان ہونے کے باوجود عام فہم اور ہر وقت قابل عمل ہے، جس کی زبان ابھی دنیا میں زندہ ہے اور جس کے الفاظ کی تشریح کے لیے کسی قیاسی اور تاریخی اکتشاف کی ضرورت نہیں"

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

(مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں:۱۱۴)

وہ خدا کی ذات ہے ہر شئی ہے جس کے ہاتھ میں

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ. بِيَدِكَ الْخَيْرُ. إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ. وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (آل عمران. ۲۶-۲۷)

”کہو کہ اے خدا (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے (اور) بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے، تو رات کو دن میں داخل کرتا اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بیجان پیدا کرتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق بخشتا ہے“۔

اللہ تبارک وتعالی کی کارسازی کہ میں نے بارہا تجربہ کیا ہے کہ جب یہ اندازہ ہوا کہ ناطقہ سر بہ گریباں ہے اور عقل انگشت بدنداں ہے، وہاں قرآن نے مشکل کشائی کی، اس موقع پر بھی قرآن ہی نے دستگیری کی، خدا اس پڑھنے والے کو جزائے خیر دے کہ جس نے سورۂ آل عمران کی یہ آیتیں پڑھیں، مجھے درد کی دوا مل گئی، مجھے ہر سوال کا جواب مل گیا، مجھے

ہر مایوسی کا ازالہ، ہر مایوسی کا تریاق مہیا ہوگیا، اس کے بعد نہ مایوسی کی ضرورت، اس کے بعد نہ اس کی ضرورت کہ دل کے سوٹکڑے ہوں، اللہ نے اس آیت میں، درد بھی دیا اور دوا بھی دی، سوال بھی ہے اور جواب بھی ہے۔

خوشا بخت شور ید گان غمش
اگر ریش بینند د گر مرہمش

جہاں زخم ہے، وہاں مرہم بھی ہے اور وہ مرہم غالب ہے، درد سے بڑھ کر دوا ہے اور مرض سے بڑھ کر علاج ہے، امتوں کے لیے اور قوموں کے لیے تہذیبوں کے لیے، صلاحیتوں کے لیے صلاحیت رکھنے والے انسانوں کے لے خاص طور پر دعوت و پیغام رکھنے والے انسانوں کیلیے خاص طور پر دعوت و پیغام رکھنے والی ملتوں کے لیے اس میں سب کچھ موجود ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے "قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ" پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی اتنا بلند ہوتا ہے کہ فلاں قوم اس صلاحیت کی، اس معیار کی وہ برسر عروج تھی، ایک دوسری قوم آئی جو وہ صلاحیت نہیں رکھتی تھی، اس کو کہاں سے یہ استحقاق تھا اور اس نے یہ کہیے، یہ انقلاب لے آئی اور کس طریقہ سے وراث بن گئی اور یہ تخت سلطنت کس نے بچھایا تھا اور کون اس پر بیٹھ گیا، سب کا جواب دیدیا ' ' قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ" کوئی ہے ہی نہیں، کہاں کا، کس کے ہاتھ سے کس ہاتھ کی طرف گیا، نہ کسی ہاتھ نے دیا، نہ کسی ہاتھ نے لیا۔

کار زلف تست مشک افشاں اما عاشقاں
مصلحت را بر آہو چنیں بستہ اند

یہ تو اسی قدرت کے کھیل ہیں، اس میں کسی کی کوئی خوبی ہے اور نہ اس میں کسی کمال و قابلیت کو دخل ہے یہ تو وہ دینے والا اور وہ دلانے والا ہے، اس نے ایک ہاتھ سے لیا اور دوسرے ہاتھ کو دے دیا، اس میں بڑی تسکین کی چیز ہے کہ جب دو بچے بیٹھے ہوں تو ان میں کوئی بڑا ایک بچے کے سر سے اتار کر ٹوپی دوسرے کے سر پر رکھ دے، تو اس میں حیرت

کی کوئی بات نہیں، نہ بچے کی شکایت کرنی چاہیے، نہ اس کو فخر کرنا چاہیے کہ اس کے سر پر ٹوپی آئی اور جو ہاتھ اس سر سے اتار کر اس سر پر رکھ سکتا ہے، وہ اس سر پر بھی اتار کر دوسرے سر پر رکھ سکتا ہے، تو فرمادیا "قُلِ "اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ" اے اللہ، اے سلطنتوں کے حقیقی مالک، جیسا کہ اقبال نے کہا ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے ایک وہی باقی بتاں آذری

"تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ"" تیرے اختیار میں ہے، تو جس کو چاہے سلطنت سے نوازے" یہ نہیں کہا کہ یہ لیتا ہے اور وہ دیتا ہے، وہ ہارا اور وہ جیتا، نہ کسی کی ہار نہ کسی کی جیت، "تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ" تو جس کو چاہے سلطنت عطا فرمادے اور "من تشاء" مطلب یہ کہ اس میں اس کی قابلیت ہی کو دخل نہیں ہے کہ یہ سمجھے کوئی بڑی قابلیت کی قوم ہے کہ فلاں قوم دیکھئے صدیوں سے حکومت کر رہی تھی اور کیسا بے دخل کر دیا تو فرمایا "قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکَ" اے سلطنت کے حقیقی مالک "تؤتی الملک من تشاء" جس کو تو چاہے سلطنت دیدے۔ "وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ" اور جس سے چاہے ان کی آن میں، پلک جھپکانے میں سلطنت چھین لے"۔

"اور تاریخ بتاتی ہے کہ ہزاروں برس کی شہنشاہیاں جن کا ڈنکا بج رہا تھا دنیا میں، جن کا طوطی بول رہا تھا، جن کے والیانِ سلطنت کی ایک نگاہ پڑ جانا سمجھا جاتا تھا کہ گویا "ہُما" اس کے سر پر بیٹھ گئی اور وہ جس کے سر پر سے ہو کر اڑ گئی، اس کی تقدیر بدل جاتی تھی، مٹی پر ہاتھ رکھ دیں تو سونا ہو جائے، پلک جھپکاتے میں اللہ نے ان کی سلطنتوں کا آفتاب غروب کر دیا اور ایسا غروب کیا کہ اس کے بعد کبھی طلوع نہیں ہوا، رومۃ الکبریٰ کی تاریخ بتاتی ہے، گبن (GIBBON) کی کتاب زوال وسقوط روما (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) آپ پڑھ لیجئے کہ وہ کیا سلطنت تھی، کیا شہنشاہیت تھی، کس طرح اس کو زوال ہوا، ساسانی سلطنت کی تاریخ پڑھئے کہ کیسا اس کا ڈنکا بجتا تھا، اس کا دُرفش کادیانی اور اس کی آتشِ مقدس، ہندوستان کی سرحدوں تک اس کی

سلطنت پہونچی ہوئی تھی، اس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے "فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّق" (سبا:۱۹) ہم نے اس کو افسانۂ پارینہ بنادیا اور اس کے ٹکڑے ٹکرے کردئے"۔(۱)

"وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُوَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ" اور جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے، دیکھئے "مــن تشــاء" ہرایک کے ساتھ لگ رہا ہے، تاکہ کہیں شک کی بو نہ آجائے، اس کے خیال میں یہ آئے کہ اس کا کمال، اس کا عیش، یا اس کی شامت اعمال تو بیشک اس کا بھی ایک اصول ہے خدا کے یہاں، لیکن کوئی حقیقی کرنے والا ہے، فاعل حقیقی کوئی اور ہے "وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ" پھر اس کے بعد اگر کسی کو یہ خیال ہو کہ بس ایک مرتبہ یہ الٹ پھیر ہو گیا اب کیا ہوگا، اب قسمتوں پر مہر لگ گئی تو جواب ملتا ہے "بِيَدِكَ الْخَيْرُ" تیرے ہاتھ میں مستقل خیر ہے، ایک دن دو دن کی خیر نہیں، سو پچاس کی خیر نہی "الـخيـر" جس کا نام ہے، "جنس خیر" تیرے ہاتھ میں ہے، "خیـر" جس پر خیر کا اطلاق ہوتا ہے، وہ "الخیر" کل کا کل تیرے ہاتھ میں ہے

"اِنَّكَ عَلىٰ كُلِّ شَئٍي قَدِيْرٌ" اگر کوئی یہ کہے کہ ایک ہی بار ہوا تو غلط۔ "اِنَّكَ عَلىٰ كُلِّ شَئٍي قَدِيْرٌ" تو ہر چیز پر قادر ہے، اور اگر کوئی یہ سمجھے کہ صدیوں میں یہ انقلاب ہوا کرتا ہے، تو اب صدیوں میں ہی یہ انقلاب ہوگا، تو فرماتا ہے "تُوْلِجُ اللَّيْلَ فِيْ النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِيْ اللَّيْلِ" "تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے" کھیل تو یہ روز ہوتے ہیں۔ "وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ" اور کوئی یہ سمجھے کہ اب زوال پذیر قوم سے کوئی اقبال مند قوم ظاہر نہیں ہوسکتی اور صاحب اقبال قوم میں اب کوئی تبدیلی نہیں آسکتی تو فرماتا ہے نہیں "تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ" مردے سے زندہ کو نکالے اور زندہ سے مردہ کو برآمد کرے"۔

"اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کو ہر وقت اختیار ہے، اس کو غالب کو مغلوب اور مغلوب کو غالب، مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کرتے کچھ دیر نہیں لگتی،

(۱) قرآن کا مطالبہ: ۱۳-۱۴

اس کیلیے کسی وقت کی کوئی قید اور ساز گار حالات کا انتظار نہیں وہ دن رات ایسے تصرفات کیا کرتا ہے''۔ (۱)

''وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٌ'' جس کو تو چاہے بے حساب دیدے، وہاں راشن تنگ نہیں ہے کہ بس صاحب اتنا، اتنا کہ اس سے زیادہ نہیں مل سکتا، دینے پر آئے تو جھولی بھردے اور نہ دینے پر آئے تو دانہ دانہ کو ترسائے۔

یہ آیت ہے جس نے مجھے سہارا دیا اور ہمت پیدا ہوئی کہ آپ کے سامنے کچھ کہوں، بس اس سے زیادہ کوئی مکمل اور جامع پیغام نہیں ہوسکتا تو بھائی اللہ تعالیٰ ہر خیر کا مرکز ہے، خیر کا خالق بھی ہے اور خیر کا مخزن بھی ہے، ''اِلَيْهِ يَرْجِعُ الاَمْرُ كُلُّهُ'' اور اسی سے ابتدا ہے اور اسی پر انتہا ہے، اور اصل میں یہ سب اسی کے ارادہ کے تابع ہیں''۔ (۲)(۳)

---

(۱) مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی: ۸۹

(۲) خطبات مفکر اسلام (جلد سوم): ۱۷۷-۱۸۳

(۳) مشترک اخذ وتلخیص: ☆ قرآن کا مطالبہ: ۱۳-۱۴ ☆ مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی: ۸۹ ☆ خطبات مفکر اسلام (جلد سوم): ۱۷۷-۱۸۳

فکر و عمل کے دو نظام

نفس پرستی اور خدا پرستی

﴿ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ أَمَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ . وَاللّٰهُ لَا يَهْدِيْ الْقَوْمَ الظَّالِمِيْنَ ﴾ (التوبة: ۱۰۹)

”بھلا وہ کہ جس نے اپنی امارت کی بنیاد رکھی اللہ کے خوف ورضا پر، زیادہ بہتر ہے یا وہ کہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایسے بودے اور ڈھے جانے والے گڑھے کے کنارے رکھی اور اس کو لے کر گر گیا اور ڈھیر ہو گیا جہنم کی آگ میں اور اللہ تعالیٰ غلط اور بے محل کام کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا“۔

دو عملی مثالیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو عمارتوں کی مثال دی ہے اور دونوں کا مقابلہ کیا ہے، ایک وہ عمارت جس کی بنیاد سنگین، غیر معمولی، مستحکم اور غیر متزلزل پتھروں پر رکھی گئی ہو، جو بڑے بڑے طوفان سے بھی ہل نہ سکے، وہ بنیادی پتھر اور اندر کی نیو اللہ کا خوف ولحاظ اس کی شرم اور اس کی رضا اور خوشی کی طلب ہے، ”أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلَىٰ تَقْوَىٰ مِنَ اللّٰهِ

وَرِضْوَان" ان بنیادوں پر جو عمارت بھی اٹھائی جائے گی، وہ ایک سنگین حصار ہوگی، جس کو کہیں سے جنبش نہیں دی جاسکتی۔

"أَسَّسَ بُنْيَانَهُ عَلىٰ شَفَا جُرُفٍ هَار" اس کے بالمقابل وہ عمارت ہے، جس کی بنیاد نہایت بودے اور ڈھے جانے والے گڑھے کے کنارے اور ایسی ریتیلی اور نرم زمین پر رکھی گئی ہو کہ ذرا بھی بوجھ پڑے تو وہ عمارت خود ہی نہیں بلکہ اپنے مکینوں کو لے کر بیٹھ جائے۔

یہ دو ایسی عملی مثالیں ہیں، جس کے سمجھنے کے لیے کسی بڑی ذہانت کی ضرورت نہیں، ہم کو آپ کو رات دن ایسی عمارتوں سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے اور خاص طور پر شہر تو نام ہی ہے سنگین اور مستحکم عمارتوں کا جس کی بنیاد کو پتھروں اور زنجیروں سے مستحکم کیا گیا ہو، آپ اس پر دو منزل، تین منزل کی بھاری عمارتیں تعمیر کر سکتے ہیں اور جہاں تک چاہیں اس کو بلند کر سکتے ہیں، پھر کتنی ہوا چلے، طوفان آئے، وہ اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح جمی رہی ہے اور ٹس سے مس ہونے کا نام نہیں لیتی، اس کے بالمقابل شہر سے قریب دیہاتوں میں چلے جایئے، وہاں آپ کو ایسی عمارتوں سے واسطہ پڑے گا، جو غیر مستحکم اور نرم زمین پر تعمیر کی جاتی ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جلد ہی زمین بوس ہو جاتی ہیں۔

نہایت پختہ عقیدہ

یہ دراصل زندگی کے دو نظام ہیں زندگی ہی کے نہیں، فکر و عمل کے دو نظام ہیں، ایک وہ جس کی بنیاد "عَلىٰ تَقْوىٰ مِنَ اللهِ وَرِضْوَان" خدا کے خوف و رضا عقیدہ و خلوص اور علم و عمل کی مطابقت پر ہے، اس کائنات کو کس نے پیدا کیا، کون سیاہ وسپید کا مالک ہے، کون دولت دیتا ہے؟ کون افلاس وفقر میں مبتلا کرتا ہے؟ کس کے ہاتھ میں ہماری جان ہے؟ اور کون ہماری قسمت کا مالک ہے؟ ایک نہایت پختہ عقیدہ پر اس کی بنیاد ہوتی ہے اور جو اس عقیدہ کو قبول کرتا ہے، اس کی زندگی از اول تا آخر اس کے مطابق ہوتی ہے، وہ زندگی کا ہر لمحہ خدا کی نگرانی میں گذارتا ہے اور روز و شب، روشنی و تاریکی، شہر و جنگل خلوت و جلوت ہر حالت میں خدا کو حاضر و ناظر سمجھتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید اور

اسرار کو بھی جانتا ہے "یَعْلَمُ خَائِنَةَ الأَعْیُنِ وَمَا تُخْفِیُ الصُّدُوْرِ (المؤمن: ۱۹) "مَا یَکُوْنُ مِنْ نَجْوىٰ ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلاَ خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلاَ أَدْنىٰ مِنْ ذٰلِکَ وَلاَ أَکْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَمَا کَانُوْا" (المجادلة. ٦) وہ اس کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر وہ کوئی کام کرے گا چاہے اس کو کوئی دوسرا دیکھے یا نہ دیکھے، آخرت میں اس کا بدلہ مل کر رہے گا، اس لیے کہ وہ یہ کام جس کے لیے کرتا ہے، وہ ہر چیز سے واقف ہے، چنانچہ مسلمان جو کام کرتا ہے، اس میں وہ اس کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی کسی کو خبر نہ ہو، حدیث شریف میں صدقہ کو چھپا کر دینے والوں کے سلسلہ میں آتا ہے کہ "حَتّىٰ لاَ تَعْلَمُ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ یَمِیْنُهُ" اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان بڑے بڑے امتحان میں کامیاب ہو جاتا ہے، اس کے ہاتھ میں جو کچھ آتا ہے وہ اس کو امانت کے ساتھ پہنچا دیتا ہے، اس میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کرتا اور نہ اس کا تصور تک کرتا ہے کہ وہ اس میں خیانت کرے۔

لیکن یہاں یہ حال ہے کہ جو جس کے ہاتھ لگتا ہے، وہ اس کو نہ صرف چھپا لیتا ہے، بلکہ شیر مادر کی طرح اس کو ہضم کر لیتا ہے، اس میں افسر اپنے ماتحت سے اور ماتحت اپنے افسر سے، بڑا اپنے چھوٹے اور چھوٹا اپنے بڑے سے چھپا لیتا ہے کہ کہیں کسی کو خبر نہ ہو اور مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ میدان جنگ میں ان کے ہاتھ لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کی مالیت کا تاج آجاتا ہے اور وہ اس کو چھپا کر امیر کے خیمے میں لے جاتا ہے، وہ اس لیے نہیں چھپا رہا ہے کہ اس نے چوری کی ہے، بلکہ اس لیے چھپاتا ہے کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ دے کہ کتنا بڑا شیر مرد ہے کہ اتنی بڑی مالیت کا سامان لے کر امیر کو دینے جارہا ہے، اس لیے وہ چھپا کر امیر کو دے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ مال میرے ہاتھ آیا تھا، یہ مسلمانوں کا مال ہے، امیر حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور ان سے پوچھتا ہے کہ آپ کا نام کیا ہے، آپ کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ میں نے جس کے لیے یہ کام کیا ہے وہ میرا نام بھی جانتا ہے اور قبیلہ کو بھی جانتا ہے، پھر وہ چھپ کر چلا جاتا ہے، چوروں کی طرح، لیکن شاہوں کا بادشاہ بن کر تاکہ کوئی اس کے کام سے

واقف نہ ہو جائے، آخر امیر اس کے پیچھے پیچھے ایک آدمی کو بھیجتے ہیں تب جا کر پتہ چلتا ہے، یہ اس علم اور اس نظام تعلیم کا نتیجہ تھا کہ دل میں گناہ کی کھٹک ہوتی تھی تو ان کے لیے زندگی کا گذار نا مشکل ہو جاتا تھا اور راتوں کی نیند اڑ جاتی تھی، کھانا پینا حرام ہو جاتا تھا، گناہ کے بعد وہ عذاب آخرت کا تصور کر کے کانپ جاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر عرض کرتے تھے کہ یا رسول اللہ "طَهِّرْ نِيْ" یہ پاک کرنا پانی سے نہیں ہوتا تھا، بلکہ سنگساری کر کے ایسی سنگساری جس میں موت ہو جاتی تھی، اس سخت سزا کے باوجود وہ اصرار کرتے تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ ان کو مہلت دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ جاؤ فلاں مرحلہ بھی پورا کرلو، اس کے بعد وہ اللہ کی بندی پھر آتی تھی اور کہتی تھی، کہ یا رسول اللہ "طَهِّرْ نِي"

یہ نتیجہ اس علم کا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اعلان کرتے ہیں کہ دودھ میں کوئی ملاوٹ نہ کرے، "ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات میں گشت پر نکلتے ہیں تو ایک گھر سے آواز آتی ہے کہ بیٹی دودھ میں پانی ملا دو، بیٹی جواب دیتی ہے کہ ماں جان! آپ نے امیر المؤمنین کا اعلان نہیں سنا؟ ماں نے کہا کہ رات کا وقت ہے، اس وقت کون دیکھتا ہے؟ وہ بیٹی جواب دیتی ہے کہ جس نے عمرؓ کے عہد مبارک میں آنکھ کھولی تھی کہ اگر امیر المؤمنین نہیں دیکھ رہے ہیں تو کیا ہوا، خدا تو دیکھ رہا ہے" (آج تو خالص دودھ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں، اب تو ڈیری کا دودھ بھی خالص نہیں ہوتا ہے، اس میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے اور کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں سے کریم نکال دی گئی ہے)۔

جو کچھ خدا کے رسولؐ نے بتایا اس کو مضبوطی سے پکڑ لیا کہا یہ کفر ہے، اس سے ساری عمر بچتے رہے، کہا یہ گناہ ہے، اس سے بھاگتے رہے، جنت کا یقین، جہنم کے عذاب کا تصور آخرت کی زندگی پر یقین، خلوص، صداقت، امانت و دیانت خدا کا خوف اور اس کی رضا کا حصول یہ ان کی زندگی کا مقصد تھا، خدا کا خوف ان کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا، اللہ کے لیے علم سیکھتے تھے اور اللہ ہی کے لیے سکھاتے بھی تھے، وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر علم حاصل کرتے تھے اور اسی طرح سکھاتے تھے، وہ کوئی معاوضہ یا بدلہ

لینے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔[1]

نفس پرستی آج کے نظام تعلیم کی بنیاد

آج کا حال یہ ہے کہ جتنا پڑھا لکھا انسان ہے، اتنا ہی وہ ڈرنے کے قابل ہے، آج پوری دنیا میں پڑھے لکھے بھیڑیوں کا راج ہے، ایسے بھیڑیوں کا جو دوسرے کے جسموں سے کپڑے اتار لیتے ہیں، تاکہ اپنی دیوار کو پہنائیں، جو دوسروں کے بچوں اور یتیموں کے بچوں کے آگے سے کھانا اس لیے چھین لیتے ہیں۔

کہ ان کے کتوں کا پیٹ بھر سکے، بددیانتی، خود غرضی مطلب پرستی، نفس پرستی پر آج کے پورے نظام تعلیم کی بنیاد ہے،

آج کے نظام تعلیم کا نتیجہ ہمارے کارپوریشن کے ممبران اور حکومت کے کارندے ہیں، اس نظام تعلیم نے یہ نہیں سکھایا کہ خدا کیا ہے، جس نے یہ سکھایا ہے کہ جہاں اپنی عزت کا سوال ہو، جہاں تم کو ذاتی نفع ہو رہا ہو، وہاں اس نفع کو حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن اور اپنی عزت کو نیلام کردو، اسی وجہ سے آج انسان انسان کا سودا کر رہا ہے، آج انسان بک رہا ہے، پارٹیاں بک رہی ہیں، تیس چالیس برس کی وفاداریاں بک رہی ہیں، آج ہماری پارلیامنٹ اور اسمبلیاں نخاس کی طرح ہوگئی ہیں، جہاں خلیج بنگال سے لے کر پنجاب تک لوگ بھیڑ، بکریوں اور خربوزوں کی طرح بک رہے ہیں، یہ سب اسی نظام تعلیم کا لازمی نتیجہ

---

(۱) ایک دمشقی عالم درس دے رہے تھے، ان کے پاؤں میں تکلیف تھی، اس لیے پاؤں پھیلائے ہوئے تھے کہ خدیو مصر کے صاحب زادے محمد علی (جو اپنے زمانے کا ظالم و جابر اور سخت گیر فرمانروائے شام تھا) اچانک ان بزرگ کے پاس آیا، مگر ان بزرگ نے پاؤں نہیں سمیٹے اور وہ اسی حال میں قال اللہ وقال الرسول کی صدا بلند کرتے رہے، ان کے شاگردوں نے خوف کے مارے کپڑے سمیٹنے شروع کر دیئے کہ اب خدا جانے کیا حکم نازل ہوگا اور ہم سب کی گردنیں اڑادی جائیں گی، مگر وہ بزرگ سب سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہے، محمد علی دیر تک کھڑا رہا، پھر وہاں سے چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد اپنے خادم کے ہاتھ اشرفیوں کی ایک تھیلی بھیجی اور درخواست کی کہ اس کو قبول فرمالیا جائے، ان بزرگ نے جو جواب دیا وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''آقا سے سلام کہنا اور کہنا کہ جو شخص اپنا پاؤں پھیلاتا ہے وہ اپنا ہاتھ نہیں پھیلا سکتا''۔

ہے، جس کی حقیقت اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان کی ہے ﴿ اَسَّسَ بُنۡیَانَہٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ ھَارٍ فَانۡھَارَ بِہٖ فِی نَارِ جَھَنَّمَ ﴾ جس کی بنیاد ہی عناد وسازش اور ضمیر فروشی اور خودغرضی پر پڑی ہے۔

اور دوسرا وہ نظام تعلیم ہے، جس کی بنیاد "عَلٰی تَقۡوٰی مِنَ اللّٰہِ وَ رَضۡوَانٍ" پر ڈالی گئی ہے، آج بھی اسی طرح کی دو عمارت اور دو عبادت گاہیں جہاں دو طرز فکر کام کر رہے ہیں، ایک عبادت گاہ میں خدا کی صفات کا پرتو پیدا کیا جاتا ہے، مثلاً اللہ کی ذات غنی ہے، تو انسان کو مستغنی ہونا چاہیے، اسی طرح اللہ کی صفت شفقت ورافت ہے، تو انسان کو بھی شفیق ورحم دل ہونا چاہیے، اس کے اندر استغناء خلوص ومحبت جرأت وہمت، حق گوئی و بے باکی، نزاہت وپاکیزگی کی اعلیٰ صفات ہونی چاہئیں اور یہی اس نظام تعلیم کی روح اور اس کا جوہر ہے"۔ (١)

(١) تلخیص از: تکبیر مسلسل: ٣٠٧-٣١٤۔

رسوا کیا ہر دور کو جلوت کی ہوس نے

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلاً وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ﴾
(القصص: ۵۸)

''اور ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے جو سامانِ عیش پر نازاں تھیں، سو ان کے یہ گھر ہیں کہ ان کے بعد آباد ہی نہیں ہوئے، مگر تھوڑی دیر کے لیے اور آخر کار ہم ہی مالک رہے''۔

ملکوں اور قوموں کی تباہی کا سبب

کسی معاشرے، ملت یا ملک میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آجائے جو ہر چیز میں عوام سے الگ ہو، وہ اپنی دنیا خود بنائے اور اسی دنیا میں عمر بسر کر دے، زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا معیار عوام سے بلند ہو، جہاں ایک روپے سے کام چلتا ہو، وہاں سو روپے سے کام چلائے، جو کام سادہ طریقے پر ہوتا ہو، وہ دھوم دھام اور نہایت تزک و احتشام کے ساتھ انجام دیا جائے، ہر چیز میں نام و نمود اور عزت و وجاہت پیش نظر ہو، جب مسرتوں اور شادیوں کا موقع آئے تو تھیلیوں کے منہ کھول دئے جائیں اور دولت پانی کی طرح بہائی جائے اور اس میں ایسی شان و شوکت کا اظہار ہو کہ شہر میں ہفتوں اور مہینوں اس کے چرچے رہیں اور اپنی خیالی دنیا میں پوری عمر گذار دی جائے اور عوام پر جو کچھ گزرتی ہے اور جن

مصائب ومشکلات سے دن رات ان کا سامنا ہے، ان کی اس طبقہ کو ہوا بھی نہ لگے، کسی دینی تحریک اور کسی اصلاحی کوشش سے قطعاً کوئی دل چسپی نہ ہو، ساری دلچسپیاں اپنے، اپنی اولاد اور اپنے ذاتی مفادات تک محدود ہوں، جس کام سے شہرت عزت حاصل ہوتی ہو اور حکومت وسوسائٹی کی نگاہ میں وقعت بڑھ سکے، اس کیلیے اشرفیوں کی لوٹ ہو اور جس کام سے یہ مقصد حاصل نہ ہوتا ہو اس کے لیے کوئلوں پر مہر ہو، اخلاقیات میں جو بات عوام کے لیے ناجائز ہے، اس طبقہ کے لیے جائز، جو بات ان کے حق میں عیب، اس کے حق میں ہنر ہے،... اس طبقہ کا عروج، اس کی بے عنوانیاں، اس کی اخلاقی انارکی، اس کا آزادانہ طریقے سے داد عیش دینا اور ہر قسم کے حدود وقیود کو پھلانگ جانا، اور اس کی خرمستی، ملکوں اور قوموں، شہروں اور بستیوں کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی بستی کی تباہی کے دن آتے ہیں، اور اس کا پیمانۂ حیات لبریز ہو جاتا ہے، تو پہلے اسی طبقے میں بگاڑ آتا ہے اور وہ اپنے اعمال واخلاق سے عذاب خداوندی کو دعوت دیتا ہے اور پوری پوری آبادی پر مصیبت لے آتا ہے، قرآن مجید اپنے خاص اسلوب میں فرماتا ہے "وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا" اور ہم نے کتنی بستیاں ایسی ہلاک کر دیں، جو اپنی گذران پر، اپنے وسائل زندگی پر، اپنی معیار زندگی پر اترا گئی تھیں، اترانے لگی تھی، مست تھی اور تکبر ان میں پیدا ہو گیا تھا، "بطرت" کا لفظ بھی ایسا ہے کہ جس کا ترجمہ اردو میں مشکل ہے، وہ لفظ کی قوت ہوتی ہے، ٹمپریچر ہوتا ہے، "بطر" کا لفظ ایسا ہے کہ بہت مشکل ہے کہ اردو میں ترجمہ کیا جائے، اترانے لگی تھیں اور پھولے نہیں سماتی تھی اور دعوے کرنے لگی تھی، "بطرت معیشتها" اپنی زندگی پر وہ اب اترانے لگی تھی، ان کو اب کسی اصلاح کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی، کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی، کسی پر رحم کھانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی اور کوئی ڈر ان کو نہیں معلوم ہوتا تھا یہی ہوتا ہے، جب تمدن ترقی کر جاتا ہے، جیسے جو سرمایہ دار ملک ہیں، جہاں بڑی صنعتیں ہیں اور جہاں تمام دنیا کو مال جاتا ہے اور دنیا پر ان کی تجارتی حکمرانی ہے، وہاں بھی حالت یہی ہے کہ "بطرت معیشتها" وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کوئی

کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ جب یہاں پر ہندوستان میں بائیکاٹ کیا گیا ودیشی مال کا، تو ذرا سا ان کو خیال آیا کہ اچھا یہ بھی ہوسکتا ہے نقصان محسوس ہوا۔

ترقی وزوال کا ابدی قانون

''تاریخ بھی بتاتی ہے کہ دنیا میں کئی ایسی مستحکم سلطنتیں اور ترقی یافتہ تہذیبیں گذری ہیں جن کا دنیا میں طوطی بولتا اور ڈنکا بجتا تھا، لیکن ان میں مرور زمانہ سے ذہنی انتشار، اخلاقی زوال وانحطاط رونما ہوا، نفس پرستی، دولت پرستی کا لاوا پھوٹ پڑا، انسانی حقوق پامال اور عزت وآبرو خاک میں ملائی جانے لگی، خواہشاتِ نفس کی تسکین اور ذاتی مفادات کی تکمیل پر ذہانتیں اور عملی طاقتیں صَرف کی جانے لگیں، مذہبی تعلیمات اور اخلاقی قدروں سے بالکل آنکھیں بند کرلی گئی، بلکہ ان کا مذاق اڑایا جانے لگا، محلون اور کوٹھیوں میں دادعیش دی جارہی تھی اور انگریزی مثال کے مطابق ''روم جل رہا تھا'' اس زمانہ میں بھی بڑے بڑے تھینکر، فلاسفر، ادیب وشاعر اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے، وہ اپنے جوہر دکھار ہے تھے اور لوگوں کو اپنی فنی مہارت اور ادبی کمالات سے مسحور کررہے تھے، لیکن معاشرہ بگڑا ہوا تھا، بازاروں میں فساد تھا، سڑکوں پر فساد تھا، خاندانوں میں فساد تھا، مختلف طبقوں میں فساد تھا، جب فساد کی یہ اندھی چلی تو رومن ایمپائر بھی جو اپنے قانون ROMAN LAW اپنے نظم ونسق ADMINISTRATION اپنی وسیع فتوحات اور شاندار نوآبادیاں اور ترقی یافتہ تہذیب اور بلندی معیار زندگی کی بنا پر دنیا میں ضرب المثل تھا، اس سب کے باوجود خالقِ کائنات کے مقرر کردہ ترقی وزوال اور موت وحیات کے ازلی وابدی قانون سے بچ نہیں سکا، [1] جس کی قرآن کریم نے تصویر کھینچی ہے۔

''وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا'' ''اور ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کرچکے جو اپنے سامانِ عیش پر نازاں تھیں'' جن کو بڑے بڑے دعوے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم لازوال ہیں، ہماری عیش وعشرت لازوال ہے، ہمارا اطمینان لازوال ہے، ہمارا امن وامان لازوال ہے، ہمارا معیار زندگی لازوال ہے۔

(۱) ۱۱/۹۔ ۷ کے حادثہ میں بھی اس کی عبرتناک مثال ہے۔ (مرتب)

کارِ جہاں بے ثبات

"فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلاً" دیکھ لو یہ ان کے مساکن ہیں "لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلاً" اس کے بعد برائے نام وہاں آبادی کی نوبت آئی، کچھ لوگ رہنے لگے، یہ مدین کے راستے میں پڑتا ہے، جب شام سے چلا جائے اور عراق کی طرف ہو یا جائے، تو قوم ثمود کے، حضرت صالح علیہ السلام کے اگر ادھر سے آئے، نجد کی طرف رخ ہو اس کا اور شام سے چلے، تو ثمود کی بستی پڑے گی، قوم لوط کی، تو اس طرح اکثر قرآن مجید میں ان قوموں کا انتخاب کیا گیا ہے عبرت کے لیے کہ جو جزیرۃ العرب سے نسبتاً قریب تھی اور جن سے واقفیت تھی اور یہ سب شام و فلسطین کا علاقہ ہے، یا پھر الربع الخالی جو عاد کی جگہ تھی، وہ جزیرۃ العرب میں ہے۔

"وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِيْنَ" "اور ہم ہی وارث تھے" ہم جو چاہتے اس کو کرتے، یعنی ہم ہی مالک تھے، ہم جس کو چاہیں بسائیں، جتنی دیر تک چاہیں بسائیں اور جب چاہیں اجاڑ لیں۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۂ قصص: ۵۸ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ: ☆ ملت میں ان کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں: ۵-۹ ☆ ملک کی نازک صورتحال اور محبانِ وطن کی ذمہ داری: ۸-۹، سے مشترک طور پر اخذ و استفادہ کیا گیا ہے۔

ہنگامہ ہے کیوں برپا یہ شور کیوں مچا ہے....؟

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ (الروم: ۴۱)

''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے، تاکہ خدا ان کو ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھائے، عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں''۔

عالمگیر فساد

اس وقت تمام دنیا میں سخت اختلاف ہے، روزمرہ کی جو حقیقتیں سورج کی طرح روشن ہیں اور جن میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں، ان میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، کوئی دعویٰ ایسا نہیں جس کی ہر جگہ سے، ہر ادارہ سے اور ہر مکتب خیال سے تائید ہو۔ ایسی کوئی حقیقت نہیں جس پر سب کے سب متفق ہوں، لیکن ایک بات ایسی ہے ہر طرف سے اس کی آپ تائید سنیں گے، اور جہاں جائیں گے، آپ اس کی صدائے بازگشت پائیں گے وہ یہ ہے ''ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ'' '' اس وقت دنیا میں ایک عالمگیر فساد برپا ہے اور ایسا بگاڑ ہے جس سے دنیا کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے'' یہاں تک کہ جو ملک اپنی مادی ترقی کے نقطۂ عروج پر پہنچ گئے ہیں، وہاں بھی اگر آپ جائیں گے تو اسی کا رونا پائیں گے، کوئی مجلس، کوئی جلسہ، کوئی کتاب، کوئی مباحثہ؟ کوئی مذاکرہ، کوئی غور وفکر کا حلقہ اس سے خالی نہیں، دنیا کے ایک سرے

سے دوسرے سرے تک سفر کر جائیے، ہر جگہ آپ اسی کا شکوہ پائیں گے کہ "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ". "بگاڑ بہت پھیل گیا ہے اور دنیا میں ایک عالمگیر فساد برپا ہے"۔

وہ حقیقت ہے جس پر قریب قریب اس وقت دنیا کے تمام سوچنے اور سمجھنے والے، یہاں تک کہ جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ بھی متفق ہیں، جو کتابوں کے پڑھنے والے ہیں، وہ کتابوں کے واسطہ سے جانتے ہیں، جن لوگوں کو اس کا اتفاق نہیں ہوتا، یا اس کی فرصت نہیں ملتی، ان کے کانوں میں بھی یہ بات پڑتی رہتی ہے، ہمارا ملک ہو یا کوئی باہر کا ملک، یورپ ہو یا امریکہ، افریقہ ہو یا ایشیاء، اور یہاں تک کہ وہ سرزمین جو خیر و برکت کی سرزمین ہے، وہاں بھی اگر آپ جائیں گے تو اس کا احساس عام پائیں گے کہ "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ"

یہ ایک ایسی الجھی ہوئی ڈور ہے جس کا سرا کسی کو نہیں ملتا، بگاڑ تو ضرور ہے، لیکن بگاڑ کا سبب کیا ہے اور جس قدر اس ڈور کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ الجھتی ہی چلی جارہی ہے، اس لیے کہ سرا ہاتھ میں لینے اور سرا تلاش کرنے کا جو فطری طریقہ ہے اور جو خدا نے بیان کیا ہے وہ کھو گیا ہے اور اس کی کسی کو خبر نہیں۔

دنیا کی سعادت و ہلاکت انسان کے ساتھ وابستہ ہے

حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق اور ان سب لوگوں کے عقیدہ کے مطابق جو خدا کے وجود پر یقین رکھتے ہیں اور خدا کی صفات کا کوئی نہ کوئی تصور ان کے اندر پایا جاتا ہے، وہ سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی اصلاح اور اس دنیا کا فساد، اس دنیا کی سعادت اور اس دنیا کی شقاوت اور اس کا بناؤ بگاڑ، اس کی خوش حالی اور اس کی بربادی سب کو وابستہ کیا ہے، انسان کے ساتھ، انسان اگر اچھا ہے تو یہ دنیا اچھی ہے اور اگر انسان بگڑا ہوا ہے، راستہ چھوڑ چکا ہے، خودکشی پر آمادہ ہے، تباہی و بربادی پر کمر بستہ ہے، اس کو اپنی قیمت معلوم نہیں، وہ خدا کو بھول چکا ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ اپنے کو بھی بھول چکا ہے، اس کو اپنے آغاز و انجام کی خبر نہیں یا فکر نہیں، تو پھر اس دنیا کے بگاڑ کو کوئی

روک نہیں سکتا اور اس بگڑی ہوئی دنیا کو بنا نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے، اپنے ارادہ و اختیار سے، اپنی قدرت سے دنیا کی سعادت و شقاوت کو انسان کے ساتھ وابستہ فرما دیا ہے، خدا کا یہ قانون ہے کہ یہ دنیا انسان کے دم سے ہے، انسان اچھا ہے تو یہ دنیا اچھی ہے، انسان اگر برا ہے، تو یہ دنیا فساد کا گہوارہ ہے، آپ اگر تاریخ میں اس کا سراغ لگائیں گے اور تاریخ کی تاریکیوں میں دور تک جائیں گے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا کا بگاڑ "بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ". " انسان کی وجہ سے ہے" انسان سرچشمہ ہے دنیا کی فلاح وسعادت کا اور انسان سرچشمہ ہے دنیا کی تباہی وہلاکت کا"

فساد کا گہوارہ

اس وقت دنیا کے اندر جو انقلاب آیا ہوا ہے اس کو خواہ کسی عنوان سے بیان کیا جائے وہ یہ ہے کہ انسان کا رخ خیر سے شر کی طرف مڑ گیا ہے، ساری طاقتیں ہیں، لیکن اس کی منزل غلط ہوگئی ہے، وہ چل رہا ہے، چلنا ہرگز بند نہیں ہوا، بلکہ پہلے چلتا تھا، پھر دوڑنے لگا اور اب اڑنے لگا ہے، لیکن کس طرف اڑ رہا ہے، وہ ایک شر کی منزل ہے، انسانیت کشی کی منزل ہے، انسان کو برباد کرنے کی منزل ہے، سب نے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جاہ طلبی میں، اقتدار پسندی میں، حکومت کی کرسی حاصل کرنے میں اپنا سب کچھ داؤں پر لگا دیا ہے، انسانیت کا سارا اثاثہ داؤں پر لگا رکھا ہے، انسانیت کی ساری متاع داؤں پر لگا رکھا ہے، ساری تاریخ داؤں پر لگا رکھی ہے، ساری تہذیب داؤں پر لگا رکھی ہے، انسانیت کی قسمت داؤں پر لگا رکھی ہے اور انسانیت کے ملبہ پر حکومت کی کرسی اگر بچھ سکتی ہے، تو انسان اس کے لیے بھی تیار ہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انسانیت کی لاشوں پر اگر انسان کھڑا ہو کر "اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی" کہہ سکتا ہے تو درجنوں کی تعداد میں نہیں سینکڑوں کی تعداد میں نہیں ہزاروں انسان اس کے لیے تیار ہیں، ان اللہ کے بندوں سے عقل کے دشمنوں سے پوچھا جائے کہ حکومت کا مزہ کیا، کس پر تم حکومت کروگے، پتھروں پر حکومت کروگے، پہاڑوں اور ٹیلوں پر

حکومت کرو گے، ریت کے ذروں پر حکومت کرو گے؟ وہ انسان ہی نہ رہے جن پر حکومت کرنے کا مزہ تھا، جن کو تم حکم دیتے اور وہ تمہارے لیے خون پسینہ ایک کر دیتے، لیکن آج کے انسان کو ان سوالات سے کوئی دلچسپی نہیں، اب تو صرف حکومت مقصود بن گئی ہے اور دماغوں پر مستولی ہو گئی ہے کہ محکوم کی بھی فکر نہیں، یورپ سے امریکا اور امریکا سے ایشیا اور دنیا کے کونہ کونہ میں پھیلا ہوا ہے، جس کے لیے فرعون قرآن میں معیاری انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور دولت کی ہوس جس کے لیے قانون معیاری انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے، امارت کا شوق جس کے لیے ہامان معیاری انسان کے طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ تین زندہ جاوید کردار ہیں، فرعون، ہامان قارون، ان کا سلسلہ ختم نہیں ہوا ؎

نفس مارا کمتر از فرعون نیست
لیک اور عون مارا عون نیست

فرق ہے کہ فرعون کے پاس سارا ساز و سامان تھا اور ہم میں سے کتنے آدمی ہیں جن کے اندر فرعون بول رہا ہے، لیکن ان کے پاس اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ساز و سامان نہیں آج ساری دنیا اس راستہ کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلی جا رہی ہے، جیسے کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ انسان خربوزوں اور تربوزوں کی طرح منڈی میں بک رہے ہیں، پارٹیاں بدلی جا رہی ہیں، عقیدے بدلے جا رہے ہیں، زندگی بھر کے کردار پر، زندگی بھر کی تاریخ پر پانی پھیرا جا رہا ہے، ایک کیمپ سے نکل کر دوسرے کیمپ میں جانے کے لیے تیار ہے، جس سے ساری عمر دوستی رہی اس سے دوستی ختم کر کے ان سے دشمنی کرنے کے لیے تیار ہے، جن سے ساری عمر دشمنی رہی، جن کو ساری عمر برا کہتے تھے ان کو اچھا کہنے کے لیے تیار ہے، جن کو پاؤں تلے روندنے اور مسلنے کے لیے تیار تھے سب کچھ انسان کرنے کے لیے تیار ہے اور جس سے آپ پوچھیں گے اگر وہ صحیح بات کہنے کی ہمت و جرأت رکھتا ہو، منافق نہ ہو تو آپ سنیں گے کہ سب کے دل میں وہی فرعون بیٹھا ہوا ہے اور ساری دنیا کے فساد کا باعث یہی ہے۔[1]

(۱) اصلاحیات (تلخیص): ۱۵۳-۱۷۰

روشن ہے ہوس، آئینۂ دِل ہے مکدر

﴿ أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ. أَفَأَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلاً أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَ هُمْ يَسْمَعُوْنَ أَوْ يَعْقِلُوْنَ. اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْأَنْعَامِ. بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيْلاً ﴾ (الفرقان: ۴۳-۴۴)

''کیا آپؐ نے اس شخص کی حالت پر غور نہیں کیا جس نے اپنی من چاہی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، کیا تم ایسے کسی آدمی کا کام بنانے کی ذمہ داری لے سکو گے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے اکثر لوگ سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں؟ نہیں، نہیں، بلکہ یہ لوگ چوپائے جیسے ہیں، بلکہ راستہ پانے میں جانوروں سے بھی زیادہ ناکام ہیں''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ'' بھلا آپ نے دیکھا اس کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا ہے۔

''خواہشِ نفس'' کی پیروی کے لیے ''خواہشِ نفس'' کی اندھادھند پیروی کے لیے اور غیر مشروط اس کی تکمیل کے لیے۔ اس کو پورا کرنے کیلیے، اس سے زیادہ زوردار الفاظ نہیں ہو سکتے۔ کہ:۔ أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ ''بھلا آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنا معبود کس کو بنایا۔؟ خدا کو نہیں بنایا۔ جو نفس کہے، جس میں مزہ آئے، جس میں فائدہ محسوس ہو، جس سے عزت ملے، شہرت ملے، حکومت ملے، وہ کرنا چاہیے،!

تو جس نے اپنی ہوائے نفسانی کو جزئی طور پر نہیں اپنا مطاع اور اپنا معبود بنایا بلکہ کلی

طور پر بنایا، جیسے خدا ہوتا ہے، خدا کے سامنے بندگی کا تعلق دائمی اور کلی ہوتا ہے، وہ اس کے اوامر کی بھی تعمیل کرتا ہے، اس کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس سے ڈرتا بھی ہے اور اس سے امید بھی رکھتا ہے۔

تو "اِتِّخاذِ اِلٰهَهٗ" کی جو صفت ہے وہ انہوں نے اپنی ہوائے نفسانی میں پیدا کر لی (یہ قرآن کی بلاغت ہے) واقعی جو لوگ نفس کے پرستار اور نفس کے پجاری ہوتے ہیں، خواہشات کے پجاری ہوتے ہیں۔ اور جاہلیت جن کا مذہب ہوتا ہے۔ وہ جزئی طور پر نہیں اپنی خواہش پر چلتے، بلکہ کلی طور پر انہوں اس جاہلی زندگی کو اور خواہشات کی تکمیل کو اور لذتِ نفس کو اور حظِ نفس کو مستقل معبود بنا لیا ہے کہ جو کام کرتے ہیں۔ پہلے اس میں دیکھتے ہیں...مزہ آئے گا کہ نہیں .....تعریف ہوگی کہ نہیں ...فائدہ ہوگا کہ نہیں ....تو وہ بالکل "اتخاذ الہہ" کے قائم مقام ہے۔اس کے لیے "اِتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ" کے سوا اور کوئی الفاظ بولے نہیں جا سکتے۔

انہوں نے ان کو گویا معبود بنا لیا، (جیسے مسلمانوں کا معبود اور جو اللہ نے ان کو دولت ایمان عطا فرمائی صحیح معنوں میں) ان کا معبود خدا ہے کہ وہ ہر کام اس کے راضی کرنے کے لیے کرتے ہیں اور گویا اس کے منشا کو معلوم کر کے کرتے ہیں، ویسے ہی جو ان کا معاملہ ہے وہ اس کے برعکس ہے، وہ اپنے نفس کی پرستش کو انہوں نے اپنا معبود بنا رکھا ہے۔تو "اِتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ" یہ جزئی اتباع نہیں ہے خواہش کا، بلکہ کلی اتباع ہے اور نفسیاتی طریقہ پر اعتقادی طور پر، عملی طور پر اور اخلاقی طور پر ہر طرح سے وہ دین بن جاتا ہے، یعنی اتباعِ نفس جو ہے اور نفس پرستی جو ہے اور خواہش پر آنکھ بند کر کے چلنا جو ہے، وہ مستقل دین بن جاتا ہے۔

آج کل دیکھ لو۔ یورپ کو دیکھ لو، امریکہ کو دیکھ لو۔ یہ کہنا کہ ہاں اس سے کچھ غلطیاں ہوئیں ہیں، زندگی میں کچھ خلا ہیں، کچھ عیب اور کچھ شگاف ہیں اور معیاری زندگی....نہیں۔ یہ نہیں....بلکہ "مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ" وہاں تو مادی زندگی اور مادہ پرستی اور نفس پرستی پورا دین بن چکی ہے، اس میں عقائد بھی شامل ہیں، اس میں عمل بھی شامل ہے اور تصرفات بھی ہیں اور ترجیح اور اختیار اور اس کا پورا فلسفہ!

مسرفانہ تقریبات

''لیکن افسوس ہے کہ خود مسلم معاشرہ میں یہ مرض داخل ہو گیا ہے اور مسلمان اس کو دینداری بلکہ انسانیت وشرافت کے بھی خلاف نہیں سمجھتے ،.......حالانکہ شریعت کی روح، دین کے مزاج اور انسانی واخلاقی نقطۂ نظر سے کسی طرح اس کا جواز نہیں نکل سکتا، اہل ثروت تجار اور ذی حیثیت لوگ اپنی اولاد کی شادیوں، خوشی کی تقریبوں، یا اپنے ذاتی معاملات اور اپنی دلچسپی کے دائرے میں اسراف وفضول خرچی، شہرت وعزت کے حصول، رسومات کی تکمیل میں پانی کی طرح روپیہ بہائیں۔

زمانہ کے بہت سے تغیرات وانقلابات اور علم وترقی کے باوجود مسرفانہ اور ''شاہانہ'' شادیوں اور تقریبوں کا رواج بند نہیں ہوا۔

آج بھی ہماری بہت سے برادریوں، تجارت پیشہ حلقوں اور عمائد شہر میں تقریبات پر جو ایک انسانی ضرورت اور دینی فریضہ تھا، دل کھول کر اور جان پر کھیل کر روپیہ خرچ کرنے کا رواج ہے، ان میں سے بہت سے حضرات اپنی دوسری عملی زندگی میں دیندار اور صاحب خیر بھی ہیں، مگر انہوں نے اس شعبہ کو دین سے بالکل غیر متعلق سمجھ رکھا ہے اور اس میں اچھے اچھے لوگ ان آیات کا مصداق ہیں ''اَرَأَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ'' ''آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی جس نے اپنا خدا، اپنی خواہشِ نفسانی کو بنا رکھا ہے'' یہ مسرفانہ تقریبات افراد کے لیے غضب الٰہی کا موجب اور ملت کے لیے وبال وادبار کا باعث ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحیم وحکیم ذات اور اس کی حکیمانہ شریعت ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس جھوٹے نام ونمود اور اس عارضی رونق وزینت یا کام ودہن کی فانی لذت پر وہ دولت صرف کی جائے جو سینکڑوں ضرورت مندوں کے کام آسکتی تھی''۔ (۱)

''اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا'' ''کیا آپ اس پر ان کے ذمہ دار ہو جائیں گے؟ وہ تو چوبیس گھنٹے کی زندگی ہے، آپ کہاں تک اس کا تتبع کریں گے، کہاں تک آپ اس کو

(۱) مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں: ۲۵-۲۸

روکیں گے؟ یہ تو انہوں نے اس کو دین بنالیا ہے اور اس کو معبود بنالیا ہے!

انسانی انحطاط کی وجہ

"أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ، إِنْ هُمْ إِلَّا كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلاً" "کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے اکثر لوگ سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں، نہیں نہیں، بلکہ یہ لوگ چوپائے جیسے ہیں، بلکہ راستہ پانے میں جانوروں سے بھی زیادہ ناکام ہیں"۔

بالکل صحیح تصویر ہے:۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں" "إِنْ هُمْ إِلَّا كَالأَنْعَامِ" بالکل چوپاؤں کی طرح ہیں،" بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلاً". بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ گمراہ ہیں، چوپایوں سے بھی گمراہی میں بڑھے ہوئے ہیں!

چوپایوں کی گمراہی تو بہت محدود ہوتی ہے اور حیوانی حدود کے اندر محدود ہوتی ہے، ایک چوپایہ جو غلطی کرے گا وہ کیا ہوگا؟۔ کہیں منہ مار دے گا.... پھر اس کے بعد اس کو بھی مارا جائے گا!۔ یا کسی کھیت میں گھس جائے گا.... نکالا جائے گا!۔

لیکن جب انسان چوپایہ بن جاتا ہے... اس پر ضلالت کا پورا قبضہ ہو جاتا ہے، تو پھر وہ اَنْعَام (چوپایوں) سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ پھر وہ بعض اوقات تو شہروں کو ختم کر دیتا ہے، ملکوں کو تباہ کر دیتا ہے!

اب یہ جو تیاریاں ہیں امریکہ وغیرہ میں اٹانومکیل جی.........وغیرہ اور جو دوسرے مما لک ہیں اسلحہ ہیں.... پھر ان کے اندر کی جو زندگی ہے جو لوگ ان سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ وہ گراوٹ کے، اخلاقی انحطاط کے آخری درجے تک پہونچی ہوئی ہے، اس درجہ تک کہ کہا نہیں جاسکتا اور اس پر بہت کچھ تبصرے شائع ہوئے ہیں، مضامین نکلتے ہیں اور تنقیدیں بھی ہوتی ہیں.... اور اخباروں میں بعض مرتبہ وہ چیز آجاتی ہے... ذرائع ابلاغ میں آتی ہے اور کسی وقت کسی کی زبان سے وہ بات نکل جاتی ہے.... وہ تحقیق کرنے والا یا لکھنے والا ہوتا ہے، لیکن جب تک آدمی ان میں کچھ عرصہ رہے نہیں... وہ کچھ وقت نہ گذارے تو وہ اندازہ نہیں ہوسکتا۔

ہم جن ملکوں کو ترقی یافتہ سمجھ رہے ہیں، وہ گراوٹ کے، اخلاقی، انسانی انحطاط کے

اس درجہ تک پہونچے ہوئے ہیں کہ تصور نہیں ہوسکتا۔

اگر کہا جائے کہ یہ چیز ہے۔ آپ سوچئے!۔ ہم آپ کو ایک گھنٹہ دیتے ہیں، سوچئے کہ آدمی وہاں تک نہیں پہنچ سکے گا جہاں تک وہ عملاً پہنچے ہوئے ہیں!

امریکہ میں بکثرت یہ چیزیں ہیں! اب تو لوگ اس کو محسوس کرنے لگے ہیں کتابوں اور رسائل ومجلّات میں بھی یہ چیزیں آنے لگی ہیں!

تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے اکثر لوگ سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں، نہیں نہیں "اِنْ هُمْ اِلّا كَالأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيْلاً" "تو بالکل چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ گمراہ ہیں!"۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۃ الفرقان: ۴۳-۴۴ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ اقتباس: ☆ اصلاحیات: ۹۷ ☆ مسلمانانِ ہند سے صاف صاف باتیں: ۲۵-۲۸، سے باختصار ماخوذ ہے۔

ظاہر میں تجارت حقیقت میں جُوا ہے

﴿أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ. وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ. وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ﴾

(الشعراء: ۱۸۱-۱۸۴)

"(دیکھو) تم لوگ پیمانہ پورا بھرا کرو، اور (صاحب حق کا) نقصان نہ کیا کرو اور (اسی طرح تولنے کی چیزوں میں) ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دیا کرو، اور ملک میں فساد نہ کرتے پھرو، اور اس سے ڈرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلی مخلوقات کو پیدا کیا"۔

ایک مرض ناپ تول میں کمی کرنا

قرآن مجید چونکہ قیامت تک کے لیے باقی رہنے والی کتاب ہے اور آخری کتاب ہے اور پوری انسانیت کی کتاب ہے۔

اس میں ان قوموں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں نیا مرض پیدا ہوا ہے، مشترک چیز تو مثلاً شرک ہے، بت پرستی ہے، جہالت ہے، یہ تو تھی، لیکن جو قوم جس چیز میں فائق ہوگی اس کا ذکر کیا ہے قرآن مجید میں!

کوئی ایسی چیز آپ نہیں پائیں گے (تلاش کے بعد بھی) کہ کسی قوم کا کوئی ایسا مرض بیان کیا ہو، اب جو نہ پایا جاتا ہو، یا ان کے زمانے کے بعد نہ پایا جاتا ہو، یا ان کے زمانے بعد نہ پایا جاتا ہو، یا اس کی کوئی مناسبت نہ ہو نسلِ انسانی سے، انسانی تمدن سے! قومِ نوح کو لے لیجئے اور قومِ ثمود اور قومِ عاد کو لیجئے اور یہ اصحاب ایکہ کو لیجئے، قومِ لوط کو لیجئے، کوئی بھی ایسا نہیں کہ فرضی یا خیالی ہو (جیسے شعراء کے یہاں چیزیں ہوتی ہیں تخیل سے وہ پیدا کر لیتے ہیں) کوئی سا بھی یعنی قومِ نوح سے لے کر حضرت ابراہیمؑ تک اور حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے امراض اور قرآن مجید میں جن امراض کی ادوار میں بار بار پیدا ہوتے رہے اور اب بھی پائے جاتے ہیں اور قیامت تک بھی یہ پائے جاتے رہیں گے! اُن میں سے ایک یہ ہے تطفیف کیل یعنی ناپ تول میں کمی کرنا۔

اب دیکھئے ایک ایسی کتاب کہ جس کا مقصد نزول اور جس کی غرض وغایت وہ زیادہ تر تعلق مع اللہ ہے توحید ہے، اخلاص ہے اور طلب خداوندی ہے اور آخرت کی تیاری۔ تو اس میں "ناپ تول کی کمی" کا ذکر آنے کا کوئی آدمی قیاس نہیں کرسکتا تھا کہ اس کا کیا تعلق وحی وتنزیل سے؟ یہ تو ایسی بیماریاں ہیں جیسے بخار آ گیا مثلاً یا کسی میں کوئی وار بیماری ہوگئی اس طرح، لیکن قرآن مجید نے اس کو اتنی اہمیت دی ہے اور اس کا ذکر کیا ہے کہ یہ درحقیقت اس کے ضوء میں جو چیز ہے، وہ خدا سے بے خوفی اور مال سے حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے جو سب کچھ کراتی ہے۔

اس لیے یہ مرض اتنا نہیں ہے کہ مثلاً ہلکے طریقے پر مارکٹنگ میں، تجارت میں آج کل بزنس میں کچھ چیزیں ہیں، امریکہ اور یورپ میں ہیں اور یہاں بھی ہوں گی کہ اس میں مال کی خرابی نہیں بتائی یا کوئی چیز وقت سے پہلے فروخت کرنی شروع کردی ہے، ایسی بہت ترکیبیں ہوتی ہیں اور اس وقت یہ ایک بہت بڑا فن بن گیا ہے، اقتصادیات کا (ایکنومکس) کا اور بزنس کا اور ٹریڈ یہ سب چیزیں فن بن گئی ہیں۔

یہ بھی خدا فراموشی کا نتیجہ ہے

تو اب یہ قومِ شعیبؑ جو ہے اس کو مرض یہ تھا کہ ناپ تول میں کمی کرنا اس کو دولت کی

ہوس تھی اور اس سے پہلے جو قومیں تھیں ان میں یہ مرض شاید اس درجہ میں نہیں تھا۔ [1]

غور سے دیکھا جائے تو رشوت ستانی، چور بازاری، حد سے زیادہ نفع خوری اور اخلاقی جرائم پیچیدگیاں نہیں ہیں، اصل پیچیدگی وہ ذہنیت اور مزاج ہے، جو ان بداخلاقیوں اور بے اصولیوں پر آمادہ کرتا ہے، اگر ایک دروازہ بند کیا جائے گا تو دس دروازے کھل جائیں گے، انسانی ذہن اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بہت سے چور دروازے رکھتا ہے، اگر اس میں کوئی گہری تبدیلی نہ ہو تو اس کا راستہ روک کر کوئی عاجز نہیں کر سکتا، اس کو اپنی مطلب برآری کے لیے بہت سی تدبیریں اور حیلے آتے ہیں، وہ ان سے اپنا مطلب نکال لے گا۔

پھر اس خود غرضی نے ساری دنیا میں اور ملک کے تمام طبقوں میں ایک مخصوص مزاج پیدا کر دیا ہے۔

جس کا خاصہ ہے کہ انسان اپنے حقوق کے مطالبہ میں بڑا مستعد ہے اور فرائض و حقوق کے ادا کرنے میں سخت کوتاہ اور حیلہ جو اس ذہنیت اور سیرت نے ساری دنیا میں انفرادی، جماعتی اور طبقاتی کشمکش برپا کر دی ہے، ہر شخص اپنا حق مانگتا ہے اور دوسرے کا حق ادا کرنے سے گریز کرتا ہے، اگر دنیا پر نظر ڈالی جائے تو ساری دنیا حقوق طلبوں کی ایک آبادی نظر آئے گی، جس میں حق طلبی کا نعرہ تو ہر زبان پر ہے، لیکن ادائے فرض کا احساس کسی کے دل

---

(۱) یہ اصحاب الایکہ تھے یہ کھلے میدان میں رہتے ہیں اور یہ خلیج عقبہ کہلاتی ہے، حجاز و فلسطین کے درمیان یہ ایک خلیج عقبہ پڑتی ہے، اب وہ اردن کے علاقہ میں ہے (اور اس کے لیے ہم آپ لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ: ارض القرآن: سید سلیمان ندویؒ کی بھی پڑھئے، بہت معرکۃ الآراء کتاب ہے، ان سے پہلے کم از کم علمائے ہند میں کسی نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا تھا، اب تو مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کی تفسیر ماجدی میں خاص طور پر جو انگریزی تفسیر ہے، اس میں تفصیلات زیادہ ہوتی ہیں تو سید صاحبؒ نے اس زمانہ میں وہ کتاب لکھی جب اس کا مواد بھی کم تھا، ماخذ بھی کم تھے اور پھر زیادہ تر انگریزی میں تھے تو اس میں دیکھئے) یہ اصحاب الأیکہ کہاں تھے؟ تو جغرافیہ کے معلوم کرنے سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ خارجی محرکات بھی معلوم ہو جاتے ہیں، مثلاً کوئی ایسی جگہ ہے کہ آمدنی کے متعدد ذرائع نہیں ہیں کہ اگر اس سے کم آمدنی ہو رہی ہے، دیر سے ہوگی، تو اس سے حاصل کر لے، اس سے نہیں، اُس سے حاصل کر لے، تو وہاں پر تو یہ ہوتا ہے کہ ایک ذریعہ آمدنی ہے صرف! ۔اسی میں کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ اپنا تو دینا کم ہو اور لینا زیادہ ہو۔ تو وہ ناپ تول کی کمی ہے، تطفیف کیل کی! یہ ایک قوم شعیب کا مرض ہے۔

میں نہیں، جس آبادی میں ہر شخص حق طلب ہو، لیکن فرض شناس کوئی نہ ہو وہاں کی زندگی کی الجھنوں اور دقتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور وہاں کی کشمکش کو کوئی انسانی تدبیر یا تنظیم دور نہیں کر سکتی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وَزِنُوا بِالقِسْطَاسِ المُسْتَقِيم، ولا تَبْخَسُوا النَّاسَ أشْيَائَهُمْ، ولا تعْثَوا في الأرضِ مُفْسِدِين" اور تولا کرو صحیح ترازو سے اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کیا کرو اور زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ پھیلا کرو اور نہ گردش کیا کرو اور نہ گشت کیا کرو کہ دوسروں کو بھی تلقین، یعنی یہ قاعدہ ہے کہ جس آدمی میں مرض ہوتا ہے، جس چیز کو صحیح سمجھتا ہے، بلا ارادہ اور بالارادہ اس کی تلقین کرتا ہے، کبھی زبان حال سے، کہیں گیا تو معلوم ہوا کہ ایک صاحب ہیں، یہ کام کرتے ہیں، پوچھنے کی بھی لوگوں کو جرأت نہیں ہوتی اور کبھی زبانِ قال سے! تو یہ بالکل فطرتِ انسانی ہے کہ "وَلاَ تَعْثَوْا فِي الأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ وَاتَّقُوْا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الأَوَّلِيْنَ" زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ پھیلو، نہ گشت کرو اور اس سے ڈرو جس نے تم کو پیدا کیا اور پہلی مخلوق کو پیدا کیا۔ (۱)

(۱) درس قرآن، سورۃ الشعراء: ۱۸۱-۱۸۴ (غیر مطبوعہ) کے اخذ و تلخیص از: ☆ اصلاحیات: ۹۷-۱۰۳

ثابت شدہ حقائق سے چشم پوشی اور اس کا انجام

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا لَوْ لَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰئِكَةُ أَوْ نَرىٰ رَبَّنَا لَقَدْ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ وَ عَتَوْا عُتُواً كَبِيْراً يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰئِكَةَ لَا بُشْرىٰ يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْراً مَحْجُوْراً. وَقَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَاءً مَنْثُوْراً﴾
(الفرقان: ۲۱-۲۳)

''اور جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہ نازل کیے گئے؟ یا ہم اپنی آنکھ سے اپنے پروردگار کو دیکھ لیں، یہ اپنے خیال میں بڑائی رکھتے ہیں اور (اسی بنا پر) بڑی سرکش ہو رہے ہیں، جس دن یہ فرشتوں کو دیکھ لیں گے، یہ اس دن گنہ گاروں کے لیے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی اور کہیں گے (خدا کرے تم) روک لیے (اور) بند کردیے جاؤ اور جو انہوں نے عمل کیے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے، تو ان کو اڑتی ہوئی خاک کردیں گے''۔

ذوقِ خدا طلبی کا فقدان

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا'' اور کہا ان لوگوں نے

جو ہماری ملاقات کی، ہمارا سامنا ہونیکی امید نہیں رکھتے۔

یہ جو عنوان ہے: "قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا" (ان لوگوں نے کہا جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے) یہ بہت وسیع اور عمیق اور زمان ومکان سے مستغنی، زمان ومکان کے اختلافات سے مستغنی ایک صفت بیان کی ہے!

بہت سی چیزوں کا سبب اگر نفسیاتی تحقیق کی جائے اور تجزیہ کیا جائے اور حالات پر غور ہو تو بہت سے معاصی کی وجہ نافرمانیوں کی وجہ، سرکشی کی وجہ، حد سے تجاوز کی وجہ، جرأت کی وجہ اور گستاخی کی وجہ ہوتی ہے اندر سے، "لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا" "کہ ہماری ملاقات کی امید نہیں کرتے"۔

دیکھنے میں تو یہ الفاظ بہت ہلکے اور عام فہم ہیں، لیکن بہت بڑی گہرائی رکھتے ہیں اور یہ بہت بڑی ایک کمزوری بیان کی گئی ہے، ایک عمومی اور بہت دور رس اس کو عربی میں "اعماق" کہتے ہیں۔ اعماق رکھنے والی کہ:۔ "لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا"

"جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں" وہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں کریں، تو بہت سی چیزوں کی جڑ ہوتی ہے کہ وہ "اللہ سے ملاقات کی امید کا نہ ہوتا" یعنی خدا کے سامنے پیش ہونے اور خدا کو منہ دکھانے اور خدا کے سامنے حشر ہونے کا انکار بہت سی چیزوں کا محرک ہوتا ہے، وہ ابھارتا ہے!

اب آپ دیکھئے گا: جو اخلاقی خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں، جو تعدیاں ہیں، حدود سے تجاوز ہے... ظلم ہے... اور نفس پرستی ہے.... ان سب میں، ان کی جڑ میں جو چیز کام کر رہی ہے۔ وہ بہت کوئی فلسفہ یا کوئی علمی حقیقت نہیں ہے... بلکہ یہ ایک "لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا" اللہ تعالیٰ کے سامنے جانے کی امید نہیں ہے، یہ سب کر گذرتے ہیں، ڈر کس بات کا!

اس سے بہت ڈرنا چاہیے کہ: اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا یقین دل میں بیٹھا ہونا چاہیے، سب سے زیادہ جو چیز روک سکتی ہے اور ہر وقت روک سکتی ہے اور ہر جگہ روک سکتی ہے، ہر قضیہ اور ہر معاملہ میں روک سکتی ہے وہ... لمبے چوڑے وعظ نہیں (ان کا موقع کبھی کبھی آتا ہے)..وہ بہت بڑے وسیع علوم وفنون نہیں،....وہ کتاب وسنت کا بہت

گہرا علم نہیں، ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا..! وہ سیدھی سی بات ہے: "یَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا" خدا سے سامنے جانے کا خیال... یقین..!

اور یہی وہ چیز تھی جو صحابہ کرام میں... اولیاء عظام میں.. اور مصلحین کبار میں اور نامور داعیوں میں جو چیز پائی گئی... اور ان کے وعظ میں جو اثر آیا، یعنی یہاں تک سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کا وعظ ہوتا تھا، لوگ بے ہوش ہو ہو کر گر جاتے تھے... بہت سے لوگوں کے جنازے اٹھے تھے... ان کے وہاں سے جنازے اٹھتے تھے، یہ ان کے مواعظ میں جو تاثیر ہے، ان کو پڑھیے "تاریخ دعوت وعزیمت" میں یا کسی اور کتاب میں!

تو کیا چیز تھی؟ "یَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا" جن لوگوں کو اللہ سے ملنے کی امید ہے، ان کے مواعظ میں یہ بات پیدا ہو جاتی تھی کہ "ہمیں خدا کے سامنے جانا ہے۔

تو یہ لفظ جو بہت سادگی کے ساتھ فرمائے گئے ہیں اور آیت ان سے شروع ہوئی ہے، کوئی عنوان نہیں ہے، ان کو سمجھنے کی ضرورت ہے! اتنی بڑی بات جو انہوں نے کہی کہ "لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا مَلٰئِكَةُ"...... "ہمارے پاس فرشتے کیوں نہ نازل ہوئے" براہ راست فرشتے ہمارے پاس آئے ہوتے "أَوْ نَرٰى رَبَّنَا" "یا خدا کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے!"

یہ گستاخی کا جملہ، یہ جرأت ان کو اس لیے ہوئی کہ۔ "لَا يَرْجُوْنَ لِقَآئَنَا!"

زمان ومکان کے اختلاف سے مستغنی ایک صفت

"لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْ أَنْفُسِهِمْ" "انہوں نے بڑے استکبار کے، بڑے تکبر سے کام لیا اپنے دل میں" اپنے دلوں میں تکبر اور فخر اور ضرورت سے زائد اور بے محل اعتماد کی بنیاد پر انہوں نے یہ بات کہی۔ "وَعَتَوْا عُتُوًّا كَبِيْرًا" اور انہوں نے سرکشی اختیار کی بہت بڑی سرکشی۔

"انبیاء کرام کی تعلیم کے برکات ونتائج اور ان کی پیروی کی سعادت سے محرومی کا بڑا سبب اکثر تکبر، جھوٹی عزتِ نفس اور خودداری کا جاہلی جذبہ ہوتا ہے،......... کیونکہ اس کی وجہ سے اپنے جاہ واقتدار سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، جاہلی عادات ورسومات چھوڑنے

پڑتے ہیں، بہت سے فوائد سے ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے، آزادی اور خودسری کی زندگی کے بجائے پابندی اور قانون کی زندگی گذارنی پڑتی ہے، بہت سے لوگوں پر یہ انقلاب حال بہت شاق گذرتا ہے اوران کا تکبرقرآن کے انکار پران کوآمادہ کرتا ہے"۔ (۱)

"یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَةَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِیْنَ وَ یَقُوْلُوْنَ حِجْراً مَحْجُوراً" یہ جو کہتے ہیں کہ "ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں نازل ہوئے...اور خدا کو کیوں نہیں دیکھتے...ہم براہ رست دیکھ لیں...تو ان کا حال یہ ہے کہ...اگر یہ فرشتوں کو دیکھ لیں "یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰئِکَةَ" جس دن یہ فرشتوں کو دیکھ لیں گے... "لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِیْنَ". "تو اس وقت مجرموں کے لیے کوئی اچھی ساعت نہیں ہوگی"! کوئی ان کو خوش خبری سنانے والی..بشارت دینے والی چیز نہیں ہوگی!

"وَیَقُوْلُوْنَ حِجْراً مَحْجُوْراً" اور وہ بلبلا کر اور پریشان ہو کر کہیں گے "حِجْراً مَحْجُوْراً".... "حِجْراً مَحْجُوْراً"... یہ محاورہ ہے، دور ہو...دور ہو....آڑ ہو....آڑ ہو. .. "حِجْراً مَحْجُوْراً" یعنی آڑ پر آڑ ہو...ایک ہی آڑ کافی نہیں بلکہ "جو "حِجْر" ہو وہ بھی "مَحْجُوْر" ہو۔وہ "حِجْر". ایک دوسرے "حِجْر" سے محفوظ ہو اور محبوس ہو۔

تو جن کا حال ہے کہ فرشتوں کو دیکھ کر یہ پکارنے لگیں کہ "ارے کہاں سے یہ چیز آ گئی...خدا کی پناہ! یہ جس طرح بھی وہ اس سے بچنے کے الفاظ کہے ہیں بے قراری میں، وہ اتنی بڑی فرمائش کرتے ہیں کہ۔

"لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰئِکَةُ" اور اس سے بڑھ کر۔"أَو نَرٰی رَبَّنَا"! حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر فرشتے آ جائیں، کوئی ایک فرشتہ بھی آ جائے، بلکہ یہ تو خیالی چیزوں سے بھی ڈرتے ہیں، سایہ دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں اور بھاگنے لگتے ہیں، کسی ایسے مہیب جانور کا سایہ اگر دیکھ لیں سانپ کا سایہ بھی دیکھ لیں تو بھاگیں سر پر پاؤں رکھ کر۔

لیکن یہ سب باتیں بنانے کی بات ہے، یوں کیوں نہیں ہوتا... وہ کیوں نہیں ہوتا! رسولؐ کی موعظت سے فائدہ نہ اٹھانے کے عذر میں اور اپنے کو نا قابلِ ملامت سمجھانے میں

(۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۱۴۹-۱۵۰

وہ اپنی فرمائشیں کرتے ہیں۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا، حالانکہ اگر اس سے ہلکی سی بات بھی ہوگی تو یہ برداشت نہیں کرسکیں گے!

حاسۂ مذہبی سے محرومی

مغربی تہذیب کے اس عروج کے زمانہ میں ہر قوم میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا ہے، جس کی دنیاوی مشغولیت وانہماک یا دنیا کی محبت وحرص نے ان کی زندگی میں مذہب کے لیے کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا، بڑی تلاش وجستجو کے بعد بھی مذہب کی دعوت دینے والے کو ان کے دل ودماغ میں کوئی ایسا چھوٹے سے چھوٹا منفذ نہیں ملتا، جس سے دینی اور اخلاقی دعوت ان میں نفوذ کرسکے۔

جن لوگوں کو اس طبقہ سے خطاب کرنے اور اس کو دین واخلاق کی دعوت دینے کا بھی موقع ملا ہے، ان کو قرآن مجید کی بہت سی آیات کے معنی سمجھ میں آگئے ہوں گے اور وہ تمام کلامی اشکالات جو عملی زندگی اور میدان دعوت سے علیٰحدہ بیٹھ کر "خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ. وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" اور اس کے ہم معنیٰ آیات کے متعلق پیش آتے ہیں، خود بخود حل ہوگئے ہوں گے اور یہ حقیقتِ قرآنی مجسم نظر آئی ہوگی، "وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاءً وَّ نِدَاءً. صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ". (البقرۃ:۱۷۱)

اس زمانہ کا اصلی مرض دراصل دین کے بارہ میں بے حسی وبے طلبی اور مذہبی سوالات کے بارہ میں کامل بے تعلقی کار گر نہیں ہوسکتی، مذہب واخلاق کی دعوت کو فسق وفجور اور معصیت وغفلت کے تاریک دور اور انکار ومخالفت کے پرشور سے پرشور عہد میں وہ مشکلات پیش نہیں آئے جو مذہب سے بے تعلقی وبے نیازی کے اس خاموش وپرسکون دور میں پیش آرہے ہیں جہاں سرے سے پیاس اور پانی طلب ہی نہ ہو وہاں پانی کا اہتمام اور خضر کی رہنمائی سب بے ضرورت ہے۔[1] آگے فرماتا ہے: "وَقَدِمْنَا اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ

---

(۱) عروج وزوال کا اثر: ۲۷۹-۲۸۰

فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا".

"اور بڑھے ہم ان کے عملوں کی طرف جو انہوں نے عمل کیے ہیں بغیر ایمان کے"۔ اللہ و رسولؐ پر ایمان اور آخرت پر ایمان کے بغیر اجر و ثواب کے لالچ کے بغیر جو عمل کیے ہیں تو۔ "فَجَعَلْنَاهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا". ہم نے ان کو اڑتا ہوا غبار بنا دیا"!

"هَبَآءً مَنْثُوْرًا". "هَبَآءً" کے معنی اول تو خود "غبار" ہے، کافی ہے، لیکن اس کے بعد اور شدت پیدا کرنے کے لیے فرمایا: "مَنْثُوْرًا" وہ غبار ہوا کی طرح اڑ جانے والا۔ "غبار"! یعنی ہم نے ان کے اعمال پر پانی پھیر دیا، ان کے اعمال بے حقیقت ہو گئے، اس لیے کہ اس کے ساتھ ایمان نہیں تھا!

اور یہی اس وقت ہو رہا ہے، آپ دیکھیں گے کہ یہ جو ہے: دین سے دوری اور خدا ناشناسی اور خدا فراموشی، اس کی وجہ سے اچھے سے اچھا عمل کرتا ہے آدمی، لیکن کوئی نیت نہیں ہوتی نہ ثواب کی نیت ہوتی ہے، نہ اس سے فائدہ پہونچانے کی نیت ہوتی ہے، یا تو شہرت کی نیت ہوتی ہے "رِيَاء". اور "سَمْعَاء" دکھاوا اور شہرت طلبی اور یا پھر کوئی اپنی نفسانی غرض، یا کوئی دور کا مقصد کہ یہ ہوگا آج ہم اس کی تاکید شروع کرتے ہیں، تو اس سے فائدہ اٹھالیں گے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ایسے اعمال کی کوئی قیمت نہیں ہمارے یہاں "فَجَعَلْنَاهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا" قیامت کے دن ہم ان کو بالکل گرد و غبار بنا دیں گے" کوئی کام آنے والی چیز نہیں!

اس لیے اس پر بہت نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ صرف عمل کا صالح ہونا کافی نہیں، بلکہ نیت ہونی چاہیے خدا کی رضا کی۔[1]

(۱) درس قرآن، سورۃ الفرقان: ۲۱-۲۳ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ، مندرجہ اقتباس: ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی: ۱۴۹-۱۵۰ ☆ عروج و زوال کا اثر: ۲۷۹-۲۸۰، سے اخذ و تلخیص کیے گئے ہیں۔

رسول اللہ کے حریفوں کا عبرت ناک انجام

﴿ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الأَبْتَرُ ﴾ (الکوثر: ۳)

''بیشک آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان ہونے والا ہے''۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی مخالفت کرنے والوں، آپ کی عالمی اور ابدی قیادت کو چیلنج کرنے والوں اور نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کا ہمیشہ یہی انجام ہوا ہے، قرآن کی آیت کریمہ ﴿ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الأَبْتَرُ ﴾ ''بیشک آپ کا دشمن ہی بے نام ونشان ہونے والا ہے'' کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض وحسد رکھنے والے اور آپ کی قیادت سے اختلاف کرنے والے قریش کے کسی اجڈ اور اکھڑ شخص کے لیے مخصوص نہیں مانتا، اسی طرح ''ابتر'' میرے خیال میں صرف نسلی اور نسبی انقطاع ہی کا نام نہیں، بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے، اس کا پورا مفہوم یہ ہے کہ:

''اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو بھی آپ کا مخالف ہو، آپ سے دشمنی رکھے، آپ کی عالم گیر قیادت کو چیلنج کرے، آپ کی قیادت سے قوم کا تعلق منقطع کر کے ان کی گردنوں پر خود مسلط ہو جائے اور قوم کے ذہن ودماغ سے روحانیت کے مبارک عنصر کو خارج کرنا چاہے، اس کا انجام ہے بدتوفیقی، ناکامی، ذلت، گمنامی اور بے نشانی''۔

یہ انجام ہوا مسیلمہ کذاب کا، اسود عنسی کا، طلیحہ اسدی کا، سجاح کا، ابوطاہر جنابی کا، عبید بن میمون کا، حسن بن صالح کا، بہاء اللہ ایرانی اور غلام احمد قادیانی کا.........اور اسلام سے

بغض وعداوت رکھنے والے انتہا پسند قوم پرست لیڈروں کا بھی ہر زمانہ میں یہی انجام ہوا ہے اور جو شخص بھی اس امت پر ناجائز طور سے اور زبردستی غلبہ حاصل کرے گا اور امت کو محمد ﷺ کی ابدی قیادت سے الگ کرنے کی کوشش کرے گا، اس کا انجام بھی وہی ہوگا، قرآن نے جس کی خبر دی ہے اور تاریخ سے جس کی ابدیت ثابت ہے۔

مفسرین کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انہوں نے اس آیت کی تشریح میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے اعتراف واحترام کے ساتھ میں یہ آیت اعلان کرتی ہے کہ "محمد ﷺ کے ہر حریف ورقیب اور آپ کی قیادت کو چیلنج کرنے والے ہر بدنصیب کا یہی انجام ہوگا"۔ (۱)

---

(۱) عالم عربی کا المیہ: ۱۳۶-۱۳۷

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو...

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (آل عمران: ۱۲۳)

"آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا، حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے، لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گذار بنو گے"۔

اس آیت کریمہ میں معرکۂ بدر کا ذکر ہے، مختصر سی آیت ہے، لیکن اس کے اندر ہمارے لیے بہت سامانِ عبرت ہے، یہ ایک ایسا سبق ہے، جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہماری فکر کو جلا بخشتا رہے گا اور عزائم کو سینوں میں بیدار رکھے گا، یہی نہیں بلکہ اس آیت میں ہماری حیثیت کا تعین بھی ہے، اقوام عالم میں ہمارا کیا موقف ہونا چاہیے، اس کی طرف واضح رہنمائی ہے۔

دعاء کا پاسنگ

معرکۂ بدر تاریخ کا مشہور فیصلہ کن معرکہ ہے، جس کے سایہ میں ہم زندہ ہیں، ہماری حکومتیں، ہم میں مختلف رنگ ونسل کی مسلمان قومیں، یہ سب بدر کی پروردہ ہیں اور بدر اس دعوت و پیام کا رہین منت ہے، جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے، بدر میں دو مقابل لشکر نہیں

تھے، بلکہ دونوں عدد، اسباب ووسائل میں عدم تناسب کے اعتبار سے گویا دو مختلف پلڑے تھے، ایک پلڑا اپنے بوجھ کی وجہ سے زمین کو چھو رہا تھا، یہ کفار و مشرکین کا پلڑا تھا، دوسرا اپنی بے وزنی کی وجہ سے فضا میں معلق تھا، یہ اہل ایمان کا پلڑا تھا، آنحضرت ﷺ نے اپنی دعاؤں اور نصرت الٰہی کا پاسنگ مسلمانوں کے پلڑے میں ڈال دیا۔

آپ نے زمین پر اپنی پیشانی رکھی اور وہ جملہ فرمایا جو بلا شبہ مسلمانوں کی اس قلیل تعداد کی بقا، بلکہ امت کی بقا کا حقیقی سبب تھا، آپ نے فرمایا "اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِکْ ھٰذِہٖ الْعِصَابَۃَ لَنْ تُعْبَدْ"۔ "اے اللہ اگر یہ مختصر جماعت (جو مسلمانوں کی یہاں جمع ہے) ہلاک ہوگئی تو تیری عبادت نہیں کی جائے گی"۔

یہ جملہ رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، کس کی مجال تھی کہ ایسی بات اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے کہے کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو ایسا ہوگا اور ایسا کیا تو یہ ہوگا، پھر پیغمبر بھی وہ جو اللہ تعالیٰ کا خاص طور پر چنا ہوا محبوب، باوقار، باوجاہت ہے، ایسا رسولؑ جس کو اللہ تعالیٰ نے منتخب ہی اس لیے کیا تھا کہ اس کے پیغام اور لائے ہوئے دین کو قیامت تک باقی رکھے گا اور ہمیشہ اس کا ناصر و مددگار رہوگا وہ کہے "اگر تو نے مٹھی بھر جماعت کو ہلاک کردیا تو تیری عبادت نہ ہوگی" یعنی اے اللہ اگر تو نے اس جماعتِ مختصر کی شکست کرادی تو دنیا کا تو کوئی نقصان نہ ہوگا، انسانیت کو کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، دنیا کی حکومتیں اور دنیا کے ملک اسی طرح رہیں گے، جس طرح آج ہیں، دنیا کے خزانوں میں کمی نہیں آئے گی، دنیا میں کمانے کھانے کے جو کام ہو رہے ہیں وہ اسی طرح ہوتے رہیں گے، بڑے دانشور، حکمت و دانائی میں ممتاز افراد جس طرح ہوتے آئے ہیں، اسی طرح پیدا ہوتے اور مرتے رہیں گے، لیکن صرف ایک بات جو نہیں ہوگی، وہ ہے خالص تیری ذات پاک کی عبادت، تیرے احکام کا دنیا میں نفاذ اور تیرے دین حنیف کی بقاء یہ کام نہیں ہوگا اور سب کچھ ہوگا، کیوں کہ اپنی تعداد میں کمی اور دفاعی اسلحہ میں ناقص ہونے کے باوجود روئے زمین پر تنہا یہی جماعت ہے جو توحید کی داعی اور تیری عبادت گزار ہے، جس کا بھروسہ صرف تجھ پر اور جس کا اعتماد تیری ذات پاک پر ہے، جس کی عبادت صرف تیری ذات پاک کے لیے ہے اور

جس کو یقین ہے کہ کائنات پر صرف تیرا تصرف ہے، تیرا کوئی شریک نہیں ہے، تو ہی قادر مطلق، حاکم مطلق اور مالک الملک ہے، عبادت وطاعت کا تنہا سزاوار ہے، صرف تیرے احکام اور صرف تیری شریعت کا یہ حق ہے کہ وہ دنیا پر نافذ ہو اور بے چون وچرا اس کی فرمانبرداری کی جائے'' اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی نصرت فرما کر اس کی تصدیق کی۔

امت اسلامیہ کا مقام اور پیغام

''اگر کہیں اس جنگ میں مسلمان ناکام ہو جاتے تو صاف سن لیجئے کہ عالم اسلامی نام کی کوئی چیز اس آسمان کے نیچے نہ دکھائی دیتی، اسلامی دعوت وتبلیغ کو دنیا میں اپنی راہ نکالنے کا کوئی راستہ نہ ہوتا، دلوں کو موہ لینے کی صلاحیت، ملکوں کو فتح کرنے کی قوت، اس کے نام پر حکومتیں بنانے کا حوصلہ، اداروں، مدرسوں اور کتب خانوں کی یہ چمک دمک، یہ سرگرمیاں اور نشاط وقوت کے مظاہر سب ناپید ہوتے، نہ اس قوم میں کوئی نادرۂ روزگار عالم وصاحب فن نہ ہوتا نہ اولیاء وصالحین کی کوئی جماعت ہوتی اور نہ آوازۂ حق کہیں سنائی دیتا''۔

''لہٰذا وہ چیز جس کی حفاظت مسلمانوں پر فرض ہے اور جس کے لیے ان کے اندر غیرت وحمیت ہونا چاہیے اور جس کو وہ اپنی جان سے، صحت سے، اپنی دانائی وہوشمندری سے زیادہ عزیز رکھیں اور جس کو دولت وحکومت پر ترجیح دیں، اپنی شہرت ونا موری کے پروپیگنڈے اور اپنی سیاسی تگ ودو سے زیادہ اہمیت دیں اور جذبۂ حکمرانی اور پنے حدود سلطنت کو وسیع کرنے کی تمنائیں اس کے مقابلہ میں ہیچ ہوں، وہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اللہ کے دین کا داعی ومبلغ سمجھیں، علم توحید کو سربلند اور اللہ کے دین کو سرسبز وشاداب رکھنے کی آرزو ان کی تمام آرزوؤں اور تمناؤں پر غالب آ جائے، آخرت کو دنیا پر ترجیح دیں، اللہ کی رضا اور اس کے احکام کے اجراء کو ہر مقصد اور ہر نسبت پر قربان کرنے کا جذبہ ان کے اندر بیدار کریں، ان کے بقاء کی ضمانت اسی میں ہے کیوں کہ ان کا وجود ملی اسی دھاگے سے بندھا ہوا ہے''۔ (۱)

مشترک اخذ وتلخیص، از: ☆ اقوام عالم کے درمیان امت اسلامیہ کا حقیقی وزن: ۷-۱۶ ☆ عالم عربی کا المیہ: ۷۰-۷۳ ☆ نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں: ۷۶

قیامت کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ، مَا يَاتِيْهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ، لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ﴾
(الانبیاء: ۱–۲)

''لوگوں کے لیے ان کا حساب قریب آ گیا ہے اور وہ غفلت میں اعراض کیے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس کوئی نصیحت نہیں آئی ان کے رب کی طرف سے نئی مگر وہ اس کو سن لیتے ہیں اور اپنی تفریحات میں مشغول ہوتے ہیں دل ان کے غافل ہیں۔''

یہ سترھویں پارے کی سورہ انبیاء کی آیات ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ''اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ'' لوگوں کے لیے ان کا حساب قریب ہو گیا ہے، لیکن وہ غفلت کے مارے، غلفت کے اندر منہ پھیرے ہوئے ہیں، اور اس سے بے تعلق اور بے خبر ہیں۔

قیامت عامہ اور حشر عام ہے

جب کوئی چیز بہت بڑی ہوتی ہے تو خواہ اس کا زمانہ کتنا دور ہو اس کو قریب ہی سمجھنا چاہیے وہ حقیقت میں قریب ہی ہوتا ہے (ایک اچھا طالب علم، فرض شناس اور کامیابی کا

شائق، اس کا امتحان چاہے اس میں ایک سال باقی ہو، چاہے اس کا درجہ ابھی شروع ہوا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ کل کی بات ہے، کل ہی ہونے والی چیز ہے) تو کسی چیز کا قرب وبعد اس چیز کی اہمیت وعظمت کے حساب سے ہوتا ہے، مثلاً اس میں ایک موت ہی کا معاملہ ہے۔ موت یقینی ہے، وہ خواہ کتنی دور کا ہے، لیکن سمجھنا چاہیے کہ قریب ہے، ویسے ہی قیامت کا معاملہ ہے کہ قیامت کو ہزاروں برس ہوسکتے ہیں اور اس سے کم اور زیادہ بھی ہوسکتے ہیں، لیکن اس کو قریب ہی سمجھنا چاہیے، وہ تو قیامت عامہ ہے اور حشر عام ہے، لیکن ہر شخص کو جو اپنا حساب دینا ہے۔ وہ تو ہر وقت ممکن ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زندگی میں بھی اللہ تعالی کا جو قانون مکافات ہے، اللہ تعالی جو عمل پر بدلہ دیا کرتا ہے اور عمل کی کوتاہی پر یا گناہ ومعصیت پر اللہ تعالی کی طرف سے جو سزا ملتی ہے اور اس کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے، وہ تو ہر وقت ممکن ہے اور روزانہ، روزانہ نہیں بلکہ ہر گھڑی اس کا سلسلہ جاری ہے، تو اگر اس سب کو سامنے رکھیں، عالمی موت کو آپ سامنے رکھیں اس کا نام قیامت ہے اور اپنی موت کو سامنے رکھیں جس کا وقت اور زمانہ معلوم نہیں اور اس کے بعد اعمال پر جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے معاملہ ہوتا ہے، جزا ملتی ہے اچھے عمل پر، سزا ملتی ہے برے عمل پر، اور جو ہر چیز میں اللہ نے تاثیر رکھی ہے، اعمال میں تاثیر ہے، طاعت ومعصیت میں تاثیر ہے، محنت میں تاثیر ہے، اللہ تعالی کی رضا اور اللہ تعالی کے خوف میں تاثیر ہے، لوگوں کی خدمت اور اللہ کی عبادت میں جو تاثیر ہے اس سب کو سامنے رکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ حساب ہر وقت قریب ہے اور وہ بالکل پیش نظر ہے اور وہ ہمارے سامنے ہے۔

اس لیے اللہ تبارک وتعالی نے ان سارے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے، اللہ عالم الغیب والشہادہ ہے، وہ اس کلام کا نازل کرنے والا ہے اور یہ کلام تمام عالم پر محیط ہے، پوری زندگی پر محیط ہے، اور پورے زمانے اور تاریخ پر محیط ہے۔ اس سب کو سامنے رکھتے ہوئے بالکل یہ آیت بذات خود اپنی جگہ پر ایک معجزہ ہے۔ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سب کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ" "لوگوں کے لیے ان کا حساب قریب آگیا ہے اور وہ "غفلت" میں "اعراض" کیے ہوئے ہیں۔

دین الٰہی سے انحراف کا سبب

دین الٰہی سے انحراف کا ایک عام سبب غفلت ہے اللہ سے بے تعلقی اور اس کے احکام وفرائض کی طرف سے بے توجہی کا سبب ہمیشہ بغاوت وکفر ہی نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات دنیا پرستی اور مادیت ہوتی ہے عزت وجاہ کا سودا، دولت کا عشق اور معاش میں سرتاپا انہماک آدمی کو معاد سے بالکل غافل کر دیتا ہے، مادیت کا ایسا غلبہ ہوتا ہیکہ سرے سے نجاب کا خیال رضائے الٰہی کے حصول کا شوق اور اس کے عذاب کا خوف دل سے بالکل نکل جاتا ہے اور کھانے پینے اور پہننے کے سوا دنیا میں کوئی فکر باقی نہیں رہتی، خدا سے غافل لوگوں کی صحبت اور گناہوں اور عیش میں انہماک دل کو ایسا مردہ کر دیتا ہے کہ دینی اور اخلاقی حس باطل ہو جاتی ہے، نیک وبد اور حلال وحرام کی تمیز جاتی رہتی ہے، ایسے غافل اپنے اخلاق واعمال سیرت وکردار، معاشرت وآداب اور وضع وصورت میں کافروں اور اللہ کے باغیوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہتے، شراب کے بے تکلف دور چلتے ہیں، منہیات ومحرکات کا آزادی سے ارتکاب کیا جاتا ہے، جرائم اور فسق وفجور میں نئی نئی ایجادات کی جاتی ہیں اور ان میں ایسی ذہانت اور ہنرمندی کا اظہار کیا جاتا ہے کہ پرانی امتیں ان کے سامنے مات ہو جاتی ہیں، شرع ودین کی کوئی حرمت باقی نہیں رہتی، ایسی خدا فرموشی اور خود فراموشی طاری ہو جاتی ہے کہ بھول کر بھی خدا یاد نہیں آتا اور اپنا بھی حقیقی ہوش نہیں رہتا۔ (۱)

اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ" لوگوں کے ان کا حساب قریب آ گیا ہے" پوری دنیا کی تصویر ہے کہ حقیقتاً دنیا کے فرد فرد کا الگ اور افراد کے مجموعے جو جماعتیں ہیں اور قومیں ہیں اور زمانہ ہے اور جس کو عہد کہتے ہیں پورے عہد کا حال یہ ہے کہ "اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ" سب کا حساب قریب ہے، کسی وقت اللہ تعالیٰ لے سکتا ہے، کسی وقت کوئی بلا نازل ہو سکتی ہے، کسی وقت کوئی طوفان آ سکتا ہے، کسی وقت کوئی انقلاب آ سکتا ہے، کسی وقت خون کے دریا بہہ سکتے ہیں (اور ابھی آپ نے دیکھا قریب کے فسادات میں کہ کیا کچھ نہیں ہوا) "حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے لیے

(۱) اسلام کے قلع ص: ۵۸-۵۹

ان کا حساب قریب آگیا ہے اور وہ غفلت میں اعراض کیے ہوئے ہیں'' ''وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ'' لیکن لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، وہ منہ پھیرے ہوئے ہیں اور یہ منہ پھیرنا جو ہوتا ہے جسمانی طور پر ضروری نہیں ہے کہ آدمی منہ پھیر لے۔ عربی میں ''اعراض'' کے معنی بے رخی، بے تعلقی کے بھی ہیں ''اعراض'' جسمانی بھی ہوتا ہے اعراض قلبی بھی اور اعراض فکری بھی لیکن اعراض فکری اور اعراض معنوی، اعراض جسمانی سے بھی زیادہ خطرناک ہے''۔ (۱)

ایک بہت بڑی انسانی کمزوری

''مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ، لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ'' پھر اس میں ایک بڑی انسانی کمزوری، انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں کمزوریوں پر اللہ تعالیٰ نے توجہ دلائی ہے، اشارہ کیا ہے اس کی طرف کہ یہ انسانی کمزوری ہے کہ ''مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ'' ان کے پاس کوئی نصیحت نہیں آتی ان کے رب کی طرف سے نئی اور یہ ''محدث'' ''نئی'' کا لفظ اس لیے کہا کہ یہ بالکل فطری بات ہے کہ جو چیز بالکل نئی ہوتی ہے اس کی طرف توجہ خود ہوتی ہے، اخبار کیوں دیکھا جاتا ہے؟ دنیا وہی ہے جو کل تھی، لیکن آپ اخبار کیوں دیکھتے ہیں؟ ہم نے آج صبح اخبار دیکھا نئی چیز کی تلاش میں، نئی چیز کے علم کے لیے، اس نئی چیز کا جو تقاضا ہے اس کا سامان کرنے کے لیے تو یہ لفظ ''محدث'' یونہی نہیں کہہ دیا گیا کہ ''ان کے پاس کوئی نیا ذکر، کوئی نئی نصیحت نہیں آتی مگر وہ اعراض کرتے ہیں، اس لیے کہ نئی چیز کی فطرت میں اللہ نے یہ مادہ رکھا ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے اور وہ آدمی کو بیدار کردے اور ہوشیار کردے ورنہ زمانے کا جو تسلسل ہے، یہ دریا جو بہہ رہا ہے زمانے کا، یہ تو اسی طرح سے بہہ رہا ہے، جیسے آپ ندی کو دیکھ رہے ہیں، ''محدث'' ''نئی'' کی کیا حقیقت ہے؟ زمانے کا دریا اسی طرح سے بہہ رہا ہے، لیکن جب اس میں کوئی نئی موج اٹھتی ہے، جب اس میں کوئی نیا موتی سامنے آتا ہے، یا کوئی نیا جانور سر اٹھاتا ہے، یا اس میں ایک سیلابی کیفیت ہوتی ہے اور اس میں

(۱) تحفۂ دین و دانش ص: ۷۸

ٹکراؤ ہوتا ہے، تو آدمی دیکھنے لگتا ہے، ورنہ یہ تو دریا اسی طرح سے ہے۔

غفلت کی آخری شکل

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کے باوجود بھی نہیں دیکھتے یہ، مقصود یہ کہنا ہے کہ صرف ''غفلت'' ہی نہیں بلکہ ''غفلت'' کی آخری شکل کہ نئی چیز جو آتی ہے نئے خطرات لاتی ہے اپنے ساتھ اور وہ نئی آگاہی نئی خبرداری لاتی ہے، توجہ کی دعوت دیتی ہے، اس کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے لوگ اور اگر آپ دنیا کے حالات پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہی دنیا میں ہو رہا ہے، یہی امریکہ میں ہو رہا ہے یہی یورپ میں ہو رہا ہے، یہی عجم میں ہو رہا ہے، یہی مشرق میں ہو رہا ہے، یہی عرب میں ہو رہا ہے،''مَایَاتِیْھِمْ مِنْ ذِکْرٍ مِّنْ رَّبِّھِمْ مُحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْہُ وَھُمْ یَلْعَبُوْنَ'' کیا ہو رہا ہے ان ملکوں میں؟ کیا خرابی نہیں ہو رہی ہے، کیا خطرے کی بات نہیں پیدا ہو رہی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ سے کون سی سرکشی کا کام نہیں ہو رہا ہے، لیکن لوگ گھبرا نہیں رہے ہیں، لوگ اسی طریقے سے اپنے مشاغل میں لگے ہوئے ہیں، اسی طریقے سے عیش کر رہے ہیں، اسی طریقے سے کھانے کمانے میں مصروف ہیں، یہ نہیں کہ جو نیا واقعہ آج پیش آیا ہے ہمارے ملک میں یا زمانے میں، وہ ان کو جھنجھوڑ دے، وہ ان کو جگا دے، وہ ان کو پریشان کر دے کہ خدا خیر کرے کیا ہونے والا ہے اس وقت کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے، آنے والی نسلوں کا حال کیا ہوگا، ہم پر کیا ذمہ داری ہے۔ اب روز اخبار میں ہم پڑھتے ہیں وہ باتیں ہوتی ہیں، جن پر اللہ کا غضب نازل ہونا چاہیے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی آسمانی کتابوں میں خاص طور پر قرآن مجید میں ان لوگوں کے اعمال ''ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ لِیُذِیْقَھُمْ بَعْضَ الَّذِی عَمِلُوا لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ'' (الروم:۴۱) یہ اس میں بتا دیا گیا کہ پورے کی تو برداشت نہیں ''لِیُذِیْقَھُمْ بَعْضَ الَّذِی عَمِلُوا'' ان کے بعض اعمال کا مزہ اللہ چکھاتا ہے کہ وہ لوٹیں حقیقت کی طرف آئیں مگر وہ نہیں آتے، تو یہ انسان کی ایک بہت بڑی کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ صرف اتنا ہی نہیں کہ ''اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُھُمْ وَھُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ'' لوگوں کا حساب ان کے قریب آگیا ہے اور اب بھی غفلت میں وہ منہ پھیرے

ہوئے ہیں، روگرداں ہیں، غافل ہیں بلکہ ''مَایَاتِیْھِمْ مِنْ ذِکْرٍ مِّن رَّبِّھِم'' '' محدث'' نئی چیز بھی جو کوئی پیش آتی ہے، نیا عبرت کا سامان جو ان کے سامنے آتا ہے ''الا استمعوہ'' اس پر بھی وہ اس کو سن لیتے ہیں دیکھ لیتے ہیں اور اپنی تفریحات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ''ھم یلعبون'' کا مطلب یہ نہیں کہ ہاکی کھیلتے ہیں، کرکٹ کھیلتے ہیں، ٹینس کھیلتے ہیں، یا اور کوئی اس طرح کا کھیل کھیلتے ہیں شطرنج کھیلتے ہیں۔

''یلعبون'' میں سب آگیا اور ''یلعبون'' میں جو چیز جو اس کی اصل روح ہے اور جو قدر مشترک ہے ان سب چیزوں میں وہ ہے ''غفلت'' وہ ہے انہماک، انہماک اور یکسوئی اور کھیل جب کھیل ہوتا ہے، جب آدمی اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل غافل ہیں اور اپنی تفریح میں پڑے ہوئے ہیں۔ ''لاھیة قلوبھم'' ''دل ان کے غافل ہیں، دل ان کے تفریحی سامان میں مشغول ہیں'' اس وقت آپ اگر دنیا کی حالت پر نظر ڈالیں مغرب سے لے کر مشرق تک اور متمدن اور ترقی یافتہ دنیا سے لے کر کے پسماندہ اور پست حال دنیا تک اور ان میں سے بھی اہل ثروت سے لے کر فقراء تک، اہل علم سے لے کر جہلاء تک اہل عقل سے لے کر بے شعور لوگوں تک اور حاکم سے لے کر محکوم تک اور محکوموں کے بھی جو طبقات ہیں، ان میں بڑے اور چھوٹے سب کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو یہ بالکل دنیا کا نقشہ ہے کہ ''اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُھُمْ وَھُمْ فِیْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ'' معلوم نہیں کس وقت کس عمل کی کیا سزا ملنے والی ہے، یہ جنگیں جو پیش آتی ہیں یہ زلزلے جو پیش آتے ہیں، یہ فصل کی خرابی اور گرانی اور پھر اس کے بعد فسادات اور تصادم اور اس میں حق تلفی اور ظلم اور سفا کی یہ ساری چیزیں لوگوں کے عمل کا نتیجہ ہیں، اس لیے (کہنا چاہیے) کہ بہت دور ہے وہ حساب جو قیامت میں ہوگا۔

یہ آیت پیش نظر رکھنے کی ہے اس میں صرف قیامت کی خبر نہیں دی گئی ہے بلکہ اعمال کے نتائج کی طرف اور اپنے اور اپنی زندگی کے محاسبے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ (۱)

---

(۱) درسِ قرآن سورہ انبیاء: ۱-۲ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ بالا اقتباسات بالترتیب مندرجہ ذیل کتب سے ماخوذ ہیں: ☆ اسلام کے قلع ص: ۵۸-۵۹ ☆ تحفۂ دین ودانش ص: ۷۸

بلاغت واعجاز

قرآن..............

صرف اپنے الفاظ وترکیب اور فصاحت وبلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے، اپنے معانی ومضامین میں بھی، اپنے اعلیٰ علوم ومعارف میں بھی، معلوماتِ غیبی اور حقائقِ ابدی میں بھی، اپنی پیش کی ہوئی مذہبی واخلاقی ومعاشرتی اور مدنی تعلیمات میں بھی، اپنے اثرات وانقلاب میں بھی، اپنی پیشنگوئیوں اور اخبار میں بھی معجزہ ہے''

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۴۵

قرآن مجید کی ایک امتیازی اور مرکزی صفت
''الفرقان''

﴿ تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْراً ﴾
(الفرقان: ۱)

یہ سورہ ''الفرقان'' کی پہلی آیت ہے، اس سورہ کا جو مرکزی مضمون ہے اور اس کا جو خاص پیغام اور مقصد ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین دینا ہے اور کفار آپ پر جو اعتراضات کر رہے تھے، اور اس میں جو شبہات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے،، اور ذاتِ نبوی پر حملے کر رہے تھے، ان سب کا اللہ کی طرف سے جواب ہے اور اس میں کلامِ الٰہی کی حقیقت، کلامِ الٰہی کا امتیاز جو ہوتا ہے، وہ بیان کیا گیا ہے، اسی لیے اس سورہ کا نام ''الفرقان'' رکھا گیا ہے، یہ بہت ہی برموقع اور مناسبِ حال ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ''تَبَارَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْراً''. (بڑی برکت والی ذات ہے اللہ کی، جس نے کہ الفرقان نازل کیا اپنے بندے پر، تاکہ وہ اہلِ عالم کے لیے، دنیا کے لیے ڈرانے والا بنے)۔

''الفرقان'' دیکھنے کو تو ایک کلمہ ہے، اس کے حروف آپ گن سکتے ہیں، مفرد لفظ ہے،

لیکن بڑا وسیع المعانی، عمیق المعانی، حسبِ حال اور بہت بڑی امتیازی چیز ہے۔

قرآن مجید کی جہاں اور صفات اور امتیازات ہیں، ان میں ایک بڑی صفت اور مرکزی صفت جو ہے، وہ ہے ''الفرقان''! فاروق اور ممیّز ہے۔

یعنی عبودیت و معصیت، ہدایت و ضلالت اور توحید و شرک اور ایمان و کفر اور معصیت و غیر معصیت، انسان اور غیر انسان، کلامِ الٰہی اور کلامِ انسانی، ان سب کے درمیان وہ امتیاز پیدا کرنے والا ہے۔ اللہ جن کو توفیق دے اور اللہ نے ان کو ذہن رسا عطا فرمایا ہو، بلکہ ذہن رسا سے بھی آگے بڑھ کر قلب کی بیداری عطا کی ہو۔ وہ اس لفظ کی وسعت کو اور اس کے انطباق کو اور اس کے امتیازات کو سمجھ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''بابرکت ہے وہ ذات جس نے الفرقان نازل کیا'' ایک ایسا کلام نازل کیا کہ جو حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کر دیتا ہے۔

سب سے پہلا اس کا کام یہ ہے کہ حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کے درمیان امتیاز پیدا کرے بشر اور خالقِ بشر کے درمیان امتیاز پیدا کرے اور یہ وہ گمراہیاں تھیں، مذاہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف دوروں میں ہزاروں برس سے چلی آ رہی ہے، کبھی انسان اور خالقِ انسان کے درمیان فرق نہ کرنا، کبھی خالقِ کائنات اور قادرِ مطلق کے درمیان اور جس کو ایک محدود استطاعت دی گئی ہے، کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے، تھوڑا سا (Risk) دیا گیا ہے، یا تھوڑی حکمت دی گئی ہے، یا تھوڑا سا حکم چلانے کا موقع دیا گیا، ان دونوں کے درمیان فرق نہ کرنا۔

تو زیادہ تر گمراہیاں اس خلطِ مبحث سے پیدا ہوئی ہیں، جو مذاہب کی تاریخ میں آپ دیکھیں گے اور زیادہ سے زیادہ جو قدرِ مشترک پائیں گے، وہ ہے خلطِ مبحث یعنی یہ کہ دو ممیّز و ممتاز بلکہ متضاد چیزوں میں فرق نہ کرنا اور ان کو ایک دوسرے سے ملا دینا، اس کو تلبس بھی کہتے ہیں۔ اس تلبس کا شکار ہوئی ہیں امتیں اور حاملینِ کتاب، یہودی بھی اسی تلبیس کا شکار ہوئے ہیں، اپنے انبیاء کے بارے میں اور انبیاء کی نسل کے بارے میں جس میں خود یہود ہیں، ان کے بارے میں اور انسانوں کے بارے میں جو فرق ہے، اسی لیے یہ قرآن کا

معجزہ ہے کہ نصاریٰ کے لیے اس نے "ضَآلِّین" کا وصف بیان کیا ہے، اور یہود کے متعلق "المَغضُوبِ عَلَیھِم"!!

اس چھوٹے سے ٹکڑے کو پڑھ کر اگر کوئی شخص مسلمان ہو جائے، کوئی غیر مسلم جس کی تاریخ پر گہری نظر ہے، تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لیے کہ اصل میں "ضلالت" کے لفظ کو ہم اچھی طرح سمجھتے نہیں، جو لفظ عربی کے اردو میں خود عربی میں موقع پر استعمال ہوتے ہیں، چھوٹے محمل پر بھی استعمال ہوتے ہیں، بڑے محمل پر بھی استعمال ہوتے ہیں، ان میں وہ اثر باقی نہیں رہتا، ان سے آدمی وہ فائدہ نہیں اٹھاتا اور اکثر مغالطہ میں پڑ جاتا ہے، ہم معمولی سی چیز کو یہاں ضلالت کہہ دیتے ہیں۔

اصل میں عربی زبان میں ضلالت کے معنی ہیں، غلط راستے پر پڑ جانا، ہمارے یہاں کوئی ذرا سی غلطی کرے تو کہیں گے ضلالت ہے، کوئی اگر حد سے زیادہ تجاوز کرے تو کہدیں گے ضلالت ہے، کوئی کوتاہی ہو جائے تو کہدیں گے ضلالت ہے۔

اصل معنی ہیں ضلالت کے "غلط راستہ اختیار کر لینا" راستہ مشرق کو جانے والا ہے تو مغرب کی طرف جانے والے راستہ پر پڑ جائے!

عیسائیوں کے ساتھ یہی ہوا کہ ۶۰ ؍برس مشکل سے گذرے ہوں گے حضرت مسیحؑ کو دنیا سے تشریف لے جائے ہوئے کہ ایک شخص سینٹ پال (۱۰ء-۶۵ء) پیدا ہوا، جو رومی تھا، اور اس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ رومی سلطنت کی ایک شازش تھی!

تاریخ مذاہب کا بہت گہرا مطالعہ کیا جائے، اور اس کا جو پسِ منظر (Back Ground) ہے، اس کو دیکھا جائے۔ انگریزی کتابوں میں، رومن امپائر کی تاریخ میں اور عیسائیت پر بھی جو ناقدانہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ تو معلوم ہوگا کہ، عیسائی مذہب جتنی جلدی تحریف کا شکار ہوا، بہت کم مذاہب اتنی جلدی کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں اور تحریف کے۔

"ضَآلِّین" کے معنی کیا ہیں؟ کسی شخص کو مثلاً کلکتہ جانا ہو، لکھنؤ کی طرف سے راستہ ہے اس کے لیے وہ دہلی جانے والی گاڑی پر بیٹھ جائے، یہ ہے "ضلال"! اب گاڑی جتنی تیز چلے گی، جتنی دیر تک چلے گی وہ اپنی منزل سے دور ہوتا جائے گا، اس کو کہتے ہیں راستہ

بدل دینا اور پھر اسی راستہ پر چلتے رہنا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا زیادہ چلتا ہے، اتنا ہی وہ منزلِ مقصود سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

عیسائیت کا حال یہی ہے کہ وہ اپنی منزل سے دور ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ وہ عیسائی ہے لکھنے والا، وہ لکھتا ہے کہ یہ عیسائیت کسی معنی میں بھی حضرت عیسیٰؑ کی سکھائی ہوئی عیسائیت نہیں ہے، یہ سینٹ پال کی سازش ہے اور اس کی تحریف ہے، سینٹ پال کا بنایا ہوا ایک چکر ہے اور ایک جعل سازی ہے!!

تو اللہ فرماتا ہے "تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الفُرْقَانَ" "بڑا برکت والا ہے وہ جس نے الفرقان کو نازل کیا" یہاں "الفرقان" کی بلاغت، اس کی وسعت اور اس کا انطباق، اس کی صحتِ انطباق اور اس کلمہ کی اصل جو طاقت ہے، اس وقت تک سمجھ میں نہیں آئے گی، جب تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف منسوب کئے ہوئے کلام اور کتابیں مثلاً تورات کے صحیفے اور پھر اس سے بڑھ کر یہاں وید کا جو ایک دفتر ہے، وہ جب تک نہ پڑھے گا آدمی، قرآن مجید کی صفت "الفرقان" اس کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

اس کو "الفرقان" کہا گیا۔ یہ فارق بین الحق والباطل ہے، وہاں حق وباطل ممزوج ہیں، وہاں ہدایت وضلالت ممزوج ہیں، وہاں توحید وشرک بلکہ شرک غالب ہے توحید پر!

اگر آپ وید وغیرہ پڑھیں تو اس میں فلاں میں یہ خاصیت، فلاں میں یہ خاصیت، فلاں یہ کر سکتا ہے، کرشن یہ کر سکتے ہیں، گنیش یہ کر سکتے ہیں، رام یہ کر سکتے ہیں اور سارا ہندو مذہب سب اسی سے ماخوذ ہے اور وہ سب ایک آمیزہ ہے، ایک معجون مرکب ہے۔

تھوڑی سی توحید کہیں کہ اللہ کی کہیں شان آگئی اور باقی یہ بڑے بڑے کام دنیا کے جو ہیں، زندگی دینا، مرتے ہوئے کو جلا دینا اور ہارے ہوئے کو اختیار دینا، یہ سارے کام کوئی ایسا کام خارقِ عادت نہیں جو کسی دیوتا کی طرف منسوب نہ کیا گیا ہو!

"لیکن اسلام میں دین کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے، جو بہت سے اہل مذاہب نے اپنے مذہب کا قائم کرلیا ہے، یہاں انسان کے متعلق اصولی تخیل یہ ہے کہ وہ "عبد" (خدا کا بندہ ہے) اور وہ اپنی زندگی کے کسی شعبہ اور گوشہ میں بھی اس دائمی غلامی سے آزاد نہیں ہے، اس

کا ہر کام، یہاں تک کہ اس کی بادشاہی (جو بظاہر غلامی کے منافی معلوم ہوتی ہے) اس کی عبدیت ہی کا ایک مظہر ہے، اس تخیل کے مطابق مذہب وسیاست کی تفریق کی بحث یہاں پیدا ہی نہیں ہوتی، اس ''عبد'' کو اس کے ''مولیٰ'' کی طرف سے قرآن کی صورت میں ایک کلی اور اصولی مکمل دستور العمل دیے دیا گیا ہے، اس دستور العمل کی ہدایت میں ''عبدیت'' کی پوری زندگی کامیابی کے ساتھ گذاری جا سکتی ہے، اس کتاب کو کسی سیاسی ضمیمہ کی ضرورت نہیں''۔ (۱)

''تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعٰلَمِينَ نَذِيراً'' (اس نے اپنے بندے پر الفرقان کو نازل کیا، تا کہ وہ اہلِ عالم کو ڈرانے والا بنے) اب دیکھئے اس میں خاص بات ہے کہ ''الفرقان'' اور ''نذیر'' دونوں میں خاص مناسبت ہے، قرآن کی کوئی صفت بیان کی جائے سب صحیح ہے، لیکن ''نذیر'' کا جہاں تک تعلق ہے، یعنی عملِ انذار کا اس کے لیے ''الفرقان'' ہی سب سے مناسب ہے! جو چیز ''الفرقان'' کہلانے کی مستحق ہے، فارق بین الحق والباطل ہے، وہی ''انذار'' کا کام کرسکتی ہے!

آپ تھرمامیٹر رکھیں جو بتاتا ہے کہ اتنی گرمی اتنی سردی، وہی بتائے گا، اسی طریقہ سے آپ کوئی تولنے والی چیز، دودھ اور پانی کو الگ الگ کر دینے والی چیز اور جو مختلف مواد ہیں، جو ان کا امتزاج ہو جاتا ہے، ان میں فرق کرنے والے چیز کوئی ہو، اس سے وہ کام لیا جاسکتا ہے!

تو چونکہ یہ ''الفرقان'' ہے اس لیے ''العالمین'' کے لیے ''نذیر'' ہے! یہ حق وباطل کے درمیان صرف فرق ہی نہیں کرتا بلکہ ڈراتا بھی ہے کہ باطل کے اختیار کرنے سے یہ ہوگا، حق کو چھوڑ دینے سے یہ ہوگا، !

''قرآن ''فرقان'' (فاروق اور ممیّز) ہے اور یہ اس کی ایسی امتیازی صفت ہے، جو اس کے نام کے قائم مقام ہوگئی ہے، ''تَبَارَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعَالَمِيْنَ نَذِيراً'' ''بڑی عالیشان ذات والا ہے، جس نے یہ فیصلہ کی کتاب

(۱) درس قرآن، سورۂ الفرقان: ۱ (غیر مطبوعہ)

اپنے بندۂ خاص پر نازل فرمائی، تاکہ وہ تمام دنیا جہان والوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔

قرآن مجید نے ہدایت وگمراہی میں، ایمان وکفر میں، اسلام اور جاہلیت میں، خدا کی رضا وعدم رضا میں، یقین وظن میں، حلال وحرام میں، قیامت تک کے لیے جو فصل و امتیاز پیدا کردیا ہے، اس کی نظیر سے مذہبی تعلیمات اور آسمانی صحیفوں کی تاریخ خالی ہے، مثال کے طور پر توحید وشرک میں اس نے جو عظیم الشان تفریق پیدا کردی ہے اور اس بارے میں ادنیٰ احتمال اور ضعیف سے ضعیف اشتباہ کو اس نے جس طرح دور کیا، وہ اس کا اعجاز ہے''۔ [۱][۲]

---

(۱) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۲۶-۲۷

(۲) درس قرآن، سورۂ الفرقان: ۱ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ مندرجہ اقتباسات: ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۲۶-۲۷، سے ماخوذ ہیں۔

غلبۂ روم کی پیشین گوئی

﴿آلٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِی أدْنَی الأرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ.فِی بِضْعِ سِنِیْنَ.لِلّٰهِ الأمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ.وَیَوْمَئِذٍ یَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ یَنْصُرُ مَنْ یَشَاءُ. وَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ .وَعْدَ اللّٰهِ لایُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهُ.وَلٰکِنَّ أکْثَرَ النَّاسِ لاَ یَعْلَمُوْنَ.یَعْلَمُوْنَ ظَاهِراً مِنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ عَنِ الآخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ﴾ (الروم: ۱-۷)

''اہل روم مغلوب ہوگئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوجائیں گے، (یعنی) چند ہی سال میں پہلے بھی اور پیچھے بھی، خدا ہی کا حکم ہے اور اس روز مومن خوش ہوجائیں گے (یعنی) خدا کی مدد سے، وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے، وہ غالب (اور) مہربان ہے (یہ) خدا کا وعدہ (ہے) خدا اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے یہ تو دنیا کی ظاہر زندگی ہی کو جانتے اور آخرت کی طرف سے غافل ہیں''۔

قرآن مجید کا ایک اعجاز اس کی پیش گوئیاں ہیں، معجزہ اسی چیز کو کہتے ہیں، جو خارق عادت طریقہ پر محض خدا کی قدرت سے کسی پیغمبر کی تصدیق کے لیے ظاہر ہو اور انسانی عقل اس کی ظاہری توجیہ وتعلیل سے قاصر ہوں، جن حالات میں یہ پیش گوئیاں کی گئی ہیں، اور

جس طرح ان کا ظہور ہوا وہ ایک معجزہ ہے، ان پیشگوئیوں میں اعجاز کے دو پہلو جمع ہیں، ایک ان (بظاہر) ناموافق حالات میں ان کا بعید از قیاس اور اہم واقعات کا محض علم واطلاع دوسرے اس اطلاع کے عین مطابق ان کا ظہور ووقوع۔

ان سب پیشن گوئیوں میں سب سے زیادہ صاف اور محیر العقول پیشن گوئی غلبۂ روم کی پیشن گوئی ہے، یہ پیشن گوئی ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔ ''غُلِبَتِ الرُّوُمُ فِی أَدۡنیٰ الأَرۡضِ. وَهُمۡ مِنۡ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُوۡنَ فِی بِضۡعِ سِنِيۡنَ'' (اہل روم مغلوب ہو گئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہو جائیں گے، (یعنی) چند ہی سال میں۔

اس پیشن گوئی کا اسلوب اور سیاق وسباق بتاتا ہے کہ اس کو قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معجزہ اور ان دونوں کی صداقت کے ایک ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے اور یہ بالکل غیر معمولی اور غیر عادی واقعہ ہے، اس لیے کہ رومیوں کا یہ غلبہ ان کی انتہائی مغلوبیت کے بعد ہوا ہے، اس لیے آیت کی ابتداء میں دوجگہ ان کی مغلوبیت کا ذکر کیا گیا ہے، ''فِی بِضۡعِ سِنِيۡنَ'' ''یعنی چند ہی سال میں''۔

اس واقعہ غرابت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ واقعہ نو سال کے اندر اندر پیش آئے گا، جو ایک برباد شدہ سلطنت اور ایک زوال پذیر قوم کے ابھرنے اور فاتح کو مفتوح بنا لینے کے لیے ناکافی مدت ہے، ''بِضۡعِ سِنِيۡنَ'' .... کوئی بات اتنی خلاف قیاس اور اتنی ناقابل قیاس اور اتنی بعید از امکان نہیں تھی، جتنا اس زمانے میں یہ کہنا کہ ''بضع سنین'' چند سال کے اندر (نو تک غالباً ''بضع'' کا اطلاق ہوتا ہے،) کہ اتنے سال میں رومی غالب آجائیں گے۔

جب سورہ روم کی یہ ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں اور کفار مکہ کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس کو بالکل مستبعد واقعہ سمجھ کر مسلمانوں کے ساتھ شرط کی کہ اگر رومی واقعی غالب آگئے تو وہ مسلمانوں کو کئی اونٹ دیں گے اور اگر اس واقعہ کا ظہور نہ ہوا تو مسلمان اونٹ ہار جائیں گے، حضرت ابوبکرؓ نے جو شرط میں شریک تھے، اس کے لیے پانچ سال کی مدت

مقرر کی، آنحضرت ﷺ کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا "بضع" کا لفظ تین سے نو تک بولا جاتا ہے، اس لیے دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہیئے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے نو سال کی شرط کی۔

انگریز مؤرخ وادیب ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) کی تاریخ "زوال روما" (Decline fall of theRoman Empire) ہے، وہ لکھتا ہے:

"محمد ﷺ نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشن گوئی کی، کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے، جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی، اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال سلطنتِ روما کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کررہے تھے"(۱)

گبن کہتا ہے کہ: رومیوں کی شکست اس درجہ کو پہنچ گئی تھی، ایرانی بازنطینی سلطنت کے مرکز میں اور صلیب مقدس (TRUE CROSS) اس کو وہاں سے لے گئے تھے اور پھر اس کے بعد وہ عراق میں بھی گھس گئے تھے، جہاں جہاں رومی ممتلکات تھے۔

تو یورپین مؤرخین نے اس کو مانا ہے، کہ رومیوں کی شکست کہاں تک پہنچ گئی تھی اور اس حالت میں رومیوں کی فتح کی پیشین گوئی کرنا کتنا بعید از قیاس تھا۔؟ وہ کہتے ہیں کہ "اس سے زیادہ بعید از قیاس بات کہی ہی نہیں جا سکتی تھی!

یہ بات قیاس میں آئی ہی نہیں سکتی تھی، بالکل انہونی بات تھی، جیسے امر مستحیل جس کو کہتے ہیں، ایک مستحیل امر تھا۔ لیکن پورے وثوق کے ساتھ کہا گیا "غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِي أَدْنَى الْأَرْضِ، وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِي بِضْعِ سِنِيْنَ" "اہلِ روم مغلوب ہوگئے، نزدیک کے ملک میں، اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہوجائیں گے، (یعنی) چند ہی سال میں۔

اور ۶۲۵ء میں یعنی ہجرت کے دوسرے سال غزوۂ بدر کے موقعہ پر ٹھیک نو برس کے اندر) قرآن مجید کی یہ عظیم الشان پیشین گوئی پوری ہوئی، جس کی تکمیل کے کوئی ظاہری آثار

(۱) مطالعۂ قرآن کا اصول ومبادی: ۸۷-۱۰۰

وقرائن نہ تھے، یہ بالکل ایک اعجاز کی بات ہے، اس کو یورپین مؤرخین نے مانا ہے۔

آیات کے دوسرے حصے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یہ واقعہ خارق عادت طریقہ پر ظاہری آثار وقرائن کے بالکل خلاف اور عام انسانی قیاسات وتوقعات کے برعکس ظہور پذیر ہوگا، چنانچہ پہلے فرمایا "لِلّٰهِ الأمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ" "پہلے بھی اور پیچھے بھی اللہ ہی کا حکم ہے،" جس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کو ہر وقت اختیار ہے، اس کو غالب کو مغلوب اور مغلوب کو غالب، مردہ کو زندہ اور زندہ کو مردہ کرتے کچھ دیر نہیں لگتی، اس کے لیے کسی وقت کی کوئی قید اور سازگار حالات کا انتظار نہیں، وہ دن رات ایسے تصرفات کیا کرتا ہے: "قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ. اِنَّكَ عَلىٰ كُلِّ شَيءٍ قَدِيْرٌ. تُوْلِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ" (آل عمران: ع-۳) "کہو کہ (اے) خدا (اے) بادشاہی کے مالک تو جس کو چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے، ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے (اور) بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے، اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق بخشتا ہے"۔

پھر آگے چل کر فرمایا کہ یہ واقعہ محض خدا کی مدد کا نتیجہ ہوگا اور مسلمان ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں سے قریب تر ہونے اور کفار کے طنز وتعریض کی وجہ سے اسی درجہ بلکہ اس سے زیادہ مسرور ہوں گے، جتنے رومیوں کی شکست سے وہ محزون ہوئے، "وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ. بِنَصْرِ اللّٰهِ" "اور اس روز مومن خوش ہو جائیں گے، یعنی خدا کی مدد سے"۔ ممکن ہے کہ اس سے خود مسلمانوں کی اس عظیم الشان اور فیصلہ کن فتح کی طرف اشارہ ہو، جو بدر کے میدان میں ٹھیک اسی دن پیش آئی، جس دن رومی ایرانیوں پر غالب ہوئے۔

اس پر یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رومی عیسائیوں کی مدد کیوں کرے گا، فرمایا ''یَنۡصُرُ مَنۡ یَشَاءُ'' ''جس کی وہ چاہے مدد کرے'' اور اپنی ان صفتوں کا ذکر کیا، جن کا اس محیر العقول واقعہ سے خاص تعلق ہے اور اس کے امکان وظہور کے لیے ایک دلیل کے طور پر ہیں، ''وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ'' ''اور وہ غالب اور رحیم ہے''۔

''یہاں صفات میں سے انتخاب کیا ''غالب'' اور ''رحیم'' کا.........کہ ایسا ''غالب'' ہے جو ''رحیم'' بھی ہے، صرف ''غالب'' ہوتا تو ان کا بالکل خاتمہ کر دیتا اور ان کا بالکل دم ہی باقی نہ رہتا، لیکن وہ ''رحیم'' بھی ہے۔

تو ''عزیز'' اور ''رحیم'' کے مل جانے نے ''عزت'' اور ''رحمت'' کے مل جانے نے ایسی صفت جامعہ پیدا کی کہ جس میں ''غلبہ'' کے ساتھ ''رحمت'' ہے اور ''رحمت'' کے ساتھ ''غلبہ'' ہے، بعض ''رحمتیں'' ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں ''غلبہ'' نہیں ہوتا ہے، لوگ کہتے کہ یہ تو یہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ معاف نہ کرتے تو کیا کر سکتے تھے؟ تو صرف ''رحمت'' میں یہ بات ہوسکتی ہے اور ''غالب'' میں یہ ہوسکتی ہے کہ ''غالب'' ہے اس لیے ''رحم'' نہیں آتا۔

لیکن جب وہ ''العزیز الرحیم'' ہے تو پھر اس کے بعد جہاں وہ مناسب سمجھتا ہے رحمت کا معاملہ کرتا ہے اور جہاں مناسب سمجھتا ہے ''عزت'' کا معاملہ کرتا ہے........اور اس کے سارے افعال اور دنیا میں، پچھلی تاریخ میں اور اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر۔ ان سب میں آپ دیکھئے کہ اعمال کے جو نتائج نکل رہے ہیں، ان میں کہیں ''عزت'' کا ظہور ہو رہا ہے، اور کہیں ''رحمت'' کا ظہور ہو رہا ہے''![1]

اس واقعہ کے وقوع میں ان دونوں صفتوں کا ظہور ہوا، ایرانیوں کے لیے جو اپنی فتح کے نشہ میں سرشار تھے، عزت وغلبۂ خداوندی کا اور رومیوں کے لیے جن کا جسم اور قلب زخموں سے چور چور تھا اور ان کی سلطنت عالم سکرات میں موت کی سسکیاں لے رہی تھی، ان کے پچپاس ہزار آدمی قید اور ان کی قوم طرح طرح سے ذلیل کی جارہی تھی، رحمتِ الٰہی کا ظہور تھا، پھر ان مسلمانوں کے لیے جن کو ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی شکست سے

---

(۱) درس قرآن، سورۂ شعراء:۱۱ (غیر مطبوعہ)

طبعی طور پر رنج پہنچا تھا، شادمانی کا پیام تھا اور خود ان ے آئندہ غلبہ کی پیشین گوئی اور اس کا اشارہ تھا، پھر اس کی مزید تاکید فرمائی کہ اس میں تخلف نہیں ہوسکتا۔ "لا یُخلِفُ اللّٰہُ وَعدَہٗ" (روم: ۳۰) "اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا"۔

پھر آخری طور پر بتا دیا کہ یہ واقعہ انسان کی ظاہری معلومات اور روزمرہ کے تجربات کے خلاف پیش آئے گا، اس لیے بہت سے لوگ اس کے وقوع سے پہلے اس کی تصدیق کرنے سے عاجز ہوں گے اور اپنے ظاہری عالم سے اس کا قیاس نہ کرسکیں گے "وَلٰکِنَّ النَّاسَ لا یَعلَمُونَ" (النمل: ۳۸) "لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے" "یَعلَمُونَ ظَاھِراً مِنَ الحَیٰوۃِ الدُّنیَا وَھُم عَنِ الآخِرَۃِ ھُم غَافِلُونَ" (یونس: ۹۲) "یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی ہی کو جانتے ہیں اور آخرت کی طرف سے غافل ہیں"۔ (۱)

(۱) مشترک اخذ تلخیص- از: (الف) درس قرآن، سورۂ فرقان: ع-۱ (غیر مطبوعہ) (ب) مطالعۂ قرآن کا اصول ومبادی: ۸۷-۱۰۰، نیز ان آیات کا تاریخی پس منظر، رومیوں کی مشکلات اور پیشین گوئی کی تکمیل تفصیلات جاننے کے لیے مذکورہ کتاب صفحہ: ۹۲-۱۰۷، ملاحظہ فرمائیں۔ (مرتب)

نور ایک ہے اور ظلمتیں بے شمار

﴿يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

(المائدہ. ۱۶)

"خدا اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو خدا کی خوشنودیوں کے تابع ہوں سلامتی کے راستے کھول دیتا ہے اور اپنے حکم سے انہیں تاریکیوں سے نکالتا روشنی میں لاتا اور سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے"يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ" . "خدا اس کتاب کے ذریعہ ان لوگوں پر جو خدا کی خوشنودیوں کے تابع ہوں سلامتی کے راستے کھول دیتا ہے"۔

"قرآن مجید زندگی اور اس کے تمام شعبوں میں جو ہموار و مستقیم اور تمام بے اعتدالیوں سے پاک اور بے خطر راہیں کھولتا ہے، ان کے لیے"سبل السلام"(سلامتی کے راستے) سے بہتر تعبیر ہو ہی نہیں سکتی اور یہ انہیں جملوں میں ہے، جن کی تشریح ان کے الفاظ سے زیادہ ممکن نہیں، یہ سب (سبل) درحقیقت ایک ہی شاہ راہ (صراط) کی گلیاں ہیں، جن کی طرف پیغمبر اشارہ کر کے کہتا ہے"وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ" (الانعام:۱۵۴)"اور اس نے بتلایا کہ یہی میری سیدھی راہ ہے، سو اسی پر چلو"۔

''وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّوْرِ بِإِذْنِهِ'' ''اور وہ اپنے حکم سے ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے''۔

''اس موقع پر قرآن کی بلاغت کا یہ نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے کہ اس نے ''نور'' کے مقابلہ میں ''ظلمت'' کے لیے ہمیشہ واحد کے بجائے جمع کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لیے کہ حقیقت میں اگر وحی کی روشنی نہ ہوتو پھر زندگی کی ظلمتوں کا کوئی حد وحساب نہیں ہے اور انسانی زندگی کے راستے کی ہر گلی اور ہر موڑ پر اندھیرا ہی اندھیرا ہے، صحیح مذہب کی روشنی کو علیحدہ کر کے دیکھا جائے تو اس دنیا میں ''ظلمت'' کے سوا کچھ نہیں بچتا اور یہ ایک ''ظلمت'' نہیں، بلکہ بے شمار ظلمتیں ہیں، زندگی کا جائزہ لیجئے، خدارسی کی تمام راہیں گم، مذہب تمامتر رسم پرستی اور تقلید، اعتقادات تمامتر حماقت و جہالت، خیالات تمامتر اوہام اور مفروضات، علوم تمامتر قیاس وظن معاشرت ومعاملات تمامتر بے اعتدالی وانا انصافی، قانون وسیاست تمامتر آزمائش وتجربہ، حکومت تمامتر جبری وتعدی ''ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ إِذَا أَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا'' (النور:۴۰) ''غرض اندھیرے ہی اندھیرے ہیں، ایک پر ایک (چھایا ہوا) ایسی حالت ہے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا''۔

زندگی کے اس ''بحر ظلمات'' میں روشنی کا مینا رصرف خدا کا نور ہے، جس سے زمین و آسمان روشن ہیں ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ'' اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے'' اسی لیے ''ظلمات'' کے مقابلہ میں اس کو واحد کے لفظ سے تعبیر کیا ہے........ حالانکہ عربی زبان میں اس کی جمع اور اس کے ہم معنیٰ الفاظ موجود ہیں، یہ صحیح نہیں کہ اس کی جمع غیر فصیح ہے، قرآن مجید کے استعمال کے بعد اس کی فصاحت میں کیا شبہ رہ جاتا؟ لیکن قرآن ایک کو ہمیشہ مفرد کے لفظ سے اور دوسرے کو جمع کے لفظ سے ادا کرنے کے ذریعہ ایک بڑی حقیقت کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ قرآن کی نظر میں ''نور'' ایک ہے اور ''ظلمات'' کا کوئی حساب وشمار نہیں، ''ظلمات'' ایک کڑور بھی ہوسکتی ہیں، لیکن ''نور'' ایک ہوگا، جب اس سرچشمہ سے ''نور'' کا افاضہ ہی نہ ہو، تو روشنی کہاں سے آئے، ''وَمَنْ لَمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهُ نُوْرًا فَمَا لَهُ مِنْ نُوْرٍ'' (النور:۴۰) ''اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی، اس کے واسطے

کہیں روشنی نہیں''،''جس کے لیے اللہ کی جانب سے نور نہ ملے اس کے لیے نور کا کوئی اور ذریعہ اور سرچشمہ نہیں، جس مذہب کی اور دین کی فطرت یہ ہے کہ اس پر اس کو اصرار ہے کہ تنہا وہی حق ہے، جس کو اس پر اصرار ہے کہ نور وایمان کے حدود معین ہیں، اس کو اس پر اصرار ہے کہ اسلام ایک تمدن بھی رکھتا ہے، خالی عقائد کا نام نہیں ہے''۔

''وَيَهْدِيهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٌ''. ''اور وہ ان کو سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے''۔ [۱]

(۱) مشترک اخذ وتلخیص، از: ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی: ۳۰-۳۴ ☆ دعوت فکر و عمل: ۱۳۱-۱۳۲

سلسلۂ انقلابات کی بلیغ تصویر

"اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" (الانعام: ۱۲۲)

"بھلا جو پہلے مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لیے روشنی کردی جس کے ذریعہ سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے"۔

روح حیوانی اور روح ایمانی

اللہ نے درحقیقت ہمارے جسم کے اندر دوروحیں پیدا کی ہیں، ایک روح حیوانی، اور ایک روح ایمانی، روح حیوانی کا مخزن تو ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا وہ خزانہ غیب، جہاں سے روح آتی ہے اور روح ایمانی کا مخزن ہے، انبیاء علیھم الصلوہ والسلام کی تعلیم، ہم پہلی مرتبہ تو اس حیونی روح سے زندہ ہوئے اور دوسری مرتبہ اس ایمانی روح سے زندہ ہوئے، اگر اللہ تعالیٰ ہمارے جسم میں صرف جسمانی روح ڈالتا یہ بھی اس کا بڑا افضل تھا، بڑی مہربانی تھی، دنیا میں کروڑوں، اربوں انسانوں میں اس نے وہ روح پیدا کی، آج وہ دنیا میں اپنی زندگی کا مظاہرہ کرتے ہیں، زندگی کا ثبوت دیتے ہیں، ہواؤں میں وہ پرواز کرتے ہیں، سمندروں پر دوڑے دوڑے پھرتے ہیں، اپنی طاقت کا، اپنی حرکت کا، اپنی زندگی کا، اپنی ذہانت کا انہوں نے دنیا میں ثبوت دیدیا، اور جگہ جگہ انہوں نے اپنی زندگی کا نقش قائم کردیا۔

زندہ مگر مردہ!

یہ بھی اس کا بڑا فضل تھا، لیکن اللہ کا یہ احسان تکمیل کے اس درجہ کو نہ پہنچتا اگر وہ اپنے فضل سے ہمارے اندر روح ایمانی نہ ڈالتا۔ اس بات کو اللہ تعالی نے صاف صاف یوں بیان کیا ہے۔

"اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا" بھلا وہ جو مردہ تھا باوجود روح کے مردہ تھا ایسا بھی ہوتا ہے روح اندر موجود ہے، کھانے کے لیے زندہ، پینے کے لیے زندہ، بولنے کے لیے زندہ، تماشہ دیکھنے کے لیے زندہ، اپنی قوت کا ثبوت دینے کے لیے زندہ، ظلم کرنے کے لیے زندہ، اپنے نفس کی خواہشوں اور شہوتوں کو پورا کرنے کے لیے زندہ، دوسروں کو مغلوب کرنے کے لیے زندہ، مظلوم پر ظلم کرنے کے لیے زندہ، بیکسوں پر ظلم وستم کرنے کے لیے زندہ، دوسرے انسانوں کو پامال کرنے اور روندنے کے لیے زندہ، ملکوں کو تاراج کرنے کے لیے زندہ، ہزاروں گھروں کے چراغ گل کرنے کے لیے زندہ، ہزاروں توووں کو ان کے چولھے پر سے اتارنے کے لیے زندہ، لاکھوں انسانوں کا پیٹ پھاڑنے اور کاٹنے کے لیے زندہ، تمام دنیا کو آگ سے اور خون سے بھر دینے کے لیے زندہ، مگر خدا کی معرفت کے لیے مردہ، خدا کے علم صحیح کرنے کے لیے مردہ، عدل وانصاف کے لیے مردہ، اپنی انسانیت کو پہچاننے کے لیے مردہ، اپنی زندگی کے مقصد کو جاننے کے لیے مردہ، اللہ کے سامنے ایک مرتبہ سر جھکانے کے لیے مردہ اور بیکار، اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے لیے مردہ اللہ کے سامنے وہ حرف اپنی التجا کے، مناجات کے، بھیک اور سوال کے کہنے کے لیے مردہ۔

حقیقت میں زندہ

تو ایک زندگی کی قسم یہ بھی ہے، محدود زندگی، فانی زندگی، دیکھنے بھر کی زندگی، کہ آدمی اپنے ہاتھ پاؤں کے اعتبار سے زندہ اور ایسا زندہ کہ لاکھوں انسانوں کو اس کی زندگی کے لیے قربان ہو جانا پڑتا ہے، اس کی زندگی کے بھینٹ چڑھ جانا پڑتا ہے، اس کی زندگی کی

قیمت ادا کرنے کے لیے قوموں اور ملکوں کو تیار رہنا پڑتا ہے، ایسی زندگی کہ اس پر لاکھوں کروڑوں لعنتیں فرشتوں کی لعنتیں، ارواح مقدسہ کی لعنتیں، اس کے لیے انسان زندہ ہے، ایک غریب اور یتیم کے منھ پر طمانچہ مارنے کے لیے زندہ، اور ایک بیوہ کے سر کا آنچل چھیننے کے لیے اور اس کو بے ستر کرنے کے لیے زندہ، ایک آدمی جس کے پاس ایک دانہ ہے، ایک لقمہ ہے، اس کا وہ لقمہ بھی چھین لینے کے لیے زندہ، لیکن عدل وانصاف کے لیے اس کی زندگی ختم ہوجاتی ہے، اس کی حرکت ختم ہوجاتی ہے، اس کے اعضاء جواب دے جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ'' بھلا وہ جو اگرچہ زندہ تھا پھر بھی مردہ تھا، دیکھنے میں زندہ تھا لیکن حقیقت میں مردہ تھا، اومن کان میتا ہمارے لیے وہ مردہ تھا، اپنی روح کے لیے مردہ تھا، اپنے انجام کے لیے وہ مردہ تھا، یوں پیٹ بھر کر جانوروں کی طرح کھانے کے لیے وہ زندہ تھا اور اپنی شہوت رانی اور اپنی نفس پرستی کے لیے وہ زندہ تھا، فاحییناہ ہم نے اس کو زندہ کردیا، ہم نے اس کی زندگی مکمل کردی ہم نے اس کو حقیقی معنوں میں زندہ کردیا، اب وہ زندہ کہلانے کا مستحق ہے۔

زندگی کے بعد روشنی

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ اللہ یہ بھی فرماتا ہے کہ ''وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاس'' ہم نے اس کو وہ روشنی عطا کی جس کے سہارے وہ لوگ کے درمیان چلتا پھرتا ہے، جس طرح تم دیکھتے ہو کہ بازاروں میں موٹریں ٹکراجاتی ہیں، اگر ٹریفک کنٹرول نہ کیا جائے، اگر سپاہی کھڑا نہ ہو، تو موٹر، موٹر سے ٹکراجائے، ہوائی جہاز سے ٹکراجائے، کشتی کشتی سے ٹکراجائے، اور ایک انسان اندھیرے میں دوسرے انسان سے ٹکراجاتا ہے۔ اسی طریقہ سے اگر اللہ کی روشنی نہ ہو، اللہ کسی کو روشنی عطا نہ فرمائے، تو انسان انسان سے ٹکرائے، اور ایک انسان اندھیرے میں دوسرے انسان سے ٹکر جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے اگر اللہ کی روشنی نہ ہو، اللہ کسی کو روشنی عطا نہ فرمائے، تو انسان انسان سے ٹکرائے، قوم قوم سے ٹکرائے، ملک ملک سے ٹکرائے، تمدن تمدن سے ٹکرائے، تہذیب تہذیب سے ٹکرائے، طاقت طاقت سے ٹکرائے، ایک شخص کا مقصد دوسرے شخص کے مقصد سے ٹکرائے، اغراض میں تصادم ہو، مفادات میں

تصادم ہو، انسانیت، انسانیت سے ٹکرائے، انسان انسان سے ٹکرائے، ایک باپ کا بیٹا، باپ سے ٹکرائے، مرد عورت سے ٹکرائے، عورت مرد سے ٹکرائے، فرماتا ہے "وجعلنا لہ نورا" ہم نے اس کو روشنی بھی عطا کی، انسانوں کے جنگل میں چلنے کے لیے ان راستوں میں ان تنگ و تاریک گلیوں میں گزرنے کے لیے اس کو چراغ بھی اور مشعل کی بھی ضرورت ہے تو ہم نے اس کو زندگی بھی عطا کی اور روشنی بھی بخشی، وجعلنا لہ نورا ہم نے اس کو ایسی روشنی دی، جس کے سہارے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے، ٹکراتا نہیں ہے، بھلے مانسوں کی طرح۔ (۱)

ٹارچ کی قیمت اس کے سیلز سے ہے

اس کی موٹی سی مثال میں آپ کو دیتا ہوں۔ یہ ٹارچ ہے، اس میں سیلز رکھے جاتے ہیں، اگر قسمت سے سیلز رکھ دیئے گئے اور مسالہ بھر دیا گیا تو اس ٹارچ میں اور اس ٹارچ میں جو خالی ہے، زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ یہ ٹارچ کہلائے گی، یہ اندھیرے میں اجالا کر دے گی، روشنی کا ایک تیز دھارا اس میں سے نکلے گی۔ یہ ہاتھ میں ہوگی تو آدمی ٹھوکر کھانے سے بچے گا، دیوار سے ٹکرانے سے بچے گا، کسی سوتے ہوئے بچہ پر پاؤں رکھ کر چلنے سے بچے گا۔ اور معلوم ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک بڑی طاقت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے (جیسے کوئی ہجے کر کے بتاتا ہے) ہجے کر کے بتایا ہے اور دو دو، دو چار اس طرح سے سمجھایا ہے، "او من کان میتا" "بھلا جو مردہ تھا" "فاحیینہ" ہم نے اس کو زندہ کیا اور اتنا ہی نہیں، "وجعلنا لہ نوار یمشی بہ فی الناس" ہم نے اس کو ایک روشنی عطا کی جس کے سہارے سے وہ لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا ہے۔ (۲)

اسلامی انقلاب بلکہ مجموعۂ انقلابات اور سلسلۂ انقلابات کی اگر تصویر کھینچنا ہو تو اس کے لیے "فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْراً يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ" سے زیادہ بلیغ لفظ نہیں مل سکتے"۔ (۳)(۴)

---

(۱) تحفۂ برما: ۲۹-۳۲ (۲) تحفۂ دین ودانش: ۶۵-۶۶

(۳) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۱۲۲ (۴) بالترتیب مندرجہ بالا کتابوں سے ماخوذ ہیں۔

پیغمبر آخرالزماں اور کلامِ الٰہی

﴿ وَ اِنَّـه لَتَـنْـزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِين، نَزَلَ بِهِ الرُّحُ الأمِيْنَ، عَلىٰ قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذَرِين، بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ﴾

(الشعراء: ۱۹۲-۱۹۵)

''اور یہ قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا ہے، اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپ کے قلب پر، صاف عربی زبان میں تا کہ آپ ڈرانے والے ہوں''۔

قرآن قطعی اور غیر مشتبہ علم ہے

''قرآن کی سب سے بڑی اور معجزانہ اور فوق البشر خصوصیت اس کا علم یقینی ہوتا ہے، ''ذٰلِکَ الْكِتَابُ لاَ رَيْبَ فِيْهِ'' یہ کتاب الٰہی ہے جس میں شک کا کوئی گزر نہیں''۔

قرآن کی اس خصوصیت میں کوئی انسانی کلام اور کوئی انسانی کتاب قرآن کے ساتھ شریک نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے، اس لیے کہ قرآن کا سرچشمہ اور ماخذ ''علم الٰہی'' ہے اور اس کے نزول کا ذریعہ ''وحی الٰہی'' ہے، یہ سرچشمہ ہر قسم کے عیب ونقصان، شک واشتباہ، ظن وتخمین، تدریج وترقی اور تعارض واختلاف سے پاک ہے، اس میں جو کچھ ہے، وہ یقینی اور قطعی ہے، مشاہد اور مرئی ہے، یکساں اور آخری ہے، اللہ کا علم تدریجی اور ترقی پذیر نہیں ہے، اس کا علم اس کی دوسری صفات کی طرح ابدی اور دائمی ہے''۔

فرماتا ہے: ''وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ'' یہ ''رَبِّ الْعَالَمِيْنَ'' یہاں اللہ تعالیٰ کوئی صفت اپنی بیان کرسکتا تھا، لیکن اضافت ''رب العالمین'' کی طرف کی۔۔!

اس سے معلوم ہوا کہ اس ''تَــنْــزِيْــلُ'' میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفتِ ربوبیت کا ظہور ہے، یعنی اس میں مصالحِ بشری کا، مصالحِ انسانی کا اور انسانوں کی پرورش کا اور انسانوں کے صحیح طریقے پر، راحت کے ساتھ اور امن کے ساتھ رہنے کا اس میں سامان ہے!

''وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ'' . . ''لَتَنْزِيْلُ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ'' یہ کہا جاسکتا تھا اور ''لَتَنْزِيْلُ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ'' کیا جاسکتا تھا، لیکن ''لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ''!

تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید میں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفتِ ربوبیت میں ایک رابطہ ہے! اس میں وہ سب چیزیں بیان کی گئی ہیں، جن کے بغیر نسلِ انسانی اچھے طریقے سے رہ ہی نہیں سکتی! اس کے تعلقات خراب ہوجائیں گے، وہ ایک دوسرے کے قاتل بن جائیں گی، یا اس کی جو بشری ضرورتیں ہیں وہ مسدود ہوجائیں گی!

''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ'' دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک تو ماخذ یعنی مبتداء، جہاں سے چیز شروع ہوتی ہے اور ایک ذریعہ! دونوں کا عالی ہونا، دونوں کا عظیم ہونا، دونوں کا امین ہونا، یہ بھی ضرور ہے! مثلاً آپ نے بہت اچھا خط لکھا، بہت اچھا پیغام دیا، لیکن اس کو حوالے کیا پہنچانے کے لیے وہ خائن ہے! اس کے اور دوسرے مصالح ہیں! تو ہوسکتا ہے کہ پیغام پورے طور پر نہیں پہنچے گا تو ''کسی علم واطلاع کا منبع اصلی تو پورے طور پر صاف اور محفوظ ہو، لیکن کسی شخص کے لیے اس کا ذریعہ اطلاع پورے طور پر قابل وثوق نہ ہو، اپنے اصلی سر چشمہ سے کوئی چیز صحیح اور محفوظ نہ ہوئی ہو، لیکن اپنے منتہیٰ تک پہنچتے پہنچتے وہ محفوظ نہ رہ سکی ہو، قرآن نے یہ بھی بتادیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس کا ذریعہ علم صرف وحی ہے اور وہ پورے طور پر محفوظ اور مامون ہے اور اس میں کسی قسم کی مداخلت کا امکان نہیں'' تو جہاں فرمایا کہ ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ وہاں فرمایا ''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْأَمِيْنُ'' وہ ''رب العالمین'' کی تنزیل ہے، اور ''روح الأمین'' اس کو لے کر آئے! اس لیے اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں!

"عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ" اور پھر کسی کا محل! ایک جہاں سے چیز چلی ایک جو لے کر آیا، جس کو پہنچایا! "رب العالمین" سے چلتی ہے وہ چیز اور "روح الأمین" لے کر آتے ہیں اور "قلب نبوی" پر! جس سے زیادہ پاک، جس سے زیادہ امین، جس سے زیادہ خیر خواہ، جس سے زیادہ حافظ اور محافظ کوئی نہیں ہوسکتا، اس پر وہ نازل ہوئی!

تو اب تینوں چیزیں بالکل مامون ہوگئیں! "عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ" آپ کے قلب پر وہ چیز وارد ہوئی! روح الأمین نے اس کو اس پر ڈالا، تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں!

"بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ" زبانِ عربی میں! عربی ایسی زبان جو واضح ہے اور واضح کرنے والی ہے مطالب کو، خوب سمجھ میں آنے والی ہے! "بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ" کی صفت بتاتی ہے کہ اس پیغام کے الفاظ بھی اتارنے والے ہی کے ہیں، اس لیے کہ زبان کا تصور الفاظ کے بغیر نہیں ہوسکتا"۔

اب یہ اللہ تعالیٰ عربوں کو اس میں متوجہ کرتا ہے کہ اگر کسی عجمی زبان میں قرآن نازل ہوتا، اور پھر تمہاری طرف منتقل کیا جاتا، ترجمہ ہوتا، تم شک کر سکتے تھے۔

عربوں کا انتخاب کیوں ہوا....؟

ایک بات یہ سمجھنے کی ہے اس میں۔ کہ عربوں کا انتخاب کیوں ہوا؟ یہ آخری پیغام کے لیے اور اتمام حجت کے لیے اور دنیا میں تعلق مع اللہ کے صحیح سلسلہ اور عبودیت کے صحیح سلسلہ کے قیام کے لیے عربوں کا انتخاب کیوں ہوا؟[1]

اس لیے کہ عرب اپنی اصل فطرت پر تھے، مضبوط اور آہنی ارادہ کے مالک تھے، اگر حق بات ان کی سمجھ میں نہ آتی ہو وہ اس کے خلاف شمشیر تک اٹھانے میں کوئی تکلف نہ کرتے اور اگر حق کھل کر سامنے آجاتا تو وہ اس سے دل و جان سے زیادہ محبت کرتے، اس کو گلے سے

(۱) ہم نے بہت سی چیزیں لکھی ہیں، اور یہ سیرۃ النبی علامہ شبلی کی، اس میں اس پر کلام ہے، لیکن کچھ چیزیں اور بھی اس کے بعد اضافہ کیا گیا ان پر۔

لگاتے اور اس کے لیے جان تک دینے میں پس وپیش نہ کرتے تھے۔ تو ان کی قوتِ عمل بھی سب سے بڑھی ہوئی تھی اور وہ جہلِ مرکب میں مبتلا نہیں تھے!

تو اور خدا کی کتاب خدا کے علم سے ماخوذ ہے اور اس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں............اس لیے اس کتاب میں تعارض واختلاف نہیں ہے، کیونکہ تعارض و اختلاف جہل وناواقفیت، یا علم کی کمی بیشی، یا اس کی تدریجی ترقی، یا ظن وقیاس، یا نسیان و غفلت، یا کذب وافتراء کی وجہ سے ہوتا ہے اور وہ ان تمام نقائص سے پاک ہے، اس لیے اس کا کلام بھی ہر قسم کے تعارض واختلاف سے محفوظ ہے''۔[1]

(۱) درس قرآن، سورۂ شعراء: ۱۹۲-۱۹۵، کے علاوہ مشترک اخذ وتلخیص: ☆ مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی: ۱۵-۲۰ ☆ نبی رحمت: ۶۰

اعجازِ قرآن کا دائرہ

﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ. فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَأَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ. فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ (هود: ع-۲)

''یہ کیا کہتے ہیں کہ اس نے قرآن از خود بنالیا ہے؟ کہہ دو اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں بنالاؤ اور خدا کے سوا جس جس کو بلا سکتے ہو بلا بھی لو، اگر وہ تمہاری بات قبول نہ کریں، تو جان لو کہ وہ خدا کے علم سے اترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو تمہیں بھی اسلام لے آنا چاہیے''۔

مندرجہ بالا آیت میں متشککین کو قرآن کا (مطلق) مثل لانے کی دعوت دی گئی ہے اور کوئی کلام اور کتاب قرآن کی اس وقت تک مثل نہیں ہو سکتی جب اس کے اعجاز کے تمام شعبوں میں اور اس کی تمام خصوصیات میں مماثل نہ ہو اور قرآن صرف اپنے الفاظ وترکیب اور فصاحت وبلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے، اپنے معانی و مضامین میں بھی، اپنے اعلیٰ علوم ومعارف میں بھی، معلومات غیبی اور حقائقِ ابدی میں بھی، اپنی پیش کی ہوئی مذہبی واخلاقی ومعاشرتی اور مدنی تعلیمات میں بھی، اپنے اثرات وانقلاب میں بھی، اپنی پیشینگوئیوں اور اخبار میں بھی معجزہ ہے، مگر جب صرف الفاظ میں جو اس کے اعجاز کامل کا صرف

ایک پہلو اور گوشہ ہے، کوئی مقابلہ نہیں ہوسکا، تو اس کے اعجاز کامل میں کیا مماثلت ہوسکتی ہے؟

سورہ ہود کی مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا امتیاز خصوصی اور اس کے اعجاز کا راز یہ ہے کہ وہ اللہ کے علم سے اتارا گیا ہے اور حقیقت میں وہ اس کے علم خاص کا ایک مظہر ہے، اس لیے اس میں انسان اپنے ظنی ومشتبہ، ناقص ومحدود اور خود خدا کے بخشے ہوئے علم کے ساتھ کیا مقابلہ کرسکتا ہے؟ جس طرح خدا کی اور صفات میں انسان مماثلت نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ خدا کے علم میں بھی کوئی مقابلہ کر نہیں کرسکتا۔

"فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَأَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ. فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ" "اگر وہ تمہاری بات قبول نہ کریں تو جان لو کہ خدا کے علم سے اترا ہے اور یہ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، تو تمہیں بھی اسلام لے آنا چاہئے"۔

"أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ" کا نکتہ بتاتا ہے کہ اللہ جس طرح تمام صفات الوہیت میں یکتا ہے، اسی طرح اپنے علم میں بھی اور جب اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے، تو کتاب الٰہی کا جواب کیا ہوسکتا ہے"۔

علم اللہ کا تعلق صرف الفاظ وترکیب سے نہیں بلکہ معانی وحقائق سے بھی ہے، لفظی فصاحت کے لیے قرآن نے جا بجا اپنے کو "قُرْآناً عَرَبِيّاً. كِتَابٌ مُبِينٌ" اور "لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُبِينٌ" کہا ہے، جس میں اس کے لفظی محاسن اور لسانی تفوق کی طرف اشارہ ہے"۔

پس قرآن کی فصاحت وبلاغت اور اس کا لفظی اعجاز درحقیقت قرآن کے اعجاز کا ایک گوشہ ہے اور قرآن کا اعجاز اس میں منحصر نہیں، علمائے متقدمین نے جب قرآن کے اعجاز پر غور کیا، یا اس موضوع پر قلم اٹھایا تو زمانہ کے رجحان عام اور عربوں کے ادبی ذوق اور زبان کی اہمیت کی وجہ سے ان کی نظر کے سامنے زیادہ تر قرآن کے اعجاز کا یہی گوشہ رہا اور کوئی شبہ نہیں کہ انہوں نے اس دائرہ کے اندر کمال نکتہ دانی اور حسن مذاق کا ثبوت دیا اور بڑی دماغ سوزی سے کام لے کر اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کردیا، اس عملی ذخیرے میں اضافہ مشکل ہے، اس لیے اس بات میں انہیں تالیفات کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔[1]

(۱) (تلخیص) مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی: ۴۴-۴۸

ہدایت ربانی کا تسلسل

﴿وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ﴾ (القصص: ۵۱)

''اور ہم نے اس کلام (یعنی قرآن) کو ان لوگوں کے لیے وقتاً فوقتاً یکے بعد دیگرے بھیجا، تا کہ یہ لوگ (بار بار تازہ بتازہ سننے سے) نصیحت مانیں''۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ'' ''اور ہم نے ان کے لیے قول کو مسلسل جاری رکھا'' یعنی اس کا سلسلہ وقفوں کے ساتھ، یعنی مکانی اور زمانی فرقوں کے ساتھ جاری رہا، اگر دیکھا جائے اور اس میں معنوی اتصال بھی ہے اور کبھی کبھی زمانی اتصال بھی ہے، کبھی کبھی مکانی اتصال بھی ہے اور ایک چیز جو مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات میں پیش کی جائے، اس کے اندر اختلاف وتفاوت اور اس میں بہت سی چیزیں کہ جن میں جس کو عربی کے وسیع معنی میں اضطراب کہتے ہیں، اس کا اندیشہ ہوتا ہے، لیکن اس میں کتب سماوی کے اتصال معنوی اور اتصال رائی، اتصال مقصدی اور وہ اس میں ہدایت کا ہونا اور اس میں رہنمائی کے سامان کا ہونا، اس میں عقائد صحیحہ کا اس کے ذریعہ سے معلوم ہونا، عقائد صحیحہ کا بھی اور حقائق صحیحہ کا بھی، یہ سب کے لیے ایک لفظ ''تَوْصِيْل'' کا لفظ، (جس کا ترجمہ کسی زبان میں ذرا مشکل ہے) کہ اس میں یہ ایک طرح کا تواتر ہے، ایک تواتر تو ہوتا ہے کہ حدیث کی اصطلاح ہے اور ایک تواتر یہ ہے کہ معنوی تواتر اور مقصدی تواتر، یہ تمام کتب سماویہ میں ہے، ورنہ جب کسی ایک مقصد کے لیے کچھ چیزیں ہوتی ہیں، تو ان میں

بہت تفاوت ہوجاتا ہے، بعض مرتبہ تضاد بھی ہوجاتا ہے، لیکن اس تضاد کی بھی نفی ہے اور انتشار کی بھی نفی ہے اور اضطراب کی نفی ہے۔

"وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ" "ہم نے ان کے لیے سلسلہ جاری رکھا" اور مسلسل رکھا، وحی الٰہی کا اور ہدایت ربانی کا، "لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ" "تاکہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں"۔

ہر کتاب سماوی میں یہی ہے، ہر پیغمبر یہی کہتا رہا ہے، ہر پیغمبر نے توحید خالص کی دعوت دی، ہر پیغمبر نے آخرت کو یاد دلایا اور اس کا یقینی ہونا بیان کیا اور ہر پیغمبر نے عدل وظلم کے درمیان فرق کیا، حق و باطل کے درمیان فرق کیا، طاعت ومعصیت کے درمیان فرق کیا، تو جو اصول ہیں، وہ سب کے سب سب میں مشترک ہیں، یہ خود ایک بات اللہ کی، من جانب اللہ ہونے کی ایک دلیل، (اور قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارے آئے ہیں اور تجربہ بھی ہے) کہ انسانی تصنیفات اور انسانی بیانات اور انسانی تحقیقات تک، ان سب میں نہ صرف تفاوت ہوتا ہے، بلکہ اکثر تضاد بھی ہوجاتا ہے اور شاید کوئی علم ایسا ہو، جس میں بالکل کسی قسم کا کوئی تفاوت نہ ہو، تضاد نہ ہو، یہاں تک کہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ زمانہ گزر جانے کے بعد تحقیق ہوتی ہے کہ وہ بات صحیح نہیں تھی، یا تھی اور یا جتنی تھی، اتنی صحیح نہیں تھی، اس سے کم یا زیادہ، یا تو مقدار میں فرق ہوجاتا ہے اور یا اس کی نوعیت میں فرق ہوجاتا ہے، حقیقت میں فرق ہوجاتا ہے، یہ فرق جو ہے یہ انسانی اس کو اگر لیٹریچر کہا جائے، یا فکر انسانی کہا جائے، یا اس کو انسان کی علم کی رسائی کہا جائے، تحقیقات علمی کہا جائے، یہاںتک کہ جو خالص تحقیقات علمی ہے، ان میں بھی اتنا بڑا فرق ہے کہ آدمی کا پھر اعتبار جاتا رہتا ہے، یعنی آدمی اگر صرف اس کو موضوع بنالے کہ محققین کی تحقیقات میں اور مفکرین کے افکار میں اور ادباء کی تحریروں میں اور شعراء کی شاعری میں کتنا تفاوت ہے، زمان ومکان کے اختلاف کے ساتھ، بلکہ بعض مرتبہ ایک ہی زمانہ میں اور ایک ہی ملک میں، مکان سے مراد یہ نہیں کہ کوئی محلہ ہو، ایک ہی ملک میں، ایک ہی شہر میں، اتنا تفاوت ہوتا ہے، ہمارا پورا انسانی لٹریچر تفاوت سے، بلکہ تضاد سے بھرا ہوا ہے اور خود سائنس کی جتنی ترقی ہوئی، اس نے ثابت کیا

کہ اس سے پہلے کے کتنے نظریات غلط تھے، ہم نے جیسے آپ کو بتایا کہ منطق قیاسی جو ساری دنیا میں رائج تھی، وہ بالکل معلوم ہوا کہ بہت ہی کمزور ہے اور اس سے ہم صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتے، پھر منطق استقرائی آئی، اس کے متعلق یہ تسلیم ہے، مغربی محققین کو بھی ''گستاؤلبان'' (Gustav Lebon) اس میں پیش پیش ہے کہ وہ اندلس سے آئی ہے اور اس میں اسلامی فیض بھی شامل ہو گیا کہ اندلس سے جو چیز آئے گی، وہ اسلامی فیض سے خالی نہیں ہو سکتی، ضرور اس میں قرآن مجید سے کوئی رہنمائی حاصل کی گئی، یا پھر اللہ کی طرف سے مدد ہوئی اور اس کو الہام بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کو توفیق بھی کہہ سکتے ہیں۔

تو قرآن مجید کا یہ ایک اشارہ ہے، یہ چند لفظ ہیں، ''وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ'' یہ صرف اسی بات پر موقوف نہیں ہے، محدود نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آئی، اس میں اتفاق بھی تھا، تسلسل بھی تھا اور توافق بھی تھا، بلکہ اگر آدمی اس کو سامنے رکھ کر کے مقابلہ کرے، ''وبِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الأَشْيَاءُ'' اضداد سے پھر قدر آتی ہے، جب اضداد دیکھئے، جب اس کے اضداد انسانی لیٹریچر میں اور فکر میں دیکھے گا، تب اس کی قدر آئے گی، ''لَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ'' اور یہ صحف سماوی اگر یہ تحریف سے خالی ہوتے تو آپ دیکھتے کہ زمانوں کے فرق کے ساتھ، صدیوں کے نہیں اور بعض مرتبہ ایک ہزار، یا اس کے کم یا زائد کا فرق ہو، ان صحف میں ایک ہی بات پیش ہونا، ایک ہی چیز کی طرف دعوت دینا، زمانے کے فرق کے ساتھ اور مکان کے فرق کے ساتھ، جغرافیائی فرق کے ساتھ، تاریخی فرق کے ساتھ، اذہان انسانی کے فرق کے ساتھ، رغبات انسانی کے فرق کے ساتھ اور اقتناع جسے کہتے ہیں عربی میں اقتناع کی صلاحیت، اس کے فرق کے ساتھ ایک ہی بات کہی، اللہ کے ذات و صفات کو ہر صحیفے میں، ہر پیغمبر نے، خواہ اس کا زمانہ کوئی ہو، اس کا ماحول کوئی ہو، اس کا پس منظر کوئی ہو، اس میں جو بات کہی، یہ تنہا صداقت کے لیے کافی ہے کہ حالانکہ کوئی مشورہ نہیں، مشورہ کا کوئی امکان ہی نہیں تھا، زمانہ کا فرق، مقامات کا فرق، تو یہ گویا اعجاز کی ایک دلیل ہے۔ (۱)

---

(۱) درس قرآن، سورۂ قصص: ۵۱ (غیر مطبوعہ)

بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

﴿بَلِ ادّٰرَکَ عِلۡمُهُمۡ فِي الآخِرَةِ بل هم في شك منها. بل هم منها عمون﴾ (النمل: ٦٦)

''بلکہ تھک کرگر گیا ان کا علم آخرت کے بارے میں، بلکہ ان کو شبہ ہے اس میں بلکہ وہ اس سے اندھے ہیں''۔

''قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ کے ایسے عجیب صنائع، معجزات اور خارق عادات افعال سے بھری ہوئی ہیں کہ ایمان بالغیب اللہ کی بے مثل قدرت اور مشیت قاہرہ پر یقین اور ان کتابوں کی صحت اور ان رسولوں کی سچائی (جن پر یہ کتابیں نازل کی گئیں اور انہوں نے لوگوں کو ان سے باخبر کیا) پر کامل اعتماد ہی ان کا متحمل ہوسکتا ہے اور ان کی تصدیق وتائید کرسکتا ہے، لیکن وہ ایمان جس کی بنیاد محسوسات مانوس حوادث، ظاہری عقل کی مطابقت اور کتابی علوم پر استوار ہوتی ہے، وہ یا تو ان کو قبول کرنے اور ان کی تصدیق کرنے سے بالکل انکار کردے گا، یا ان پر یقین کرنے میں تذبذب کا شکار ہوگا، اور ٹھوکر کھائے گا، یا ان کی ایسی تاویل کرے گا، جس سے وہ اس کی معلومات ومحسوسات کے مطابق ہوجائیں، اسی لیے اللہ نے فرمایا ''بَلِ ادّٰرَکَ عِلۡمُهُمۡ فِي الآخِرَةِ'' ''بلکہ تھک کرگر گیا ان کا علم آخرت کے بارے میں''۔ (۱)

(۱) منصب نبوت: ۹۴

یہ "اِدّارَکَ" ایک بڑا معجزانہ لفظ اس موقع سے ہے، "بلکہ ان کا علم تھک کر گر گیا آخرت کے بارے میں" یعنی علم چلتے چلتے، کوئی چیز چلتے چلتے گر جائے، کام آتے آتے بیکا رہو گیا، علوم میں بھی یہی حال ہے، ایک شخص جس نے فلسفہ نہیں پڑھا، وہی ہوشیاری کی باتیں کر رہا ہے، بڑا وہ خطابت دکھا رہا ہے، اپنی ادبیت چھانٹ رہا ہے شعر پڑھ رہا ہے، لیکن فلسفہ کا جہاں موضوع شروع ہوا، وہاں "بَلِ ادّارَکَ عِلْمُهُمْ" وہاں بالکل ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔

اسی طریقے سے کوئی شخص ہے، وہ کسی فن کا آدمی ہے، میڈیسن کی بات شروع ہوگئی، طب کی، اس سے وہ ایسا بن جائے جیسے گونگا، بہرا ہے اور یا یہ کہ بالکل غبی ہے، یا یہ کہ سائنس کی بات شروع ہوگئی، تو یہ علوم انسانی کے اندر یہ حال ہے کہ ان علوم کے دائرہ ہیں، ان کی سرحدیں ہیں، تو پھر وہ غیب جو اللہ تعالیٰ کا علم ہے، ان کا علم چلتے چلتے وہاں جا کر ایسا بیکار ہو جاتا ہے، اب "ادّارَکَ" کا لفظ جو ہے اس کا بدل نہیں لایا جا سکتا ہے، صحیح بات تو یہ ہے کہ اس کا ترجمہ بھی مشکل ہے۔

"میں معذرت کے ساتھ کہتا ہوں، منزل قرآن اور صاحب قرآن سے تو معذرت کی جرأت نہیں کر سکتا، لیکن قرآن کی بلاغت اور قرآن کے اعجاز سے معذرت کے ساتھ میں "بل ادارک علمهم فی الآخرة" کا ترجمہ کرتا ہوں کہ ان کا علم پنکچر ہو گیا آخرت کے بارہ میں اور مجھے مغرب کی صورتحال اور اس کے علمی واختراعی سفر کی اس سے بہتر تشبیہ نظر نہیں آتی کہ جیسے کوئی کار چل رہی ہو اور اچانک اس میں کوئی نقص پیدا ہو جائے کہ اس کی تمام توانائیاں ختم ہو جائیں، اس کے لیے پنکچر سے بہتر کوئی لفظ نہیں، ذرا دیکھئے اور غور کیجئے کہ وہ علم خاصا چل رہا تھا، اطمنان سے سفر طے کر کے آیا تھا، جس نے عقلیات پر، طبعیات پر، ریاضیات پر اور مابعد الطبیعات تک میں اپنی فکر کی جولانی اور ذہن کی تابانی دکھائی، وہی علم جب واجب الوجود کی ذات وصفات تک پہنچا اور آخرت یعنی اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے مرحلہ تک پہنچا تو "اِدّارَکَ عِلْمُهُمْ" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اچانک پہیہ سے ہوا نکل گئی، اس آیت کے بعد کے الفاظ میں مغرب کی مختلف ذہنی کیفیات یا مختلف طبقات

کی تصویر نظر آتی ہے کہ "بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِنْهَا" وہ اس کے بارہ میں شک میں مبتلا ہیں، "بَلْ هُمْ مِنْهَا عَمُوْنَ" بلکہ وہ اس کے معاملہ میں بالکل بے بصیرت ہیں"۔

کیونکہ جس ایمان کی بنیادیں صرف محسوسات اور تجربات پر استوار ہوئی ہوں، جو مشہور اور مانوس چیزوں کا ہی ساتھ دے سکتا ہو، جو تکوینی طریقوں، طبعی اصولوں اور محسوسات کے دامن میں پناہ لیتا ہو، وہ ایمان محبوس اور مقید ایمان ہے، محدود اور مشروط ایمان ہے، وہ اعتماد کے قابل نہیں ہوسکتا، نہ ادیان کا ساتھ دے سکتا ہے، نہ انبیائے کرام کی دعوت، ان کی مطلوبہ تصدیق مطلق، دائمی اعتماد، فوری اطاعت واتباع اور جہاد وقربانی کی راہ میں فنائیت سے کوئی مناسبت رکھتا ہے، درحقیقت اس کا ایمان نام رکھنا ہی درست نہیں، وہ تو صرف علم وتحقیق ہے، منطقی قوانین کے سامنے سپر اندازی ہے، حواس وتجربات کی بے قید اطاعت ہے، اس میں کوئی فضیلت وامتیاز نہیں اور نہ وہ دین کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ ہر عقلمند انسان اپنی زندگی میں اپنے تجربات، اپنی معلومات کے نتائج اپنی محسوسات اور اپنی عقل کے اشاروں پر اعتماد ویقین رکھتا ہے۔

اور اس "طبیعاتی" یا "منطقی" ایمان والے شخص کو آسمانی کتابوں اور الٰہی مذاہب کے سامنے قدم قدم پہ دقتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ دین کی روح اور اس کے حقائق کے بارے میں مستقل کشمکش میں گرفتار رہتا ہے، جیسا کہ ایک عارف نے کہا ہے ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

اور "پائے چوبیں" تیز چلنے، آزادی کے ساتھ قدم اٹھانے اور اِدھر اُدھر مڑنے میں انسان کا ساتھ نہیں دے سکتا، یہی وجہ ہے کہ خالص استدلالی ذہن کا انسان رسولوں کی لائی ہوئی اور آسمانی کتابوں کے بیان کئے ہوئے حقائق اور اس علم جدید، اپنی یقین کی ہوئی محسوسات، یادیات اور محدود معلومات پر مبنی اصولوں کے درمیان حائل وسیع خلیج کی وجہ سے یا تو تحریفات اور دوراز کار تاویلات کا سہارا لیتا ہے، یا الحاد پر مجبور ہوتا ہے، "بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ" "حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر یہ

قابو نہیں پا سکے، اس کو نادانی سے جھٹلا دیا اور ابھی اس کی حقیقت اُن پر کھلی ہی نہیں''۔ (۲)

''میں سمجھتا ہوں کہ مغربی افکار و نظریات اور اسلامی حقائق و عقائد کے درمیان جب بھی تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے، اس کے بغیر وہ سر رشتہ ہمارے ہاتھ نہیں آئے گا، جس سے ہم اصل حقیقت تک پہنچ سکیں''۔ (۳)

(۱) منصب نبوت: ۹۶-۹۷ (۲) کاروانِ زندگی (سوم): ۲۲۳-۲۲۵

(۳) درسِ قرآن، سورۂ نمل: ۲۶ (غیر مطبوعہ) کے علاوہ اقتباسات: ☆ منصب نبوت: ۹۴ ☆ منصب نبوت: ۹۶-۹۷ ☆ کاروانِ زندگی (سوم): ۲۲۳-۲۲۵، سے ماخوذ ہیں۔

ماتھے پہ داغِ سجدہ، دل میں ہے داغِ عصیاں

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ عَلى حَرْفٍ، فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اِطْمَأَنَّ بِهِ وإنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ اِنْقَلَبَ عَلى وَجْهِهِ، خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الآخِرَةَ، ذٰلِكَ هُوَ الخُسْرَانُ المُبِين يَدْعُومِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لا يَضُرُّهٗ وَمَالاَ يَنْفَعُهٗ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلاَلُ الْبَعِيْدُ. يَدْعُوْ لَمَنْ ضَرُّهٗ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهٖ لَبِئْسَ الْمَوْلىٰ وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ﴾ (الحج: ۱۱-۱۳)

''اورلوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں، جو کنارے پر (کھڑے) ہوکر خدا کی عبادت کرتے ہیں، اگر ان کو کوئی دنیاوی فائدہ پہنچے تو اس کے سبب مطمئن ہو جائیں اور اگر کوئی آفت پڑے تو منہ کے بل لوٹ جائیں، (یعنی پھر کافر ہو جائیں) انہوں نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی، یہی تو نقصان صریح ہے، یہ خدا کے سوا ایسی چیز کو پکارتا ہے، جو نہ اسے نقصان پہنچائے اور نہ فائدہ دے سکے، یہی تو پرے درجہ کے گمراہی ہے، بلکہ ایسے شخص کو پکارتا ہے، جس کا نقصان فائدے سے زیادہ قریب ہے، ایسا دوست بھی برا اور ایسا ہم صحبت بھی برا''۔

قرآن مجید کی تصویر کشی کا اعلیٰ نمونہ

یوں تو قرآن مجید سارا کا سارا معجزہ ہے اور معجزات کا مجموعہ ہے اور حقائق ایسے حقائق کہ جو جلی ہیں، ان کا مجموعہ ہے، لیکن بعض بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا ہم مشاہدہ کر سکتے

ہیں، اس دنیا میں تجربہ کر سکتے ہیں، ہمارے سامنے اس کے نمونے آتے ہیں ہم غور نہیں کرتے اور آسکتے ہیں ان پر غور کرنا چاہئے، ان میں سے یہ ایک آیت بھی ہے اور یہ آیت قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی تصویر کشی کا اعلیٰ نمونہ ہے، یہ آیت کیا ہے؟ ایک مستقل معجزہ، یہ فرد کی بھی تصویر ہے اور جماعتوں کی بھی، قوموں اور ملتوں کی بھی''۔

تر ددو تذبذب کا انجام

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ" کہ لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اس کی اطاعت کرتے ہیں، اس کے احکام پر چلتے ہیں سرحد پر کھڑے ہو کر، ڈیک پر کھڑے ہو کر، (ہمارے یہاں کی زبان میں ڈیک کہتے ہیں، رائے بریلی اور اودھ کی زبان میں،) یعنی کوئی ایسا کنارہ کہ آدمی چاہے تو نیچے اتر جائے، چاہے تو اس پار چلا جائے،'' عربی میں "مَنْ" کا اطلاق فرد اور جماعت سب پر ہوتا ہے، لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی ہیں، جو خدا کی بندگی کرتے ہیں، بالکل کنارے پر کھڑے ہو کر'' بندگی کرتے ہیں'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خالی نماز پڑھتے ہیں اور عبادت کرتے ہیں، اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ خدا کی فرمانبرداری اور اسلامی احکام کی پابندی عین سرحدی لکیر پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں، جو اسلام و جاہلیت اور کفر و ایمان کے درمیان کھینچی گئی ہے''۔

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ" "عَلٰى حَرْفٍ" کی بلاغت ملاحظہ ہو اس صورت حال کی اگر کیمرے سے بھی تصویر لی جائے اور بڑے سے بڑا مصور اور نقاش بھی اس کی تصویر کشی کرے تو ایسی بولتی ہوئی تصویر نہیں کھینچ سکتا، ان کی دور بینی اور احتیاط کی پوری تصویر اس چھوٹے سے جملے میں آ گئی'' بعض لوگ ایسے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کے بہت سے احکام پر عمل کرتے ہیں اور اپنے کو اللہ کا عابد پرستار سمجھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس دین میں داخل ہوتے ہیں اور اس دین کے ماننے والوں میں شمار بھی ہوتے ہیں، لیکن ان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اس کا لحاظ رکھتے ہیں، اس کی پوری فکر رکھتے ہیں کہ وہ ایسی جگہ کھڑے ہوں جہاں سے ان کے لیے منتقل ہونا، ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ میں، ایک محاذ سے دوسرے محاذ میں، ایک ماحول سے دوسرے ماحول میں، ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہونا آسان ہو جائے۔

وہ ایسی سرحد پر کھڑے ہوتے ہیں، یعنی اپنے بارے میں ایسے مسلک زندگی کے اختیار کرنے اور ایسے طرز زندگی اور اصول زندگی کے اپنانے کا فیصلہ کیا ہے، جس کے ترک میں ان کو کوئی بڑی قربانی نہ کرنی پڑے، جس کی تبدیلی میں اس کو کوئی بہت بڑا مجاہدہ نہ کرنا پڑے، ان کا ہاتھ زمانے کی نبض پر رہتا ہے اور ان کی دور بین نگاہیں حکومت، سوسائیٹی اور وقت کے اقتدار کے چشم ابرو کے اشارے کو دیکھتی رہتی ہیں، ان کا دماغ سود وزیاں اور نفع نقصان کے موازنے سے ایک لمحہ کے لیے غافل نہیں ہوتا، اگر زمانہ ان کے موقف ومسلک اور ان کے مقام ومحل کے مطابق ہوتا ہے تو ان سے بڑھ کر اپنے مسلک کا پرجوش وکیل اور اس کی خدمت میں منہمک کوئی نظر نہیں آتا اور وہ پورے سکون قلب اور اعتماد نفس کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے ہیں''۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں، (اب اس کو آپ اخلاق ومعاشرت میں دیکھئے) کہ وہ عام طور پر جھوٹ نہیں بولتے، عام طور پر کوئی خلاف واقعہ نہیں کرتے، لیکن جب دیکھ لیتے ہیں، کبھی کوئی ایسا موقع خلاف واقعہ آتا ہے کہ ذرا سا ضمیر کے خلاف اور واقعہ کے خلاف کہہ دینے میں، کر دینے میں شہادت دینے میں، یا اس گروہ میں شامل ہو جانے میں جو بے اصول ہے، کوئی بہت بڑا فائدہ ہے تو وہ فوراً ادھر منتقل ہو جاتے ہیں، وہ اس سرحد سے آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ (۱)

(۱) اور اگر ہم غور کریں سرسری طور پر جو اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کبھی کبھی، لیکن ہم لوگ غور نہیں کرتے، لیکن اگر ہم بڑی بڑی مشہور شخصیتیں جو ہیں ان کے حالات پر غور کریں، (ہم ان کے نام نہیں لیں گے، غیبت بھی ہو جائے گی، قرآن مجید کا معاملہ ہے اور پردہ بھی ورنہ ہم نام لیتے بعض بعض بہت نامور شخصیتوں کا) کہ انہوں نے پاکستان کا انتخاب کیا لیکن وہاں انہیں وہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی، وہ اعتماد حاصل نہیں ہوا جو ہندوستان میں اعتماد حاصل تھا، وہاں بھی ان کا زوال آگیا، یہاں تک کہ بعض مرتبہ ان کو شہید کر دیا گیا، قتل کر دیا گیا، ایک نام ہمارے ذہن میں ایسا بھی ہے کہ جو پاکستان کے لیے بہت موزوں تھے، پاکستان کی تحریک کے علمبردار تھے، بڑا فائدہ اٹھایا اور ان کو جلسۂ عام میں قتل کر دیا گیا، شہید کر دیا گیا اور ایک دو واقعات ایسے پیش آئے ہیں، پھر ایسے تو سینکڑوں نہیں ہزاروں کی تعداد میں ہوں گے کہ آدمی یہاں کے فسادات سے بچنے کے لیے کہ بھائی یہاں ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں (Communal Rights) کمیونل رائٹس ہوتے ہیں اور مسلمان ہونا یہ ایک معنی بن جاتا ہے، انہوں نے پاکستان کا انتخاب کیا اور وہاں جا کر ان کو پریشانیاں پیش آئیں، خطوط آتے ہیں وہاں سے اور جب وہاں جانا ہوتا ہے تو زبانی سننے میں یہ سب باتیں آتیں ہیں کہ ہم تو یہاں یہ سمجھ کر آئے تھے، یہ سمجھ کر آئے تھے، ہمیں یہاں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

یہ زندگی میں ہماری رہنمائی کرنے کے لیے کہ "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ" لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کی بندگی کرتے ہیں، اس کے دین پر چلتے ہیں، اس کے احکام کو مانتے ہیں، یہاں "یَعبُدُاللّٰـهَ" کے معنی خالی نماز پڑھنے کے نہیں ہیں خالی، یہ عبد، یعبد، کے معنی عربی میں "صَلّٰی، يُصَلِّیْ" کے نہیں ہیں "لِیَصُومَ" کے نہیں ہیں "یَحُجُّ" کے نہیں ہیں خالی، یہ سب چیزیں اس میں آتی ہیں، اللہ کی بندگی، اللہ تعالیٰ کے سامنے سر اطاعت خم کرنا اور اپنے کو اس کے حوالے اسلام جس کا نام ہے، اپنے کو حوالے کر دینا یہ عبادت ہے۔

لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں، جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں، یعنی اللہ کے دین کو انہوں نے قبول کیا ہے مانتے ہیں اور بہت سے دین کے جو فرائض اور شعائر ہیں وہ ان کی زندگی میں نظر آتے ہیں اور جو دیکھے گا کہے گا ہوں یہ مسلمان ہے۔ لیکن وہ کنارے پر کھڑے ہو کر اللہ کے دین پر چلتے ہیں، اللہ کے دین کو مانتے ہیں کہ اگر فائدہ اس میں دیکھا کہ پیچھے ہٹ جائیں، تو پیچھے ہٹ جائیں، یا اسی جگہ کھڑے رہیں، یا اگر فائدہ آگے بڑھنے میں دیکھا وہاں کچھ مل رہا ہے، وہاں عہدہ مل رہا ہے، وہاں حکومت مل رہی ہے، وہاں عزت مل رہی ہے، وہاں دولت مل رہی ہے، کمپنی مل رہی ہے، فوراً بس ایک قدم آگے بڑھا، بس وہاں پہنچ گئے۔

"فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ" سرحد پر اگر اس کو کوئی خیر پہنچی، "اِطْمَأَنَّ بِهٖ" مطمئن ہو گیا، کہ بہت اچھا فیصلہ کیا کہ ٹھیک ہے، میں صحیح جگہ پر کھڑا ہوں اور مجھے یہیں رہنا چاہئے تھا، "وَ اِنْ أَصَابَتْـهُ فِتْنَةٌ" اگر اس کو کوئی آزمائش پیش آئی، وہاں اس کو کوئی اس کی قیمت ادا کرنے کا معاملہ آیا تو یہاں کھڑے ہونے سے یہ کرنا پڑے گا اور پیچھے ہٹنے سے یہ کرنا پڑے گا تو آگے بڑھ گیا، آگے بڑھنے سے یہ قربانی دینی ہوگی، یہ آزمائش پیش آئے گی، "اِنْـقَلَـبَ عَلٰـى وَجْهِـهٖ" تو وہ اپنے چہرہ پر الٹ گیا، یعنی پیچھے کو ہٹ گیا،....." یعنی اگر حالات ذرا بھی ساز گار ہوتے ہیں اور وہ حکومت کے سوسائٹی اور عوام کے تیور بدلے ہوئے دیکھتے ہیں، تو وہ فوراً اپنا مسلک تبدیل کر دیتے ہیں اور پہلے مسلک کی "تہمت" سے بھی بچتے ہیں،

ان کو اپنی وضع قطع، اپنے عقائد وخیالات اپنی تہذیب ومعاشرت اور اپنی زبان وکلچر بلکہ اپنی قومیت کو بھی تبدیل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی"۔

"خَسِرَ الدُّنیَا وَ الآخِرَۃَ" اس کا انجام حقیقی جو ہے وہ یہ ہے کہ دنیا وآخرت دونوں کا نقصان اس کو ہوتا ہے، بااصول لوگوں کا دونوں جگہ فائدہ ہوتا ہے اور وہ بالکل ایک حقیقت ظاہرہ باہرہ اور مشاہدہ، مشاہدہ نہیں ایک بدیہی چیز ہے، لاکھوں کروڑوں مشاہدات ہیں، لیکن ہے ذرا کام مشکل "ذٰلِکَ هُوَ الخُسرَانُ المُبِین" یہ بڑا کھلا ہوا نقصان ہے۔

ضمیر فروشی کا انجام

"یَدْعُو مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَالا یَضُرُّہٗ ومَالا یَنْفَعُہٗ" ایسے لوگ بھی ہیں وہ شخص جو "یَعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ" کا مصداق ہے وہ بھی اللہ کے سوا اسکو پکارتا ہے کہ جو نہ اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور جو نہ اس کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، یہ نقصان پہنچانے والا یا فائدہ پہنچانے والا یہ ہمیشہ شخصی شکل میں نہیں ہوتا، بلکہ یہ اصولوں کی شکل میں بھی مل سکتا ہے، یہ کلام کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے اور رشوتوں کی شکل میں ہوسکتا ہے اور خوشامدوں کی شکل میں بھی ہوسکتا ہے، یہ آیت حاوی ہے، اس سب پر کہ وہ ایسے کو پکارتا ہے، جو نہ نقصان پہنچا سکتی ہے، وہ چیز اور نہ نفع پہنچا سکتی ہے، کوئی رشوت دے کر کام نکالنا چاہتا ہے، کوئی خوشامد کرکے کام نکالنا چاہتا ہے، کوئی بداخلاقی کا کوئی عمل کرکے کام نکالنا چاہتا ہے، لیکن اخیر میں معلوم ہوتا ہے کہ کچھ فائدہ نہیں ہے، "ذٰلِکَ هُوَ الضَّلٰلُ البَعِید" یہ سب کھلی ہوئی گمراہی ہے، بہت دور کی گمراہی ہے، "یَدْعُوْ لَمَنْ ضَرُّہٗ أَقْرَبُ مِن نَفعِہٖ" وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کو بلاتا ہے اپنی مدد کے لیے، جس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے، یعنی وہ نقصان پہنچانے پر زیادہ قادر ہے، اس کو نقصان پہنچانا زیادہ سہل ہے اور نفع پہنچانا اس کے مقابلے میں دشوار ہے، اس لیے کہ نفع پہنچانے میں کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے، کچھ قربانی کرنی پڑتی ہے، کچھ ایثار کرنا پڑتا ہے اور نقصان پہنچانے میں کچھ نہیں ہے، تو نقصان کو ترجیح دیتا ہے، بجائے نفع پہنچانے کے، چاہے اس کے ساتھ معاملہ ہو، جو اس کا دوست ہو، جس نے اس کے لیے ضمیر فروشی سے کام لیا ہے، بے اصولی سے کام لیا ہے، لیکن وہ آدمی خدا سے ڈرنے والا تو ہے نہیں،

وہ دیکھتا ہے، اس کی میں مدد کرتا ہوں تو کوئی فائدہ نہیں ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس کا کوئی مقام نہیں ہے، اس کا کوئی حلقہ نہیں ہے، تو میں ایسے شخص کی مدد کروں جس سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے، یہ تو اس امید پر اس کی خوشامد کر رہا تھا اور اس کو اس کے لیے بے اصولی برت رہا تھا، کہ اس سے فائدہ پہنچے گا، اور وہ اس کو نقصان پہنچا دیتا ہے، "لَبِئْسَ الْمَوْلیٰ وَ لَبِئْسَ الْعَشِیر" بُرا مددگار سرپرست وہ بُرا اعزیز ہے بُرا ساتھی۔

"اس ابن الوقت گروہ کو دیکھ کر یہ آیت جس طرح سمجھ میں آتی ہے اور اس کی بلاغت واعجاز جس طرح نمایاں ہوتا ہے، وہ بڑی بڑی تفسیر سے اس طرح نمایاں نہیں ہوتا، خطرے اور شبہ سے بچنے کے لیے اس ابن الوقت گروہ کے انتظامات اور اس کی احتیاط دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

"وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ فَإِذَا أُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ" (العنکبوت: ۱۱) "اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان لے آئے، جب ان کو خدا کے راستے میں کوئی ایذا پہنچتی ہے، تو لوگوں کی ایذا کو یوں سمجھتے ہیں جیسے خدا کا عذاب ہے"۔

اگر وہ نسبت سرخروئی اور سرفرازی کا باعث ہوتی ہے، تو اپنی قدیم تاریخ اپنے اسلاف اور اپنے دور ماضی کو دیا دلاتے ہیں اور کہیں نہ کہیں سے وہ اپنا تعلق نکال لیتے ہیں "وَلَئِنْ جَاءَ نَصْرٌ مِنْ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ" (العنکبوت:۱۱) (اور اگر وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے مدد پہنچے تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے) لیکن اللہ تعالیٰ کو حقیقت حال معلوم ہے۔ "أَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُوْرِ الْعَالَمِيْنَ" (العنکبوت: ۱۱) (کیا جو اہل عالم کے سینے میں ہے خدا اس سے واقف نہیں؟) عام طور پر ان زمانہ سازوں کا انجام برا ہوتا ہے اور کسی گروہ میں ان کی وقعت نہیں ہوتی، اسی لیے فرمایا گیا ہے "خَسِرَ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ. ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ" شاعر نے اسی موقع کے لیے کہا ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے [1]

(۱) مشترک اخذ و تلخیص۔ از: ☆ درس قرآن، سورہ حج: ۱۱ (غیر مطبوعہ) ☆ دو انسانی چہرے قرآنی مرقع میں: ۲۰-۲۳

ذی روح شہیدوں کی جگہ خلدِ بریں ہے

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْا أَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقاً حَسَناً. وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْن. لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُدْخَلاً يَّرْضَوْنَهُ وَإِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ. ذٰلِكَ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ. إِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْر. ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ اللَّيْلَ فِيْ النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِيْ اللَّيْلِ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ. ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ. وَأَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ﴾ (الحج: ۵۸-۶۲)

''اور جن لوگوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی، پھر مارے گئے، یا مر گئے، ان کو خدا اچھی روزی دیگا، اور بیشک خدا سب سے بہتر رزق دینے والا ہے، وہ ان کو ایسے مقام میں داخل کرے گا، جسے وہ پسند کریں گے، اور خدا تو جاننے والا (اور) بردبار ہے، یہ (بات خدا کے ہاں ٹھہر چکی ہے) اور جو شخص (کسی کو) اتنی ہی ایذا دے جتنی ایذا اس کو دی گئی، پھر اس شخص پر زیادتی کی جائے، تو خدا اس کی مدد کرے گا، بیشک خدا معاف کرنے والا (اور) بخشنے والا ہے، یہ اس لیے کہ خدا رات کو دن میں داخل کرتا ہے، اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور خدا تو سننے والا دیکھنے والا ہے، یہ اس لیے کہ خدا ہی برحق ہے، اور جس

چیز کو (کافر) خدا کے سوا پکارتے ہیں، وہ باطل ہے، اور اس لیے کہ خدا رفیع الشان اور بڑا ہے"۔

یہ حکمتِ الٰہی اور اعجازِ قرآنی ہے

دیکھئے! ان آیات میں، اس رکوع میں ہر آیت کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے یا اس کی صفت میں سے کسی صفت کا ذکر ہے، یعنی آیت کو ختم کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ کی کسی صفت اور اس کی شان پر، اس کے فعل پر یا اس کے اسمائے حسنیٰ میں سے کسی اسم پر، اس میں اگر غور کریں گے آپ تو یہ اعجازِ قرآنی ہے، حکمت الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نام اسمائے حسنیٰ ہیں "وَلِلّٰهِ الأَسْمَاءُ الحُسنىٰ فَادْعُوْهُ بِهَا" (الاعراف:۱۸۰) (اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں) اور کسی صفت کا بھی انتخاب ہوسکتا تھا اور عام طور سے ادبی کتابوں میں، شاعری میں، نظموں میں، مقفّٰی عبارتوں میں کوئی ایسا لفظ، جوڑ یا مناسبت ہوتی ہے، وہ آجاتی ہے اگر آپ غور کریں (ہمیں قرآن مجید میں تدبر کرنے کا موقع نہیں ملتا اور اچھے اچھے لوگوں کو موقع نہیں ملا اور حق تو کسی سے ادا نہیں ہوسکا، اگر یہ کہا جائے کہ آج تک قرآن مجید کے اعجاز کے بیان کا اور قرآن مجید کی تفسیر کا، اس کے لطائف اور مضمرات کے اظہار کا، پورا اظہار تو ناممکن ہے، لیکن کسی درجہ میں اس کا حق ادا کرنا، یا یہ کہ سامعین، پڑھنے والوں کے علم میں ہمیشہ اضافہ کرنا، یہ نہیں ہوسکا اور یہ اعجازِ قرآنی ہی کی ایک دلیل ہے) کہ قرآن مجید معجزہ ہے، قرآن مجید اعجاز ہے، یہ اعجاز معنوی طور پر بھی اعجاز ہے اور لغوی طور پر بھی اعجاز ہے یعنی صرف یہی نہیں کہ ویسا کلام کوئی نہیں کہہ سکتا، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کلام کے بیان کا حق بھی کوئی ادا نہیں کرسکتا، اس اعجاز قرآنی، اس بلاغت قرآنی کا حق بھی کوئی ادا نہیں کرسکتا، یہ ہم نے پہلے سے متوجہ کیا، تاکہ آپ غور کریں اس پر۔

جہاد فی سبیل اللہ پر جو بھی نکلتا ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْا أَوْمَاتُوْا" "اور وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اللہ کے راستے میں، پھر وہ شہید کئے گئے یا مارے گئے"

یعنی اس راہِ ہجرت میں، سفر ہجرت میں اور ترک وطن کے سفر میں اور کفر سے ایمان کی طرف منتقل ہونے میں، ان مراحل سے گذرنے میں، اگر ان کا وقت موعود آگیا، جو وقت مقرر ہے، وہ تو دوسرے کے مارنے سے بھی آسکتا ہے، آسکتا کیا ہے، آتا ہے، یا یہ کہ وہ قتل نہ ہو، کوئی دوسرا یہ ظلم نہ کرنے، ناانصافی نہ کرے، تو اپنے وقت پر موت یوں بھی آتی ہے، تو جو لوگ مارے گئے، یا مرے خود اپنی موت سے تو ''لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقاً حَسَناً'' اللہ تعالیٰ ان کو ضرور رزق حسن عطا فرمائے گا''۔

قبولِ اسلام کا ایک واقعہ

دیکھئے! موت یا شہادت سے، سب سے پہلے، جو ذہن منتقل ہوتا ہے، یہ فطرتِ انسانی کی بات ہے، وہ یہ کہ اب سب کچھ گیا، چنانچہ ایک مکی (جبار بن سلمٰی) نے جو بہت غلیظ القلب تھے، بہت سخت تھے، اسلام سے ان کو بڑی نفرت تھی انہوں نے ایک صحابی (حزام بن ملحان) کو شہید کیا اور شہید کرنے کے بعد وہ خود مسلمان ہو گئے، لوگوں نے کہا، بات کیا ہوئی متضاد؟ آپ نے مسلمان کو تو شہید کر دیا، خود مسلمان ہو گئے، آپ نے کیا دیکھا؟ اتنے دن سے آپ سن رہے تھے، آپ کے سامنے اسلام کی دعوت آرہی تھی، آپ مسلمان نہیں ہوئے تھے، اب کیا چیز دیکھی؟ کہنے لگے کہ بات یہ ہوئی کہ.... میں نے اس کو نیزہ مارا، وہ سینہ کے پار نکل گیا اور تڑپ کر وہ گرے اور انہوں نے کہا ''فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ'' رب کعبہ کی قسم میں تو کامیاب ہو گیا،........ میں سوچنے لگا۔ کیسی کامیابی ہے؟ کیا میں نے ان کو قتل نہیں کیا؟ (ایک تو پہلی بات ذہن میں رکھیں کہ عرب جھوٹ نہیں بولتا، دوسری بات یہ کہ مرتے وقت کوئی بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ دونوں باتیں جمع ہو گئیں) تو میں سوچنے لگا کہ آخر کیا دیکھا اس نے جو کہا میں کامیاب ہو گیا؟ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ تڑپ کر گرا اور آخری وقت آگیا، انتقال ہو گیا، بیوی بچوں کا ساتھ چھوٹا، کھانے پینے کا کوئی موقع نہیں رہا، کسی نعمت سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا، آئندہ کے جو ترقی کے امکانات تھے، یا کمائیاں تھیں، یا دولت کا پیدا کرنا تھا، یا عزت کا حاصل کرنا تھا، یا زندگی سے لطف اٹھانا تھا، سبھی کا

سلسلہ ختم ہوا پھر اس نے کیا دیکھ کر کہا کہ میں کامیاب ہوا، "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" اور پھر کعبہ کے رب کی قسم کھا کر، کیا مسلمان ہی تھے، تو میرے دل میں ایک سوال پیدا ہوا، کسی نے جیسے دل پر نشتر سا لگایا، تو میں نے لوگوں سے پوچھا کہ آخر انہوں نے کیا دیکھ کر کہا کہ میں کامیاب ہوگیا؟ انہوں نے کہا کہ تم نہیں جانتے ہو، وہ مسلمان تھے، وہ شہادت پر خوش ہوئے اور انہوں نے دیکھا کہ کیا نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملیں گی، اس پر ایمان تھا ان کا اور ان کے لیے وہ سلسلہ شروع ہوگیا، تو میں ایمان لے آیا۔

اجل اس کو حیاتِ جاوداں معلوم ہوتی ہے

اب یہاں پر دیکھئے یہی بات ہے کہ "وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْا أَوْ مَاتُوْا" جب وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید کئے گئے، یا وہ طبعی موت سے مرے، تو اب رزق کا سارا سلسلہ ختم ہوگیا، جتنے تمتعات تھے، جتنے استفادے تھے، جتنی لطف کی چیزیں تھیں، جتنی لطف اندوزیاں تھیں اور بہرہ مندیاں تھیں، کامیابیاں تھیں، ترقیاں تھیں، سب کا سلسلہ ختم ہوگیا، یہ موت کے ساتھ اس کا ضرور تخیل آتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسکے جواب میں یہ کہتا ہے کہ "لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقاً حَسَناً" "اللہ ان کو ضرور رزق حسن عطا فرمائے گا" کوئی نقصان نہیں ہوا، اب یہاں پر یہی کہنے کا موقع تھا، جنت ان کو ملی، جنت ان کو ملے گی، یہ سب ایمان بالغیب کی باتیں تھیں، لیکن پہلا خیال جو آتا ہے کسی کی موت پر، یا کسی کی شہادت پر، وہ یہ کہ دنیا سے گیا، اب نہ کھانا ہے، نہ پینا ہے، نہ بیوی بچوں میں بیٹھنا ہے، نہ بچوں کو دیکھ کر خوش ہونا ہے، نہ گھر کی آسائشیں ہیں اور سکون ہے، نہ لوگوں کی تعریفیں ہیں، نہ سیر ہے، کچھ بھی نہیں ہے، تو "لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقاً حَسَناً".

"وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ" اور یہ کیوں نہ ہو، کیسے نہ ہو، رزق حسن کیوں نہ ملے؟ اس لیے کہ صاحبِ رزق، رزق کا جود دینے والا ہے، وہ "خَيْرُ الرَّازِقِيْنَ" ہے، اب اس "خیر الرازقین" میں پورا ایک کتاب کا مضمون ہے، کہ وہ تو بے استحقاق بھی رزق دیتا ہے، تو با استحقاق کیوں نہ دے گا اور استحقاق بھی کیسا؟ شہادت کا استحقاق، جس اللہ کے

بندے نے اللہ کے راستے میں جان دی اور سب کچھ لٹا دیا، تو جو شریف آدمی ہے وہ اس کا صلہ دیتا ہے، مانتا ہے، اعتراف کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفت تو شکور بھی ہے، ''وَاِنَّ اللّٰہَ لَھُوَ خَیْرُ الرَّازِقِیْن'' ''اور یقیناً اللہ سب دینے والوں میں اچھا (دینے والا) ہے''

قرآن مجید کا کوئی لفظ نہ زائد ہے، نہ کم ہے، نہ بے محل ہے، مگر ابھی تک کام قیامت تک کے لیے باقی ہے۔(۱)

شہید راہِ خدا کو نئی حیات ملی

''لَیُدْخِلَنَّھُمْ مُدْخَلاً یَرْضَوْنَہٗ'' ''ان کو ضرور داخل کرے گا، ایسے داخل ہونے کی جگہ پر، جس سے وہ خود بھی خوش ہوں گے'' ایسی جگہ کا انتخاب کیسے ہو سکے گا اور یہ کیسے معلوم ہوگا کہ وہ خوش ہوں گے، ''وَاِنَّ اللّٰہَ لَعَلِیْمٌ حَلِیْمٌ'' دیکھو...! یہ دونوں صفتیں یہاں کے لیے مناسب ترین ہیں، یعنی ان کے مناسب کون سا مقام ہے، اس کے لیے تو ''علیم'' کی ضرورت ہے اور اس کے اندر جو تھوڑی سی بشریت کی کمزوریاں تھیں اور کبھی کبھی ان سے کوتاہی ہوئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت عمدہ جگہ نہ دی جائے، جب حساب کیا جاتا ہے، بڑے سے بڑا استاد ممتحن ہوتا ہے، یا بادشاہ ہوتا ہے اور بڑا محسن اور اپنے زمانے کا فیاض وہ بھی دونوں باتوں کا لحاظ رکھتا ہے، تو اسمیں اس کا یہ خیال کرنا ہے، کہ اس نے کیا

(۱) قرآن کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہتے ہیں، عربی زبان کے بھی، عربی ادب کے بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے کہتے ہیں اور اللہ کے فضل وکرم سے، یہ محض اللہ کا فضل ہے، ہم بھی اس قابل نہیں تھے، کہ ہمیں دونوں سلسلوں میں بہترین استاد ملے، جہاںتک عربی ادب کا تعلق ہے، اس میں ہمیں عرب کے استاد ملے اور مولانا خلیل عرب کے جیسا استاد تو ہم نے بلاد عربیہ میں بھی نہیں دیکھا، ایسا صاحب ذوق اور قرآن مجید کے سلسلے میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ، جو گویا امام تفسیر تھے، وہ ملے اور پھر اس کے بعد دوسرے اساتذہ بھی ان سے ہم نے پڑھا، تو یہ قرآن مجید ہمیشہ غور کرنے کے لیے، اس کے اندر گنجائش کا لفظ بے ادبی کا ہے، لیکن اس کے اندر ایک وسیع میدان کیا ایک عالم رہے گا، کبھی یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ کسی نے تفسیر ختم کردی، تفسیر کا حق ادا کردیا، کسی کی تنقیص نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سب کے درجہ بلند فرمائے، امام رازیؒ ہوں یا ابن کثیرؒ ہوں، یا طبریؒ ہوں، یا بعد کے لوگ ہوں، صاحب روح المعانی ہوں، یا آلوسیؒ ہوں، لیکن یہ کہ ابھی تک باقی ہے قرآن مجید پر غور کرنا۔

کارنامہ انجام دیا، اس کا بھی خیال کرنا ہے، کہ اس میں اس سے کچھ کوتاہیاں ہوئیں، تو سب سے اونچے درجے کی چیز نہ دی جائے، تو پہلے تو ''اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ'' اس کے لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس کو بہترین مقام دے گا، اس لیے کہ وہ ''علیم'' ہے اور اگر کمزوریاں ہوئیں، تو وہ ''حلیم'' بھی ہے۔

''ذٰلِکَ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِہٖ'' اور یہ بات اس لیے ہے کہ جس شخص نے وہ معاملہ کیا اپنے حریف کے ساتھ کہ جو اس حریف نے معاملہ کیا تھا اس کے ساتھ، جس نے اس کے حملہ کا جواب دیا، اس کے مناسب ''ثُمَّ بُغِیَ عَلَیْہِ'' ''پھر اس کے بعد اس پر زیادتی کی گئی'' یعنی وہ جواب تو جواب ہو گیا، لیکن اس کے بعد اضافہ کیا اس نے جس کا حق نہیں تھا تو ''لَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ'' وہاں پر اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا، یعنی جب مقابل کے دو لوگ ہیں اور جنگ تُرکی بہ تُرکی ہوئی ہے، تو اب ہو گیا معاملہ صاف کہ اس نے تلوار کا وار کیا، اس نے بھی کیا، لیکن اس کے بعد اس نے دوسرا وار کیا بلا استحقاق، تو پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''لَیَنْصُرَنَّہُ اللّٰہُ'' اب اللہ تعالیٰ یہاں پر اس کی مدد کرے گا۔

''وَاِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ'' بیشک اللہ تعالیٰ ''عَفُوْ'' بھی ہے، ''غَفُوْرٌ'' بھی ہے، یہ بھی اس لیے کہ جس کو جزا دے رہا ہے، سزا دے رہا ہے، اس سے بھی کوتاہیاں ہوئی ہیں، معلوم نہیں کس جذبہ سے اس نے مقابلہ کیا، کوئی ضروری نہیں ہے کہ آدمی میں ایمان و احتساب ہی ہو، شہادت کا شوق ہی ہو، جنت میں جانے کا شوق ہی ہو، رضائے الٰہی کے لیے کیا ہو، ممکن ہے غصہ بھی ہو اس میں، ممکن ہے کسی زمانے کی کوئی شکایت ہو، رنج ہو تو ''اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ'' یہ اللہ تعالیٰ نے ''عفوٌ وغفورٌ'' ہونے کے اسم کا فعل جو ہے، بہر حال ہر ایک کے ساتھ، ہر ایک اس کا محتاج ہے، مطلب اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ ''عفو وغفور'' ہے، ہر ایک اس کا محتاج ہے اور یہ الفاظ ہر ایک کے لیے برمحل ہیں، ''اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ'' ایسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ بے نیاز ہے، اس کی ذات بے نیاز ہے، جو اللہ کے راستے میں لڑے گا، شہادت پائے گا اور مظلوم ہوگا، وہ بھی کوئی احسان نہیں کریگا اللہ پر اس کو بھی ضرورت ہے اس کی کہ وہ اللہ کو ''عفوٌ'' اور ''غفورٌ'' مانے اور یاد کرے۔

دلیلِ قدرتِ پروردگار ہے گردشِ لیل ونہار

"ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ اللَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی اللَّیْلِ" اور یہ کہ ایک کمزور کو غالب کردیا طاقتور پر، قلیل کو کثیر پر فتح دی اور فقیر کو غنی پر فتح دی، یہ ایسا معاملہ ہے جو بالکل خلاف قیاس ہے، فرماتا ہے، اس کے لیے کیا خلاف قیاس بات ہے۔ "وہ تو رات کو داخل کرتا ہے دن میں" کہ دن ہوتا ہے اور رات آجاتی ہے اور "دن کو داخل کرتا ہے رات میں" کہ رات کا اندھیرا ہوتا ہے چاروں طرف، اس کی تاریکی چھائی ہوتی ہے اور صبح کی روشنی طلوع ہوتی ہے "وَاِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ" اور یہ کہ اللہ تعالیٰ "سمیع" اور "بصیر" ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ جو معاملہ کرتا ہے فریقین کے درمیان اور اپنی قدرت کا اظہار کرتا ہے، یہ کوئی بعید بات نہیں، یہ تو روز ہوتا رہتا ہے، یہ انقلاب تو روز ہوتا ہے، حتی کہ روز دن میں سے رات نکلتی ہے اور رات میں سے دن نکلتا ہے اور یہ قلیل وکثیر یہ جو اللہ نے رات اور دن کا ذکر کیا ہے، اس میں افراد کی آپس کی جنگ اور تقابل بھی آجاتا ہے اور قوموں کے اور ملکوں کے اور طاقتوں کے کہ دن تو بہت بڑا ہوتا ہے، کہاں تک پھیلا ہوا ہے (ہم نہیں کہتے جہاں دن نہیں ہے آج، اس وقت یورپ میں نہیں ہوگا دن، لیکن جتنے رقبے میں، جتنے حلقے میں دن پھیلا ہوا ہے، کتنا رقبہ بڑا ہے اور اس میں رات آجاتی ہے اور رات جب آتی ہے تو کتنے بڑے رقبہ پر چھاجاتی ہے، لیکن دن آجاتا ہے) تو افراد کے معاملے میں بھی یہی اللہ اپنی قدرت دکھاتا ہے، قوموں کے معاملے میں بھی، عرب کے لوگ جو مٹھی بھر لوگ تھے، یہ جو نکلے جہاد کے لیے اور دعوت ایمانی کیلیے، روم وشام ساسانی امپائر تھے، ان کے مقابلے میں، ان کی کیا حیثیت تھی؟ "ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ یُوْلِجُ اللَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی اللَّیْلِ" کچھ تعجب نہ کرو، اللہ دن میں سے رات نکالتا ہے، اور رات میں سے دن نکالتا ہے۔

"ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الحَقُّ" بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حق ہے، "وَاَنَّمَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ البَاطِلُ" اور یہ جس کو پکارتے ہیں، جس کی عبادت کرتے ہیں، اور جس سے دعا کرتے ہیں وہ باطل ہیں۔

''وَأَنَّ اللّٰهَ هُوَ العَلِيُّ الکَبِیْرُ'' اور بیشک اللہ تعالیٰ ''العلی'' ہے،اور''الکبیر'' ہے، وہ بلند بھی ہے،اور بڑا بھی ہے،اب ''العلی الکبیر'' میں وہ استحقاق سارا آجاتا ہے، جس کی وجہ سے کوئی کسی سے مانگتا ہے،کوئی کسی کا اپنے کومحتاج سمجھتا ہے اور کوئی سمجھتا ہے کہ وہ ہمیں سب کچھ دے سکتا ہے،تو''العلی الکبیر'' کی صفت ان سب پر حاوی ہے،بعض چیز میں ''العلی'' ہے،لیکن وہ بڑا نہیں ہے،یعنی وہ اونچا ہوگیا،کسی پر چڑھ کر اونچا ہوگیا،لیکن اللہ ایسا اونچا نہیں کہ کسی چیز پر چڑھ کر اونچا ہوا ہو،وہ''الکبیر'' ہے،وہ بڑا ہونے کی وجہ سے ''العلی'' ہے اور بلند ہونے کی وجہ سے''کبیر'' ہے،بعض ایسے ''کبیر'' ہوتے ہیں،جو بلا استحقاق اور بلا قد وقامت، بلا کسی بلندی کے وہ بڑے ہوجاتے ہیں،دولت یا وراثت کی وجہ سے تو ''العلی الکبیر'' کا خاص جوڑ ہے،کہ''کبیر''ہو اور ''علی'' نہ ہو،نقص ہے،''علی'' ہو اور''کبیر'' نہ ہو،تو وہ بڑا نہیں ہے،''علی'' ہونے کے قابل ہی نہیں ہے،اتفاق سے اس کو موقع مل گیا کسی طرح سے وہ بلند ہوگیا،تو''العلی الکبیر'' جب چڑھ جائیں،تو پھر پورے طور پر وہ مکمل''علو'' ہے،مکمل''کبیر'' ہے۔[1]

(۱) درس قرآن،سورۂ حج:۵۸-۶۲(غیر مطبوعہ)

گردوپیش کے واقعات سے فائدہ اٹھانا چاہیے

﴿سَنُرِيْهِمْ آيَاتِنَا فِيْ الآفَاقِ وَفِيْ أَنْفُسِهِمْ حَتىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلىٰ كُلِّ شَيْئٍ شَهِيْدٌ﴾(حٰمٓ سجدہ: ۵۳)

''ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ (قرآن) حق ہے، کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے خبردار ہے''۔

یہ آیت بھی بڑی چشم کشا اور فکر کی دعوت دینے والی ہے اور قرآنی اعجاز میں اس کو کہا گیا ہے، مضمون کو بیان کیا گیا ہے، ''سَنُرِيْهِمْ آيَاتِنَا فِيْ الآفَاقِ وَفِيْ أَنْفُسِهِمْ'' یہ ہماری بیسویں صدی کا زمانہ ہے اور اس سے بھی زیادہ ترقی یافتہ زمانہ ہوسکتا ہے، اس وقت تک بیسویں صدی کا زمانہ جتنی تاریخ محفوظ ہے، اس میں اس کی روشنی میں یہ سائنس، ٹکنالوجی اور میڈیسن وغیرہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ زمانہ ہے، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اسی زمانہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے، لیکن اس کی اس زمانہ کی طرف اشارہ نہیں بلکہ اس کے بعد کے زمانوں کی طرف بھی اشارہ ہے، اگر ابھی اللہ کا فیصلہ ہے دنیا کو باقی رکھنے کا ہے، تو اس سے بھی زیادہ ترقی ہوگی، اب یہ کسی کے تصور میں ابھی نہیں ایک ایسی تھوڑی مقدار میں ایک چیز ایسی ہے جو ملک کے ملک فنا کرسکتا ہے، آپ ہیروشیما، ناگاساکی کے قصے پڑھیں، جہاں امریکہ نے بم گرایا تھا، جاپان کے علاقہ میں، تو حیرت ہو

جائے گی کہ ایسی چھوٹی چیز میں اتنی طاقت ہے، اتنی وسعت ہے اور تدمیر کا اتنا بڑا مادہ ہے، اگر وہ صحیح روایات سے اور ذرائع ابلاغ سے نہ پہنچے اور لوگ وہاں گئے ہیں اور دیکھا ہے لوگوں نے اب تو وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، زمانہ ہو گیا کہ جو صرف ایٹمک انرجی کو سمجھ لے، تو وہ اس کے بعد کسی چیز میں شک نہیں کر سکتا، قرآن مجید میں جو کچھ ہے، صحف سماوی میں جو کچھ آیا ہے، یا انبیاء علیہم السلام نے جو کچھ بیان کیا ہے، کتنی ہی قیاس کے خلاف ہو تجربہ کے خلاف ہو، بالکل مستحیل معلوم ہو وہ بھی اس کے نزدیک مستحیل نہیں ہے۔

اب آفاق کا جو لوگ عربی زبان اور اس کے الفاظ اور اس کی قوت وطاقت سے واقف ہیں، یہاں پر آفاق کا لفظ ایسا مناسب آیا ہے، چہار دانگ عالم میں اور پوری کائنات میں افق میں بلند سے بلند جگہ پر اور نشیب سے نشیب کی جگہ پر اور موبق فی الشمال اور موبق فی الجنوب، جو شمال انتہائی شمال میں ہے اور جو انتہائی جنوب میں ہے، انتہائی مشرق میں ہے، سب آفاق کے اندر آتا ہے۔

"سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا" اور پھر یہاں "آيَاتِنَا" کہا، دو باتیں ایک تو جمع کا صیغہ لایا گیا، پھر اضافت اپنی ذات عالی کی طرف کی گئی، ہم اپنی نشانیاں دکھائیں گے، تو اس سے نشانیوں کی عظمت اور ان نشانیوں کی دقت ان کا کسی کے بس کا نہ ہونا اور مشکل سمجھ میں آنا سب آجاتا ہے، "سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ" اور ان کی ذات میں بھی ہم دکھائیں گے اپنی نشانیاں، "سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الآفَاقِ حَتىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ .... اِنَّهُ عَلىٰ كُلِّ شَيْئٍ شَهِيدٌ" .

تو یہ اس وقت کی جو علمی ترقیاں ہیں، وہ بالکل انسان کو اس کے لیے تیار کر رہی ہیں، اگر توفیق الٰہی نہ ہو، بے توفیقی ہو تو الگ بات ہے، یا مہر لگ گئی ہو، ورنہ انسان کو تیار کر رہی ہے کہ وہ ہر ایسی چیز کو جس کو پہلے لوگوں نے جس کا انکار کیا تھا، پہلے خود آدمی انکار کر رہے تھے، ہم نے آپ کے سامنے کہا تھا کہ سر سید نے تفسیر لکھی اور ان کی تفسیر میں بری قابل اعتراض چیزیں ہیں اور وہ اس وجہ سے کہ انہوں نے اس وقت تک کی معلومات کو معیار بنایا اور اس وقت تک کے مطالعہ کو انہوں نے بنیاد قرار دیا اور جب وہ یورپ گئے اور وہاں

یورپ کی ترقیاں دیکھی، تو وہ بہت متاثر ہوئے، انہوں نے یہ چاہا کہ اب پڑھے لکھے طبقہ، اس میں کوئی ایسی چیز نہ آئے، جس سے پڑھا لکھا طبقہ شک میں پڑجائے، یا انکار کرنے پر آمادہ ہوجائے، وہ خود بھی یہ ثابت کرسکتے تھے کہ ممکن ہے کہ اس کو بھی انہوں نے اس میں تھوڑی سی ان سے تساہل ہوا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ قرآن مجید عقل کے خلاف ہے، تو اصل میں بنیاد انہوں نے اس کو بنایا جو اس کی مرکزی کمزوری ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن مجید عقل کے خلاف نہیں ہے، عقل و تجربہ کے خلاف نہیں ہے، لیکن یہ کہ عقل اور تجربہ دونوں محدود ہیں اور اتنے محدود بھی نہیں ہیں، عقل و تجربہ سے بھی ان باتوں کی تصدیق ہوسکتی ہے اور آئندہ یہ عقل و تجربہ جو ہیں ایک جگہ منزل پر جا کر ختم نہیں ہوگئے، چل رہے ہیں، ان کا سفر جاری ہے، اس لیے کم سے کم یہ کرنا چاہئے تھا ممکن ہے، ہم اس کا انکار نہیں کرسکتے اور خواہ اس وقت سمجھ میں نہ آئے، کبھی سمجھ میں آئے گا۔

تو حضرت سلیمانؑ کے متعلق کہا گیا، "غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ" اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی ہوائیں عطا فرمائی تھیں، ہواؤں میں یہ طاقت رکھی تھی کہ جو منزل ایک مہینہ میں طے ہوسکتی ہے، جو مسافت وہ خود ہوا کے ذریعہ وہ صبح میں طے کرلیتے تھے اور "رَوَاحُهَا شَهْرٌ" اس طریقے سے تو اس میں انہوں نے تاویلیں کی ہیں، اس کی اور کوشش یہ کی ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ اس کو پڑھ کر شک میں نہ پڑے، اس وقت تک ہوائی جہاز چالو نہیں ہوا تھا، یعنی یہ ہوائی پرواز شروع نہیں ہوئی تھی، جب ہوائی جہاز نکلا، تو ان کے دوستوں نے کہا کہ سید صاحب کاش کہ ان کے زمانے میں ہوائی جہاز چل جاتا تو دیکھتے، ہوائی جہاز سے آدمی کہاں سے کہاں پہنچ سکتا ہے اور ہم دمشق گئے بمبئی سے سوار ہوئے، پہلا سفر ہمارے ہوائی راستے میں صبح صادق ہوگئی، ہم نے نماز پڑھ لی، جب دمشق پہنچے، تو ابھی صبح ہی نہیں ہوئی تھی، رات کے وقت مغرب کی طرف جارہے تھے اور اب کتنی بڑی مسافت کتنی جلدی طے ہوتی ہے، آپ میں ایسے لوگ ہوں گے، جو سفر نہیں کئے ہوں گے، آئندہ ان شاء اللہ کریں گے۔[1]

---

(۱) درسِ قرآن (غیر مطبوعہ) سورۂ حم سجدہ: ۵۳

ایک مکالمہ (۱)

یہ مکالمہ حکمت وبلاغت کا آئینہ اور موقع شناسی کا اعلیٰ نمونہ ہے:

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِيْ أَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّه‘. اِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِيْنَكُمْ أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَرْضِ الْفَسَاد. وَقَالَ مُوْسٰى اِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ. وَقَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَه‘ أَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا أَنْ يَقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ. وَقَدْ جَاءَ كُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَبِّكُمْ وَاِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُه‘. وَاِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ. اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ. يَا قَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِيْنَ فِي الْأَرْضِ. فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ بَاسِ اللّٰهِ اِنْ جَاءَ نَا قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيْكُمْ اِلَّا مَا أَرٰى وَمَا أَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ. وَقَالَ الَّذِيْ آمَنَ يَا قَوْمِ اِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ. مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَعَادٍ وَثَمُوْدَ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ. وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِلْعِبَادِ. وَيَا قَوْمِ اِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ. يَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِيْنَ. مَا لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ. وَمَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَمَالَه‘ مِنْ هَادٍ. وَلَقَدْ جَاءَ كُمْ يُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِمَّا جَاءَ كُمْ بِه. حَتّٰى اِذَا

هَلَکَ قُلْتُمْ لَنْ یَبْعَثَ اللّٰهُ مِن بَعْدِهٖ رَسُولًا. کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٌ. اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ. کَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا. کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴾ (المومن: ۲۶-۴۴)

ایک مومن جو اپنا ایمان پوشیدہ رکھے ہوئے تھا

یہ وہ مکالمہ ہے جو فرعون اور اس شخص کے درمیان ہوا جو منصب پیغمبری پر فائز نہیں تھا، اللہ نے اس کے دل کو اپنے دین کی سمجھ کے لیے کھول دیا تھا اور اسلام کی دولت سے اس کو نوازا تھا وہ اپنے وقت کے نبی برحق یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ہدایت و دینِ حق سے مشرف ہوا تھا۔ وہ قوم فرعون کا ایک فرد تھا، جو صاحب ایمان تھا، مگر اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا یہ مکالمہ بلاشبہ حکمت و بلاغت کا آئینہ ہے اور مردم شناسی، انسانی نفسیات سے گہری واقفیت اور اس پر عبور کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ بلیغ مثال ایک ایسے مکالمہ کی ہے جو بادشاہ وقت اور اس کے حاشیہ نشینوں سے ایک ایسے شخص نے کیا جو ہدایت یافتہ تھا اور اللہ پر ایمان رکھتا تھا، میں جب بھی اس مکالمہ کو پڑھتا ہوں تو اس پُرشکوہ انداز بیان کا دل پر اثر ہوتا ہے، درحقیقت اس مکالمہ کی ادبی حیثیت اور بلاغت اور اس کا حکیمانہ اسلوب، ادبی ذوق کے لیے بڑا سرمایہ ہے، اس کے اندر انسانی نفسیات کا گہرا علم جھلکتا ہے، ذہنی کیفیات کا اتار چڑھاؤ نظر آتا ہے اور مزید یہ کہ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا "واتــو البیـوت مـن ابوابهـا" یعنی گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو، اس کی بھی بڑی حسین رعایت ملتی ہے، یہ ایک ایسے شخص کی حکایت ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے کہ اس کی علمی سطح کیا تھی وہ کہاں پلا اور بڑھا کس طرح اس کی علمی و ذہنی تربیت ہوئی اور اس نے کیسے حکمت و بلاغت می ں اس درجہ کمال حاصل کیا یاں یہ معلوم ہوا کہ ایمان ایک ایسی دولت ہے جس سے عجائب وغرائب کا ظہور ہوتا ہے ایمان ایک گونگے کو انداز تکلم کا ماہر بنا دیتا ہے اس کے طفیل بہرا دور کی بات سننے لگتا ہے ایک مفلوج اور اپاہج بھی اپنے اندر نہ

صرف چلنے بلکہ دوڑنے کی ہمت پاتا ہے اور بے تیغ بی سپاہی بن کر لڑنے والا بن جاتا ہے۔

حکمرانوں کی مورچہ بندی

فرعون نے کہا "ذَرُونِیٓ أَقْتُلْ مُوسیٰ وَلْیَدْعُ رَبَّه". "إِنِّی أَخَافُ أَنْ یُبَدِّلَ دِینَکُمْ أَوْ أَنْ یُظْهِرَ فِی الْأَرْضِ الْفَسَاد" "مجھے موسیٰ کو قتل کر لینے دو، وہ چاہے اپنے رب کو بلا لے مجھے ڈر یہ ہے کہ کہیں وہ تمہارے دین کو بدل نہ دے اور ملک میں فتنہ فساد نہ پیدا کر دے" حکمرانوں کی ہمیشہ سے یہی منطق رہی ہے وہ اپنے خلاف بغاوت کرنے والوں کو یہی کہہ کر دبا دیا کرتے ہیں، دراصل یہ ان کی سیاسی مورچہ بندی ہوتی ہے لوگوں میں ان کے خلاف نفرت پیدا کریں اور نفس انسانی کے اندر چھپی ہوئی نخوت وغیرت کو ابھاریں اب فرعون کی اسی بات کو لیجئے، اس نے کس طرح چالاکی کے ساتھ ایسی بات کہی جس کے دو رخ ہیں، ایک رخ تو عقیدہ سے تعلق رکھتا ہے اور مذہب وعقیدہ ہر زمانہ اور ہر نسل میں انسانوں کو عزیز رہا ہے خواہ وہ مذہب وعقیدہ لغو ہو یا حق وصداقت پر مبنی ہو خواہ اس کی بنیاد وحی ورسالت پر ہو، یا عقل ونظر کی کوتاہ بینی اور جہالت پر لیکن عقیدہ بہرحال عقیدہ ہی ہے ہر ایک کو عزیز اور اس کے نزدیک جان ومال سے زیادہ گراں قدر لوگ اس کے لیے اپنا تن، من، دھن، سب قربان کر دیتے ہیں، لہذا فرعون نے "إِنِّی أَخَافُ أَنْ یُبَدِّلَ دِینَکُمْ" (مجھے ڈر ہے کہیں یہ شخص تمہارے دین کو بدل نہ دے) کہہ کر اپنی قوم کی مذہبی نخوت کو ابھارا۔

پھر کہا "أَوْ أَنْ یُظْهِرَ فِی الْأَرْضِ الْفَسَاد" (یا ملک میں (نقض امن) فساد پیدا کر دے) اس سے ان لوگوں کے کان کھڑے کیے جو محبّ وطن قسم کے لوگ تھے ممکن ہے شاہی دربار میں ایسے لوگ بھی رہے ہوں گے جن کو دین ومذہب سے کم دلچسپی رہی ہوگی، مگر وہ وطن وملک کی سالمیت اور ملک کے امن کے بارے میں زیادہ حساس رہے ہوں گے، ان کو ابھارنے اور حضرت موسیٰ کے خلاف بھڑکانے کے لیے فرعون کا یہ جملہ کہ "کہیں ملک میں نقض امن اور فساد پیدا کر دے" کافی تھا۔

حضرت موسیٰ نے فرعون کی متکبرانہ بات سنی جو ہٹ دھرمی، غرور اور لہجہ کی کرختگی میں آپ اپنی مثال تھی اور وہ فرعون کو جانتے تھے جو ایک موقع پر کہہ چکا تھا۔ ''یَا قَوْمِ أَلَیسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَھٰذِہِ الْأَنْھَارُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ أَفَلاَ تُبْصِرُوْنَ'' (الزخرف:۵۱)

''(اورفرعون نے پکار کر کہا) اے میری قوم! کیا مصر کی حکومت میرے ہاتھ میں نہیں ہے اور یہ نہریں جو میرے محلوں کے نیچے بہہ رہی ہیں۔ (میری نہیں ہیں؟)

اس لیے جب فرعون سے اس کی متکبرانہ بات دوبارہ سنی تو انہوں نے صرف اس قدر فرمایا ''اِنِّی عُذْتُ بِرَبِّی وَرَبِّکُمْ مِنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ'' (المومن:۲۷) میں ہر متکبر سے جو یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا اپنے اور تمہارے رب کی پناہ چاہتا ہوں''۔

ایک نرم اور دل پر اثر کرنے والی بات

اس موقع پر ایک شریف انسان اٹھتا ہے جو فرعون ہی کی جماعت میں سے تھا لیکن صاحب ایمان تھا، اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا اس کے اندر انسانیت کا شعور بیدار تھا، انسان کی عزت نفس اور مقصد کی بلندی کا اس کو احساس تھا اس نے کہا ''أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ یَقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ'' ''کیا تم صرف اس لیے ایک انسان کو قتل کردو گے کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے؟

اس کا صرف یہی جرم ہے کہ وہ اللہ کو اپنا رب کہتا ہے؟ اگر کوئی کہے کہ فرعون میرا رب ہے تو اس کو قتل نہ کرو گے اور فرعون تو اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہا ہی تھا: ''أَنَا رَبُّکُمُ الْأَعْلٰی''۔

تو کیا وہ قتل کا مستحق نہیں ہے؟ لوگو! کیا تمہارے اندر انصاف وعدل کا کوئی ذریعہ نہیں ہے؟ کیا تم بالکل نہیں سمجھتے؟ ایک شخص اگر اپنا رب اس ذات کو مانتا ہے جو اس کا خالق ہے جو اس کو عدم سے وجود میں لایا جس نے اس کو نیست سے ہست کیا اس کی پرورش کی اس کو رزق دیتا رہا اگر اس کو وہ اپنا رب کہتا ہے تو تم اس کو قتل کرنا چاہتے ہو اور وہ شخص جو ہمیشہ کا

محتاج، مخلوق، اپنی ایک ایک سانس کے لیے رب حقیقی کا محتاج، اپنی پیدائش اور پیدائش سے پہلے جب وہ اپنے باپ کے صلب میں تھا اس وقت سے لے کر اپنی نشو ونما آخر تک ہر بات میں محتاج وہ اپنے لیے خدائی کا دعوی کرے اس کو کچھ نہ کہا جائے، اخر یہ کیا ظلم ہے، کیا اندھیرا ہے؟ اس شریف انسان نے یہ بات کہہ کر فرعون اوراس کے حاشیہ نشینوں اور مشیروں کے اندر سے عدل وانصاف کے جذبہ کو ابھارنا چاہا اور دیکھنا چاہا کہ آیا ان کے اندر شرافت اور انصاف کا کوئی شمہ باقی ہے یا نہیں اور ان کے اندر خیر وشر کے درمیان تمیز کی قوت کو ابھارنا چاہا کہ وہ کھرے کھوٹے، اعلیٰ وادنیٰ کے درمیان تمیز کرسکیں، مالک اور غاصب کے فرق کو سمجھنے کی اگر ان میں کوئی صلاحیت ہے تو اس کو کام میں لائیں، یہ بات ان سب لوگوں کو چیلنج کررہی تھی جو اس وقت فرعون کے دربار میں موجود تھے اور جنہوں نے اس مومن باللہ کی بات سنی۔

مقصد برآری کے لیے عیاں حقیقت سے استدلال

اس مرد مومن نے اپنی بات کو دلیل کے ذریعہ تقویت دی "وَقَدْ جَاءَ كُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ" (اور یہ شخص یعنی موسیٰ تمہارے رب کی طرف سے روشن دلائل لے کر آیا ہے) اس جملہ سے اشارہ اس طرف تھا کہ حضرت موسی علیہ السلام کو اللہ نے معجزہ عطا فرمائے تھے "فَأَلْقٰی عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ. وَنَزَعَ يَدَهٗ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنّٰظِرِيْنَ" (الاعراف: ۱۰۷-۱۰۸) "اپنا ڈنڈا ڈال دیا تو اچانک وہ ایک کھلا ہوا اژدھا تھا اور اپنا ہاتھ نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے سامنے چمکدار تھا" یہ وہ کھلے ہوئے مشاہدات تھے جن سے کوئی شخص اختلاف نہیں کرسکتا تھا کیونکہ انسان ان باتوں میں مباحثہ ومناظرہ کرسکتا ہے جو عقلی اور فکری ہوں لیکن جو بات کہ اس کے مشاہدی میں ہو اور جس کو وہ اپنی نظروں سے دیکھ رہا ہو اس کے ہونے یا نہ ہونے میں مناظرہ کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس مرد مومن نے انسانی نفسیات کے عین مطابق ایک ایسی جچی تلی بات کہی کہ اس کو ہر انسان سمجھ سکتا تھا اور حق وانصاف کی بات کہہ سکتا تھا اس نے ان کو اس زبان میں مخاطب کیا جسے وہ

خوب سمجھتے تھے بالکل منطقی اور اصولی بات "اِنْ یَکُ کَاذِباً فَعَلَیْهِ کَذِبُهٗ. وَاِنْ یَکُ صَادِقاً یُصِبْکُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُکُمْ. اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ" اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا ضرر اسی کو ہوگا اور اگر وہ سچا ہے تو کوئی سا عذاب جس کا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے تم پر واقع ہوکر رہے گا بیشک خدا اس کو ہدایت نہیں دیتا جو بے لحاظ اور جھوٹا ہو"۔ گویا اس نے کہا اے لوگو اپنے آپ کو ایسی مشکل میں نہ ڈالو جس سے نکل نہ سکو یہ آدمی جو اپنے آپ کو نبی برحق کہہ رہا ہے اور وہ آسمان سے اس کام پر مامور ہے اگر تم اس کو اپنی گرفت میں لے کر عبرت کا سامان بناتے ہو تو اس میں سنگین خطرہ ہے کیونکہ اگر یہ سچا نکلا تو جس قدر عذاب خداوندی کی یہ دھمکی دے رہا ہے اس میں کچھ تو تم پر عذاب آئے گا ہی اور اگر وہ جھوٹا ہے .... پناہ بخدا.... تو اس کا جھوٹ اس کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے تم اس کے ذمہ دار کسی حال میں نہ ہوگے۔

غیر متغیر سنت اللہ سے استدلال

تیسری چیز جس سے اس مرد مومن نے مدد لی وہ یہ کہ اللہ کی سنت جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی اور آج تک اس میں تغیر نہیں دیکھا گیا اس کی طرف توجہ مبذول کرائی "یَا قَوْمِ لَکُمُ الْمُلْکُ الْیَوْمَ ظَاهِرِیْنَ فِی الْاَرْضِ" "اے میری قوم! آج تمہاری بادشاہت ہے اور تم ہی ملک پر غالب ہو"۔

اس طرح اس نے فرعون کے وزیروں کو سمجھایا کہ بھائیو! تم اس وسیع شہنشاہی اور اس چندروزہ عزت سے دھوکہ میں نہ پڑو بلاشبہ آج تم جس سرزمین پر حکمراں ہو وہ ایک بڑی مملکت ہے دور دور تک پھیلی ہوئی ہے، تمہارے پاس زر و جواہر کے ڈھیر ہیں ہر قسم کے وسائل اور سامان عشرت موجود ہیں، تمہاری ہر طرح سے بادشاہت ہے اور تم ملک پر قابض ہو بلاشبہ اقتدار اعلی تمہارے پاس ہے اور تم ہی حکومت کی کنجیوں اور خزانوں کے مالک ہو تمہارے پاس دفینوں کی بھی طاقت ہے اور حملہ کرنے کی بھی قوت ہے لیکن اگر اللہ کا عذاب آ گیا تو کون ہمیں اس سے بچا سکے گا اس داعی مومن نے دراصل ان لوگوں کی نظر سنت الٰہی

کی طرف مبذول کرائی جو کبھی بدلا نہیں کرتی ''فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ بَاسِ اللّٰهِ اِنْ جَاءَ نَا''
''لیکن ہم پر اگر عذاب آ گیا تو کون ہماری مدد کرے گا اس کو دور کرنے کے لیے''۔

تمہارا خیال ہے کہ تم اس وقت سب سے بلند ہو، کوئی شی تم سے اوپر نہیں ہے، کوئی ذات تمہارے اوپر حکمراں نہیں ہے، تم ہر چیز کے مرجع ہو، قوت میں، حکمرانی میں، حکم دینے اور روکنے میں تمہارا ہاتھ کوئی روک نہیں سکتا، لیکن تم بھول گئے ہو کہ ایک قوت اور ہے جس پر امر واقعہ کے لحاظ سے تو تمہارا ایمان ہے مگر اس کی چند صفات میں دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہو اس موقعہ پر فرعون نے کہا ''مَا أُرِيكُمْ اِلَّا مَا أرىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ اِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ'' ''میں تمہیں وہی بات سمجھاتا ہوں جو مجھے سوجھی ہے اور وہی راہ بتاتا ہوں جس میں بھلائی ہے'' اس فرعونی قول میں کوئی دلیل نہیں ہے ''جو مجھے سوجھی ہے وہ تمہیں سمجھاتا ہوں'' یہ تو اعتراف شکست ہے، فرعون کو ضرورت تھی کہ آسمانی صحیفوں کی کوئی دلیل پیش کرتا، کوئی منطقی دلیل لاتا مگر وہ ایسا نہ کر سکا اور اپنے عجز کا گویا اعتراف کرنے لگا کہ ''مجھے جو سوجھی ہے وہی بات سمجھاتا ہوں'' یہ کوئی دلیل نہیں ہے یہ تو ہر کند ذہن اور گمراہ ہر جاہل وعامی کہہ سکتا ہے اور اس کا یہ کہنا ''وَمَا أَهْدِيكُمْ اِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ'' (میں وہی راستہ بتاتا ہوں جس میں بھلائی ہے) صرف زبانی دعوی ہے اس کا کوئی ثبوت وہ نہیں پیش کر سکا۔

ماضی میں فنا ہونے والی قوموں اور تاریخ سے عبرت دلانا

اس مرد مومن نے فرعون کی بات کاٹتے ہوئے مزید کہا۔ ''اِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ. مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ. وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ ظُلْماً لِلْعِبَادِ'' ''مجھے تمہاری نسبت خوف ہے کہ (مبادا) تم پر بھی اور امتوں کی طرح کا عذاب نہ آ جائے (یعنی) نوح کی قوم، عاد وثمود اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے ان کے حال کی طرح تمہارا حال نہ ہو جائے اور خدا تو بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا''۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کے حاشیہ نشین وزراء وغیرہ ان قوموں کے انجام سے واقف تھے اور انہیں کسی قدر تاریخ امم کا علم تھا جو عاد وثمود کے بعد دنیا میں آئیں اور اپنی نافرمانیوں کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

ایک مکالمہ (۲)

آخرت کے عذاب سے آگاہی

اس کے بعد اس مومن نے کہا: ﴿وَيَاقَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ﴾ ''اے میری قوم! مجھے تمہاری نسبت پکار کے دن (یعنی قیامت) کا خوف ہے''۔

مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اگر کوئی ملک یا کوئی بادشاہت ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی چیز ہوتی تو آج عاد وثمود کی سلطنت بھی قائم رہتی ان کو بھی زوال نہ آتا اور جب ان کی حکومتیں فنا ہو گئیں تو پھر تمہاری سلطنت کی کس نے ضمانت لی ہے کہ ہمیشہ قائم رہے گی جب ان کے ملکوں اور ان کی بادشاہوں کی بساط الٹ دی گئی تو پھر تمہاری کیا خصوصیت ہے جس کی بناء پر تم کو ہمیشہ باقی رکھا جائے گا اگر تم میں اور ان میں اخلاقی قدروں کا فرق ہوتا تم ہدایت یافتہ ہوتے تو شاید کہ گمان ہوتا کہ تم زیادہ عرصہ چل جاؤ مگر یہ بات بھی تمہارے اندر نہیں ہے۔ تمہارا طریقۂ عمل اور طرزِ حکومت ہے تو وہی ہے جو ان فنا ہونے والی قوموں اور ان کی بادشاہتوں کا تھا لہذا جیسے وہ فنا ہو گئے ناپید ہو گئے تمہارا انجام بھی یہی ہوگا آخر تمہارے اور ان کے درمیان خطِ فاصل کیا ہے؟ اس کے بعد اس مردِ مومن نے کہا ''إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَاد'' (یعنی مجھے تمہارے بارے میں پکار کے دن یعنی عذاب کے دن کا خوف ہے) پکار کا دن قیامت کا دن ہوگا جس روز ایک دوسرے کو پکاریں گے ایک

دوسرے کو پکارنے، شوروشغب، چیخ و پکار کی صورت حال فرعون کے ہالی موالی کے لیے نئی نہیں تھی ان کے جلوس نکلا کرتے تھے، میلے ٹھیلے ہوتے تھے اوہ جانتے تھے کہ ان مواقع پر کیا ہوتا ہے، اس لیے قیامت کے دن کا اشارہ "یَوْمَ التَّنَادِ" سے کیا اور اس روز قیامت کی ایک اور صفت بیان کی "یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ" جس دن تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے"۔

اس لفظ کا بوجھ فرعون کے ذہن پر سخت پڑا ہوگا کیونکہ سب سے زیادہ ناپسندیدہ قسم اس کے نزدیک (شکست کی) تھی، جس میں فوج پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑی ہو وہ شکست وفرار اور میدان چھوڑ کر بھاگنے کا تصور نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس کی فوج تعداد اور ہتھیار میں سب پر فوقیت رکھتی تھی، لہذا پیٹھ پھیر کر بھاگنے کا مفہوم وہ اچھی طرح سمجھتا تھا اور اس میں جو ذلت ورسوائی ہے اس سے وہ آگاہ تھا اس لیے اس مرد مومن نے کہا "یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ. مَالَکُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ. وَمَنْ یُضْلِلِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ هَادٍ" جس دن پیٹھ پھیر کر (قیامت کے دن) تم بھاگو گے (اس دن) کوئی تم کو عذاب خداوندی سے بچانے والا نہ ہوگا اور جس شخص کو خدا گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے"۔

ایک حکیمانہ نکتہ

پھر اس مومن نے جس کو اللہ نے حکمت وعقل سے نوازا تھا ایک نیا اور بہت حکیمانہ نکتہ پیدا کیا اس نے انسانی فطرت کی ایک دیرینہ کمزوری اور انسانی سوسائٹی اور سماج کے ایک ایسے مرض کی نشاندہی کی جو قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نعمت کی قدر اسوقت نہیں کرتا جب اس کو حاصل ہوتی ہے، کہنے والے نے کہا ہے "قدر نعمت بعد زوال" جو چیز حاصل ہو چکی ہے اس کی تحقیر کرنا اس کی فطرت میں ہے اور جب تک وہ نعمت اس کے دسترس میں ہے اس کی عزت نہی ں کرتا گویا وہ اس کو فراموش کردیتا ہے کہ یہ بھی کوئی قابل شکر نعمت ہے۔ یہ انسانی فطرت کی ایک کمزوری بلکہ مرض ہے ماضی میں جو تھا اس کی تو وہ عزت کرتا ہے اور اس کی اہمیت محسوس کرتا ہے اور اس پر حسرت کرتا ہے اگر ہاتھ سے چھین لی جائے لیکن موجود ہے اس پر اس کا خیال نہیں جاتا کہ یہ بھی قدر کرنے کی چیز ہے جیسے دنیا

سے رخصت ہوجانے والے کے بارے میں کہا جاتا کہ ایسا آدمی نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا اس کے اوصاف شمار کئے جاتے ہیں اس کی خوبیاں ایک ایک کر کے یاد کی جاتی ہیں مگر جو زندہ ہے اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ بھی ایک آدمی ہے ہم بھی ایک آدمی ہیں اور اگر وہی آدمی مرجائے تو پھر اس کی شان میں مرثئے اور قصائد کہے جانے لگیں مبالغہ کے ساتھ اس کی مدح کی جائے گی یہ انسانی سوسائٹی کا ایسا مرض ہے جس نے انسانی نسلوں کو اکثر معاصر شخصیات کی طرف سے بے پرواہ رکھا اور لوگ اپنے وقت کے اعلی سے اعلی نمونوں سے بہرہ مند نہ ہوسکے اس ناسپاس گزاری اور ناشکری کی طرف اس مردمومن نے اس طرح نگاہ ملتفت کرائی "وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَازِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُمْ بِهٖ. حَتّٰى إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُولًا" (المومن: ۳۴) اور پہلے یوسف بھائی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے تو وہ جو لائے تھے اس سے تم ہمیشہ شک ہی میں رہے یہاں تک کہ وہ جب فوت ہوگئے تو تم کہنے لگے کہ خدا اس کے بعد کوئی پیغمبر نہیں بھیجے گا"۔

حضرت یوسف علیہ السلام آپ اپنی مثال تھے اور اپنی شان میں منفرد تھے ان کا ثانی کون ہوسکتا تھا، شریف باپ، دادا کے شریف بیٹے اور پوتے رحم دل انصاف پرور بادشاہ جب تک زندہ رہے لوگ ان کی عیب جوئی کرتے رہے اور ان کی طرف طرح طرح کے قصے منسوب کرتے رہے، لہذا ایسا نہ ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی تم وہی سلوک کرو جو ان سے پہلے کے پیغمبر یوسف کے ساتھ کر چکے ہو اور نتیجہ یہ ہو کہ جب یہ بھی دنیا سے اٹھا لیے جائیں تو کہنے لگو کہ موسیٰ تو خدا کا ایک بیش بہا انعام اور عطیہ تھے ان سے پہلے کوئی بھی پیغمبر ان کے جیسا اولوالعزم نہیں گزرا اور نہ آئندہ کبھی آئے گا لوگو! میں تمہیں اس طرزِ عمل سے آگاہ کرتا ہوں کہ پھر ایسی غلطی نہ کرنا۔

فرعون کی وہ خصلت جو حق وصداقت کی راہ میں رکاوٹ بن گئی

ان الفاظ پر غور کیجئے "لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهٖ رَسُولًا" یعنی اللہ ان کے بعد ہرگز

کوئی رسول نہیں بھیجے گا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ یوسف علیہ السلام کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اب پھر کوئی پیغمبر اس دنیا میں آئے گا۔ ”کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ. أَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطَانٍ أَتَاھُمْ. کَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللّٰہِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا. کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ“ (المومن:۳۴-۳۵) اسی طرح خدا اس شخص کو گمراہ کرتا ہے جو حد سے نکل جانے والا اور شک کرنے والا ہو جو لوگ بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑا کرتے ہیں خدا کے نزدیک اور مومنوں کے نزدیک یہ جھگڑا سخت ناپسند ہے اس طرح اللہ ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے“۔

حقیقت یہ ہے کہ ساری محرومیوں اور ناکامیوں اور حق کی نعمت سے تہی دست رہ جانے کا سبب تکبر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا اولوالعزم پیغمبر دعوت دے رہا ہے، جس کی پیغمبرانہ صداقت کی گواہی وہ جادوگر دے چکے تھے جس کو موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنے اور ان کو شکست دینے کے لیے بلایا گیا تھا وہ جادوگر حقانیت پر ایمان لے آتے ہیں اور یہ ایمان ان کو فرعون کے گروہ سے نکال کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے گروہ میں لے آتا ہے، یعنی اللہ کے داعیوں کے گروہ میں ان کو لے آتا ہے اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے زمرہ میں لے آتا ہے اور وہ جادوگر ایسے مومنین صادقین بن جاتے ہیں گویا ہمیشہ سے گہوارۂ نبوت میں پلے ہیں حالانکہ ان کی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے دلوں کے پتھروں کو موم کر دیا اور ایمان کی تخم ریزی ان کے اندر کر دی، چنانچہ وہ فرعون کے گروہ سے نکل کر حق کے گروہ میں شامل ہو گئے اور برملا کہنے لگے ”فَاقْضِ مَا أَنْتَ قَاضٍ. اِنَّمَا تَقْضِیْ ھٰذِہِ الْحَیَاۃَ الدُّنْیَا“ (طٰہٰ:۷۲) کرو جو فیصلہ بھی چاہو بہر حال جو بھی کرو گے وہ اس مادی زندگی میں کرو گے اور ہم ہر طرح کی سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اس مرد مومن نے کئی طرح سے فرعون کو ہوش میں لانے کی کوشش کی، مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا، کیوں؟ اس لیے کہ فرعون کی یہ خصوصی علامت بلکہ کلیدی علامت تھی جس کو ہم تکبر کہہ رہے ہیں یہ بات حضرت موسیٰ کے ذکر میں کئی بار فرمائی گئی ہے ﴿ وَقَالَ مُوْسٰی اِنِّی

عُذْتُ بِرَبِّی وَرَبِّکُمْ مِنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَاب﴾(المومن:۲۷)
''اور حضرت موسی نے فرمایا میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں ہر اس متکبر سے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا''۔

حضرت موسیٰؑ کی دعوت اور قوم فرعون کے مومن کے وعظ میں مشترکہ بات

پھر اس مرد مومن نے کہا ''کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٌ. اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ'' (المومن:۳۴-۳۵) اسی طرح اللہ ہر اس شخص کو گمراہ کرتا ہے جو حد سے نکل جانے والا اور شک کرنے والا ہو جو لوگ کہ بغیر اس کے کہ کوئی دلیل آئی ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں''۔

لہٰذا اس پوری داستان کی کلید اور فرعون کی شخصیت کا کلید عنصر تکبر ٹھہرا یہ تکبر ہی تھا جو فرعون کی راہ میں رکاوٹ بنا اور جس نے اس کو حضرت موسی علیہ السلام کی دعوت سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا، حضرت موسی علیہ السلام کو فرعون کی اس کمزوری کا پورا پورا احساس تھا اور فرعون کی قوم سے جو مرد مومن اٹھا وہ بھی اچھی طرح اس بات سے آگاہ تھا لہذا وہ مرکزی نقطہ یا مشترکہ بات جس میں یہ دونوں متفق تھے وہ تکبر کے مرض کی تشخیص تھی اور دونوں اس مرض پر اپنے تاسف کا اظہار کر رہے تھے کیونکہ اسی بات نے فرعون اور فرعون کے غاشیہ برداروں اور وزیروں کو موسی علیہ السلام کی دعوت سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر وہ ہدایت نہ پا سکا۔

دکھتی رگ کو پکڑنا

اس مکالمہ میں دنیا کی تحقیر اس کا تغیر پذیر ہونا فانی ہونا اور آخرت کی زندگی کا ہمیشہ ہمیشہ رہنا پر اثر انداز میں بیان ہوا ہے: ''وَقَالَ الَّذِیْ آمَنَ یَا قَوْمِ اتَّبِعُوْنِ أَهْدِکُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ. یَا قَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیَاةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ. وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ'' (المومن:۳۸-۳۹) ''اور وہ شخص جو مومن تھا اس نے کہا بھائیو! میرے پیچھے چلو، میں تمہیں بھلائی کا راستہ دکھاؤں گا۔ بھائیو! ی دنیا کی زندگی (چندروزہ) فائدہ

اٹھانے کی چیز ہے اور جو آخرت ہے وہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے"۔

اور فرعون کے لیے جو بات سب سے بڑا احجاب ثابت ہوئی وہ اس کی وسیع شہنشاہی تھی جس پر اس کو ناز تھا، لہذا ضرورت تھی کہ اسی احساس پر ضرب لگائی جائے چنانچہ انہوں نے کہا "یہ زندگی ایک وقت تک کے لیے نفع اٹھانے کی جگہ ہے اور صرف آخرت ہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے" اس طرح انہوں نے دکھتی رگ پکڑ لی اس کے بعد اللہ کے عادلانہ قانون کو بیان کیا جس سے کوئی بچ نہیں سکتا، اور کہا "مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلاَ يُجْزىٰ اِلَّا مِثْلُهَا. وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤمِنٌ فَاُوْلٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ" (المومن:۴۰) "جو برے کام کرے گا اس کو بدلہ بھی ویسے ہی ملے گا اور جو نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت اور صاحب ایمان بھی ہوگا تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہاں ان کو بے شمار رزق ملے گا۔

نفع بخش اور فریبی دھوکہ باز کے درمیان تمیز کی دعوت!

پھر اس نے یہاں ایک دوسرا پہلو اجاگر کیا کہ نفع بخش اور نقصان دہ کے درمیان اور مخلص اور فریب دہندہ کے درمیان تمیز نہ کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے اس بات کو ان الفاظ میں ادا کیا "وَيٰقَوْمِ مَالِيْ أدعُوْكُمْ اِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُوْنَنِيْ اِلَى النَّارِ. تَدْعُوْنَنِيْ لِأكْفُرَ بِاللّٰهِ وَأشْرِكَ بِهٖ مَالَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ. وَأنَا أدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ" (المومن:۴۱-۴۲) اور اے میری قوم! میرا کیا حال ہے کہ میں تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی آگ کی طرف بلاتے ہو تم مجھے اس لیے بلاتے ہو کہ خدا کے ساتھ کفر کروں اور اس چیز کو اس کا شریک مقرر کروں جس کا مجھے کچھ علم نہیں اور میں تم کو خدائے غالب اور بخشنے والے کی طرف بلاتا ہوں"۔

وہ کہنا چاہتے ہیں کہ لوگو! اس دعوت کے درمیان جسے میں لے کر کھڑا ہوا ہوں اور اس دعوت کے درمیان جس کو فرعون لے کر کھڑا ہے موازنہ کرلو، میں تمہیں نجات کا راستہ بتاتا ہوں اس رحم کرنے والے اور بخشنے والے اللہ کی طرف بلاتا ہوں جبکہ وہ تمہیں اپنی ذات

کی طرف بلاتا ہے اوراس راستہ کی طرف بلاتا ہے جس میں ہلاکت اور تباہی ہے پھر کہتا ہے ''لَاجَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونَنِيْ اِلَيْهِ. لَيْسَ لَهُ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَافِي الْآخِرَةِوَأَنَّ مَرَدَّنَا اِلَى اللّٰهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ'' (المومن:۴۳) سچ تو یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کو دنیا وآخرت میں بلانے (یعنی دعا قبول کرنے) کا مقدور نہیں اور ہم کو خدا کی طرف لوٹنا ہے اور حد سے نکل جانے والے دوزخی ہیں''۔

یہاں اس شریف النفس مبلغ نے اس بات پر آگاہ کیا کہ فرعون کی دعوت ایک لایعنی اور زبردستی کی دعوت ہے وار درحقیقت جاہلیت کی جتنی دعوتیں ہیں وہ لایعنی اور بے مقصد ہیں اللہ نے اس کی کوئی دلیل نہیں اتاری اور عقل سے ان کا کوئی واسطہ نہی ں ہے علم سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہے اور نہ انبیاء کی دعوت سے ان کا کوئی تعلق ہی ہے زمین کی سطح پر وہ اس طرح ابھر آتی ہیں جیسے بے مصرف اور مضرت رساں رویدگی کسی لگائے ہوئے پودے کے اردگرد ظاہر ہوتی ہیں اور اسے باغباں یا کسان اکھیڑ کر پھینک دیتا ہے اس شریف النفس مبلغ نے اسی نقطہ کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ بلاشبہہ تم لوگ ہم کو اس چیز کی طرف بلاتے ہو جس کی نہ دنیا میں کوئی آواز ہے اور نہ آخرت میں، کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے؟ کوئی ثبوت ہے؟ ہرگز نہیں یہ صرف تمہاری خواہشات اور تمہاری مصلحتیں ہیں۔

وہ آخری بات جو ہر مخلص مبلغ کہا کرتا ہے!

اخیر میں اس مرد مومن نے دلی سوز کے ساتھ ایک بات کہی جس میں اللہ پر اپنے تمام معاملات کو سپرد کرنا ظاہر ہوتا ہے اس کی اس بات میں دل کا درد بھی ہے اور ایک آخری کوشش کا اظہار بھی یہ وہ بات ہے جو ہر مخلص مبلغ کی زبان سے نکلتی ہے کیونکہ اس کے بعد کوئی بات نہیں کہی جاسکتی ''فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاأَقُوْلُ لَكُمْ. وَأُفَوِّضُ أَمْرِيْ اِلَى اللّٰهِ. اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ'' (المومن:۴۴) ''جو بات میں تم سے کہتا ہوں تم اسے آگے چل کر یاد کروگے اور میں اپنا کام خدا کے سپرد کرتا ہوں بے شک خداوند تعالی بندوں کو دیکھنے والا ہے''۔

یہ وعظ کا ایک بہترین خاتمہ ہے اور ایک ایسی دعوت جس سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہو

اس کا اہتمام ہر داعی انہیں الفاظ پر کرتا ہے۔

یہ مکالمہ اپنے اسلوب کے لحاظ سے بے نظیر ہے یہی وہ مکالمہ ہے جس کو اللہ تعالی نے قرآن کریم میں اپنے بلیغ اور پر حکمت اسلوب میں بیان کر کے زندہ جاوید بنادیا ہے یہ اپنے ترتیب کے لحاظ سے اور اس لحاظ سے کہ ایک پہلو سے دوسرے پہلو تک ذہن منتقل ہوتا ہے اس کی ابتدا اور انتہا دونوں بے مثال ہیں یہ مکالمہ اس بات کا مستحق ہے کہ ہم اسے تبلیغ ودعوت کے سلسلہ میں مشعل راہ بنادیں اور اگر کوئی جابر قوت ہمارا راستہ روکے تو ہم اس مکالمہ کی روشنی میں دعوت کا حق ادا کر سکتے ہیں"(۱)۔

(۱) تبلیغ ودعوت کا معجزانہ اسلوب: ۹۷-۱۱۸